

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No.

۹۵۵۵-۲۲

Accession No.

۱۹۸

Author

بانی سید - ۵ - ۲

۱۹۸

Title

تاریخ نذر حله سوم

This book should be returned on or before the date last marked below.

سلسلہ شریعت و احکام

تاریخ ہند جلد سوم

(برائے ان ٹرمی ڈیٹ)

(طبع دوم)

تالیف

مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی

سابق رکن شعبہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ

نظر ثانی طبع دوم

مولوی عبد المجید رضا صدیقی ام۔ ا۔ ایل ایل بی (عثمانیہ)

لیکچرار کلیدیہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

۱۳۵۸ھ ۱۳۵۸ھ ۱۳۵۸ھ ۱۳۵۸ھ ۱۳۵۸ھ

دارالطبع اسلامیہ

Checked 1975

فہرست مضامین

تاریخ ہند جلد سوم

”و طبع دوم“

باب

سلطنت مغلیہ کا آغاز

از صفحہ ۱ تا صفحہ ۴۱

پہلی فصل: بابر کی آمد بہت میں: سلاطین ہند کی کمزوریاں۔ قومی ضعف۔

سلطان ابراہیم۔ فن حرب کی پسماندگی۔ محمد ظہیر الدین ”بابر“
تخت نشینی اور پہلی لڑائیاں۔ قبضہ کابل فتح ”ہندوستان“
جنگ پانی پت۔ سلطان ابراہیم کی بے تدبیری اور شکست۔
بابر کا فیصلہ۔

دوسری فصل: شمالی ہند والوں کی آخری جدوجہد: راجپوتوں کا جھٹکا۔

جنگ کانوہ۔ دیگر فتوحات۔ جنگ کاگرا۔ بابر کی وفات
حدود سلطنت۔ افغان سردار۔ ہمایوں۔ افغانی حملہ (۱)
جوہر میں (۲) دربار گجرات میں۔ مالوہ و گجرات۔ جنگ ٹنڈو۔

تسخیر چمپانیر - ہمایون کی واپسی - شیر خاں کا عروج - محاربات بہار و
 بنگال - ہمایون کی شکستیں - جنگ چوہہ - مہینہ ۱۵۹۹ء - نتائج -
تیسری فصل: مغلوں کا اخراج اور عہد شیر شاہی: فریقین کی حالت اور
 ارادے - جنگ قنوج - مغلوں کا اخراج - شیر شاہ کے اوصاف -
 (۱) عالی حوصلگی اور فرض شناسی - قوم پرستی - ہندی افغانوں کے
 مجمل حالات - سیاسی مصلح - جنگی انتظامات - قلعہ دہلیت اس
 (پنجاب) سرحدی افواج - ملکی نظم و نسق اور مالگزاری بندوبست -
 عام نتائج - خاندان شیر شاہی - امر کی شورش و نا اتفاقی -

باب ۲

سلطنت مغلیہ کا استقلال

(از صفحہ ۲۴ تا صفحہ ۹۵)

پہلی فصل: فتوحات ممالک: (۱) پنجاب (۲) دہلی و آگرہ - کبیر کی
 تخت نشینی - جنگ پانی پت - نتیجہ جنگ (۳) مالوہ - اندرونی
 فسادات - بادشاہ کی بے رغبی - ازبک سرداروں کی شورش (۴)
 راجپوتانہ - میواڑ - رنچنبور (۵) گجرات - (۶) بنگالہ - بنگالے
 کے افغان بادشاہ - کررانی خاندان - مغلوں سے لڑائیاں اور
 شکست - بعد کی شورشیں (۷) کشمیر - خود مختار اسلامی حکومت
 مغلیہ فتوحات -

دوسری فصل: ملکی آئین: سندھ قندھار و دکن - ذرائع معلومات - نقش
 سلطنت مغلیہ (مقبوضات اکبر) - ایک عام غلطی "مرکزیت"
 کی تجدید بے تعبہ - ہندوؤں سے تعلقات - ہندو عہدہ دار -

”منصبدار“ کی اصلاح۔ انتظامی عہدے: صوبیدار۔ فوجدار۔ عدالت
و کوٹوالی۔ فوج باقاعدہ۔ ہاتھی ہندوق و توپیں۔ مالیات: ”خیر شاہی“
آئین۔ اکبری انتظامات۔ عہدہ دار۔ کل مالگزاروں کی ایک اور اس کی
قوت خرید۔ عام فراغت و آسودگی۔

تیسری فصل: مذاہب و علوم: فارسی شعرا۔ ہندی شاعری۔

باب ۳

سلطنت مغلیہ کا انتہائی عروج

(از صفحہ ۹۶ تا صفحہ ۱۶۶)

پہلی فصل: دکن کی سیاسی حالت: نئی سلطنتیں۔ احمد نگر۔ گولکنڈہ اور

بیجاپور۔ ان کی بنا اور ترقی۔ جہانگیر کا عروج۔ جنگ تالی کوٹ۔
نقشہ سلطنت مغلیہ (دکن کی ریاستیں) ترقی تمدن۔ جنگی استعداد۔

سلاطین کے نام اور نسبن۔

دوسری فصل: اکبر کی فتوحات دکن: راجہ علی خاں۔ احمد نگر پر حملے۔

اندرونی فساد۔ تاریخ فرشتہ۔ انگریزی ترجمے۔ محاصرہ احمد نگر۔

الحاقی برار۔ الحاق غاندیس۔ فتح احمد نگر۔

تیسری فصل: جہانگیر و شاہ جہاں: اکبر کی وفات جہانگیر ۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء

دکن کی لڑائیاں۔ شہزادہ خرم کی سپہ سالاری۔ درباری سازشیں۔

جہانگیر کے خصال۔ سازشوں کا انجام۔ قندھار۔ شہزادہ خرم کی

تخت نشینی۔ چند اندرونی مفسد کے (۱) چھار سنگہ بندیہ (۲)

خان جہاں لودھی۔ شاہ جہاں کی فتوحات دکن۔ نظام شاہی کا

خاتمہ۔ بجا پور و گولکنڈہ کی باجگزاری۔
چوتھی فصل: اورنگ زیب (۱) عہد شہزادگی :- پہلی صوبہ داری۔
 بڑے بھائی کا حد۔ اورنگ زیب کے بعض خصائص۔ گوشہ نشینی
 کا ارادہ۔ بلخ و بدخشان کی مہم۔ ملتان و سندھ کی صوبہ داری
 ۱۰۵۸ء تا ۱۰۶۲ء۔ قندھار کی مہمات۔ دکن کی دوسری صوبہ داری
 ۱۰۶۲ء تا ۱۰۶۵ء۔ دارا کی مخالفت۔ خانہ جنگی۔ اورنگ زیب
 گولکنڈے سے لڑائی۔ شاربہاں اور مراد کی فتنہ بندی۔
 ب۔ عہد بادشاہی :- غلط بیانیاں اور ذاتی اوصاف۔
 تحت نشینی۔ مختلف اصلاحات۔ مالگزاری۔ دیگر محاصل اور
 جزیہ۔ بعض اندرونی شورشیں۔ افغان و راجپوت معاملات دکن۔
 سیوا جی مرہٹہ۔ فتوحات دکن :- شہنشاہ عالمگیر کا دکن آنا۔
 بجا پور کی فتح۔ گولکنڈہ کی فتح۔ سنبھالی کا قتل۔ قلعہ چنبی کی تسخیر۔
 شہنشاہ کا انتقال۔ نقشہ سلطنت مغلیہ (وفات عالمگیر کے وقت)

ضمیمہ باب ۳

نقل ”عہد نامہ کہ بموجب التماس بادشاہ راؤ مہر مراد بخش قلم شد“

(آداب عالمگیری ورق ۳۳ و ۳۴)

(از صفحہ ۱۶ تا صفحہ ۱۶۹)

باب

آخری مغل بادشاہ

(از صفحہ ۱۵۰ تا صفحہ ۲۱۶)

پہلی فصل: مغلیہ تمدن: جہاندار شاہ - موروثی بادشاہی کے اثرات - دولت و عشرت - امیرانہ تکلف و معاشرت - فنون و صناعات - بیرونی تجارت اور وسائل سفر - ڈاک کا انتظام - آبادی اور

دوسری فصل: نااہل بادشاہ: (۱) بادشاہ گرسید اور فرخ سیر - جہاندار شاہ کی شکست اور قتل - فرخ سیر کی بادشاہی سیدوں سے مخالفت - سیدوں کا کامل غلبہ - آخری سلاطین تیموریہ کا شجرہ نسب - نواب نظام الملک کا اغراف - بادشاہ گر - سیدوں کا خاتمہ - محمد شاہ کی نااہلی - طبعہ اُمرار - نادر شاہ کا حملہ - جنگ کرنال - مصالحت دودغا بازی -

تیسری فصل: زوال سلطنت: صوبوں کی حالت - جنگ سرہند

احمد شاہ ابدالی - مجاہد الدین احمد شاہ - عالمگیر ثانی -

اہدالی کا حملہ دہلی پر - فازی الدین کی عیاری - مرہٹوں کا زور

شمالی ہند میں - احمد شاہ ابدالی سے وجہ محاصرت - مرہٹوں

کی ہزیمتیں - تیسری جنگ پانی پت -

باب ۵

نئی طاقتیں

(از صفحہ ۲۱۷ تا صفحہ ۲۵۵)

پہلی فصل: مرہٹوں کا فروغ: مرہٹوں کی ریاست - پیشوا کا اقتدار - گجرات و مالوہ میں نفوذ - مرہٹوں کا دخل شمالی ہند میں - جنگ پانی پت اور

اس کے نتائج - پیشواؤں کا شجرہ نسب -

دوسری فصل: حیدر آباد و میسور: خاندان آصفیہ کی - دکن سے ابتدائی تعلق - نواب

نظام الملک آصفیہ اول - اندرونی نظم و نسق - آصفیہ کے جانشین -

شجرہ خاندان آصفیہ - جنگ کرناتک - فرانسیسی نفوذ دربار دکن میں -

نواب نظام علی خاں آصفیہ ثانی - انگریزوں کے تعلقات - میسور کی آزاد

ریاست - ابتدائی تاریخ اور مغلیہ سلطنت سے تعلق - حیدر علی کا تسلط

حیدر علی کی فتوحات - ٹیپو سلطان -

تیسری فصل: شمالی ہند کی ریاستیں: (۱) جنگ لڑی علی وردی خاں (۲) اودھ -

انگریزوں کا اثر - (۳) پنجاب - سکھوں کی "بارہ مسل" - ریخت سنگھ -

فتوحات ملتان کشمیر وغیرہ -

باب ۶

اہل یورپ کی آمد ہند میں

(از صفحہ ۲۵۶ تا صفحہ ۲۸۵)

پہلی فصل: مغربی ممالک سے بحری تجارت کا آغاز: پرتگیزیوں کے سیاسی منصوبے۔ فتح گوا۔ پرتگیزیوں کا زوال۔ ولندیزیوں کا ڈچ۔ دیگر فرسنگی اقوام کی تجارت۔

دوسری فصل: انگریزی کمپنی کے ابتدائی حالات: انگریزوں کی ابتدائی کوششیں۔ بحری تجارت کا آغاز۔ پرتگیزیوں اور ولندیزیوں کی رہائی۔

”امیوے نا“ کا قتل۔ دربارِ مغلہ میں سفارتیں۔ ابتدائی کارخانے انگریز سوداگروں کا باہمی تنازعہ۔ کمپنی کا تجارتی فروغ۔ ملک گیری کے منصوبے اور نا کامیاں۔ نئی کمپنی اور اس کا اتحاد۔ نئی انگلش کمپنی۔

تیسری فصل: فرانسیسیوں کی آمد مہند میں:- پان ڈی چیری کی بنیاد۔ فرانسیسی مداخلت ملکی معاملات میں۔ ڈوہیلے۔ انگریزوں سے پہلی جنگ۔ جنگ میلاپور کی مفروضہ اہمیت۔ دوسری جنگ۔ چھٹی کی کامیابی۔ فرانسیسیوں کی آخری جنگ اور شکست۔

باب

ابتدائی مقبوضات اور لڑائیاں

(از صفحہ ۲۸۹ تا صفحہ ۳۰۰)

بنگالہ میں پیش قدمی۔ سراج الدولہ سے مخالفت اور اس کے اسباب۔ بلیک ہول کا بے سود پاقصہ۔ جنگ پلاسی۔ میرجعفر کی نوابی۔ میر قاسم سے مخالفت۔ جنگ بکسر۔ حصول دیوانی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تاریخ ہند جلد سوم

باب (۱)

سلطنت مغلیہ کا آغاز

پہلی فصل :- بابر کی آمد ہند میں۔

اس میں شبہ نہیں کہ ”لامرکزیت“ کے باوجود پندرھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی مدنی ترقی کی رفتار دو گزشتہ سے زیادہ تیز ہو گئی تھی تاہم سلطنت دہلی کی مرکزی حکومت سے مختلف صوبوں کا انحراف کرنا اصولاً ایک بُری نظیر کا قائم ہو جانا تھا جس نے اپنی اپنی جگہ پر برہمنی حکومت کے استقلال کو مخدوش و مشتبہ بنا دیا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ جس طرح بنگال و دکن یا گجرات و مالوہ کے صوبہ داروں نے خود مختاری کے لالچ میں صدر حکومت

سلاطین ہند
کی کمزوریاں

سے قطع تعلق کیا، اسی طرح خود ان صوبوں کے امرا یا ماتحت عمال اپنی خود مختاری کی آرزو اور سازش نہ کرتے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کی حکومت و ریاست کی دائرہ سلطنت دہلی کے قدیم صوبہ داروں کے برابر وسیع نہ ہو سکتا تھا اور اسی لئے ان کی بغاوت میں کامیابی یا خود مختاری بھی کچھ دیر پا نہ ہوتی تھی۔ بایں ہمہ ہندوستان کی ان چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں ہمسہ بار بار امرا صوبہ دار یا وائی ریاست کے اہل خاندان کی بغاوت کا حال پڑھتے ہیں جو گویا ان نئی سلطنتوں کو اور بھی چھوٹے چھوٹے آزاد و خود مختار حصوں میں منقسم کر دینا چاہتے تھے۔

ہندوؤں کے آخری زمانے میں ہندوستان کی ایسی تقسیم اور سیاسی انتشار کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے جب کہ ایک ایک پر گئے اور ضلع میں کئی کئی حاکم خود مختار ہو گئے تھے لیکن اس دور لامرکزیت میں ایسی نوبت نہ آنے پائی تو اسے عام تمدنی ترقی کی دلیل سمجھنا چاہئے بے شبہہ دکن کی اسلامی سلطنت کے آخر میں کئی حصے ہو گئے تھے لیکن اول تو ان حصوں میں بہت سادہ علاقہ شامل ہو گیا جو پہلے سلطنت بھمنی کی مستقل حدود میں داخل نہ تھا، دوسرے ان خود مختار حصوں کا رقبہ بھی ابتدا سے اتنا تھا کہ اب تک اس دور جدید میں یورپ کی بعض سلطنتوں کا رقبہ اتنا نہیں ہے۔ بہر حال اس عموماً خود مختاری و لامرکزیت نے سلاطین ہند کو بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں ایک حد تک ضرور کمزور کر دیا۔ اور اداپردہ قومی ضعف جو باشندگان ہند کی تاریخی خصوصیت ہے، نووارد مسلمانوں میں بھی نمایاں ہو چلا۔ مسلمان حملہ آور اپنے ساتھ ایک قسم کی فوجی جمہوریت کا آئین لائے تھے جسے ہم نے ”ترک شاہی“ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ لیکن ہندوستان کی فتوحات اور دو صدی کی حکومت نے اس آئین کی بنیادیں ہلا دیں کیونکہ اب یہ فوجی سردار دو لہند اور پیش دوست موروثی زمیندار

قومی ضعف

ع۔ اس موقع پر سلطنت بھمنی کے ابتدائی عہد کا نقشہ سامنے رکھنا چاہئے۔

بن گئے۔ ان کی جنگجوئی اور جمہوریت پسندی میں فرق آگیا اور ادھر تو ان کے مقابلے میں نئے لوگوں کی ترقی کرنے کا میدان تنگ ہوا اور ادھر خود ان (موروٹی جاگیرداروں) کی خود غرضی کا مقصد یہ ہو گیا کہ صدر حکومت ایسے کمزور ہاتھوں میں رہے کہ انھیں اپنی جگہ پر بے غل و غش عیش و عمرانی کرنے کی فرصت مل جائے۔

سلطان براہم

حکومت کے انتظامی معاملات میں عام رعایا کو پہلے بھی قانوناً کوئی دخل نہ تھا لیکن عمائد سلطنت اور فوجی سرداروں کی مذکورہ بالا خود غرضی اور تنگ نظری اب ہندوستان کی شخصی حکومت کو درحقیقت سخت نقصان پہنچا رہی تھی اور ان کی اندرونی سازشوں کو دبانے یا ان سب کو پادشاہ وقت کی اطاعت پر متحد کرنے کے لیے غیر معمولی قسم کی قابلیت درکار تھی۔ مگر سلطان سکندر بن بہلول (لودھی) کا جانشین فرزند، فراست و شجاعت ذاتی کے باوجود، حزم و احتیاط کے اوصاف سے خالی تھا حالانکہ اگر کھٹے میں اس کی تخت نشینی کے وقت (۱۹۲۳ء) کابل کی وہ نئی حکومت قائم ہو چکی تھی، جس کا فرمان روا ہندوستان پر حملہ کرنے کا علانیہ آرزو مند تھا اس طرح کہنا چاہئے کہ دربار لودھی کے سازشی اور باغی امرا کے واسطے کابل میں اب ایسی پناہ لینے کی جگہ بن گئی تھی کہ سلطان ابراہیم لودھی کے لئے ان کو قابو میں رکھنا اور بھی دشوار ہو گیا۔ بایں ہمہ یہ نمایاں خطرہ سلطان ابراہیم کی سخت گیری اور بد مزاجی میں فرق نہ ڈال سکا اور امراء سلطنت پہلے سے بھی زیادہ اس کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ بابر نے جس وقت ہندوستان پر آخری حملہ کیا تو سلطان ابراہیم کے خلاف جا بجا بغاوتیں مہور ہی تھیں۔ بہار و دہلی میں بہادر خاں (لوانی) نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ پنجاب کا صوبہ دار دولت خاں صلیانی مخالفت پر

سلطان سکندر لودھی نے آگرے کے قریب ”سکندرہ“ بسا کر اسے اپنا مستقر بنالیا تھا اور یہیں وفات پائی۔

کمر بستہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے افغان رئیس الگ فتنہ و فساد بپا کر رہے تھے اور خود سلطان ابراہیم کے عزیز قریب علاء الدین نے بھاگ کر بابر کے پاس پناہ لی تھی اور ہندوستان پر حملہ کرنے کی تحریک کر رہا تھا۔

مگر ان خرابیوں سے قطع نظر شمالی ہندوستان والوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ فن حرب میں اپنے معاصرین سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ لیکن علاء الدین خلجی کی جن ہندوستانی فوجوں نے مغلوں سے کنگہ بہ کنگہ جنگ کی ان کے اسلحہ اور حربی واقفیت اپنے حریفوں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ بر خلاف ان کے سلطان ابراہیم لودھی جس لشکر کو میدان میں لایا وہ توپ و تفنگ کے مقابلے میں خالی تیر و خدنگ سے لڑنے آیا تھا اور مغل شہسواروں کے عمدہ قواعد جنگ کے جواب میں اسے فقط اپنی فوج کی کثرت تعداد پر ناز تھا مگر یہ کثرت لڑائی کے وقت الٹی وبال جان ہو گئی۔

دوسرے اہل ہند کے اس مرتبہ جس سردار سے مقابلہ کرنا پڑا وہ اپنے عہد کے بہترین سپہ سالاروں میں شمار ہوتا ہے۔ گیارہ بارہ برس کی عمر سے اس کا قریب قریب تمام وقت جنگ و جدال اور فوجوں کی سپہ سالاری میں گزرا تھا۔ جنگ کے نشیب و فراز موقع و محل اور فوجوں کو لڑانے کے طریقے سے

فوج کی پناہ

مظہیر الدین "بابر"

۱۔ اس جگہ یہ صراحت کر دینی چاہیے کہ گو "باروت" کو غالباً سب سے پہلے چینی قوم نے ایجاد کیا، لیکن بعد میں عربوں نے بغیر ان سے سیکھے بطور خود اسے ایجاد کیا اور ساری دنیا میں رواج دیا تھا لیکن توپ و تفنگ کی ایجاد بہت عرصے بعد ہوئی اور اس صنعت میں اول اول ترک اور اہل اطالیہ ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ایجاد کا ٹھیک زمانہ معین کرنا دشوار ہے مگر چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں مغربی ایشیا میں توپ کا رواج عام ہو گیا تھا مغلوں کی توپوں اور بندوتوں کا حال آگے آئیگا اور ان کے مقابلے میں شاہان بنگال و گجرات کے توپخانے کا ذکر بھی ہم اپنی اپنی جگہ پڑھیں گے لیکن یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سلاطین ہند کی بعض قلعوں کی جو بڑی بڑی توپیں ابھی تک موجود ہیں انھیں غالباً ان بادشاہوں کے ترک یا ایرانی سرداروں نے ہی چڑھیں جنہیں صدی عیسوی میں ڈھالا تھا۔ (اکس فورڈ ہسٹری صفحہ ۲۸۲ نیز دیکھو انسانی کلویڈ یا جلد ہفتم صفحہ ۱۸۹)

وہ بدرجہ اتم واقف تھا اس کی ذہانت و فراست اور عام معلومات کے حیرت انگیز ثبوت اس کی خود نوشتہ سوانح یا "تذکرہ بابر" میں محفوظ ہیں اور اس کتاب کے بعض حصے پڑھتے وقت ہر دم کو بالکل یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ سوٹھویں صدی عیسوی کے کسی جنگجو کی سوانح کی بجائے ہم زمانہ موجودہ کے ایک مشاق اور باخبر جرنیل کا "ڈس پیچ" مطالعہ کر رہے ہیں۔

ایک بڑا فرق جس نے بابر کے حملے کی نوعیت بدل دی یہ تھا کہ وہ اپنے معضل اسلاف کے مانند محض غارتگری اور تاخت و تاراج کے لئے ہندوستان پر حملہ آور نہیں ہوا تھا۔ بلکہ جیسا کہ خود جاجیا بیان کرتا ہے، اس کو مدت سے کم از کم شمال مغربی ہند کے فتح کرنے کی آرزو تھی۔ اسے وہ اپنے جد امجد امیر تیمور کی میراث جانتا تھا اور اسی طرح ایسے اتفاقات پیش آئے گئے کہ یاقض، و قدر نے اسے مجبور کر دیا کہ تحت ہندوستان کو اپنا مطمحہ نظر بنائے۔

تخت نشینی اور پہلی لڑائیاں

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ جس وقت امیر تیمور کا پوتا سلطان ابوسعید میرزا شمالی عراق کے پہاڑوں میں گھبراہٹ کر مارا گیا (۸۵۳ھ) تو اغیار و اعداد کے علاوہ خود سلطان ابوسعید کے چار فرزند اپنی اپنی جگہ خود مختار بادشاہ بن گئے اور انھی میں بابر کا باپ عمر شیخ میرزا (سب سے شمالی صوبے قراغندہ کا فرمانروا)

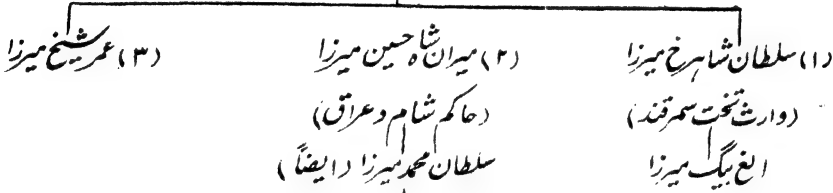
۱۔ جنگ پانی پت و کافوہ (یا کواہہ) (سیانہ) کے علاوہ اس قسم کی ایک دلچسپ نظریہ دو آہ "ندھ ساگر" (پنجاب) کے قلعہ "پرنالہ" کی فتح کے حالات ہیں جنہیں تذکرہ بابر سے فارسی نیز انگریزی میں بہت خوبی سے ترجمہ کیا گیا ہے (تذکرہ بابر کی فارسی حالات حملہ اول (۹۱۹ھ/۱۵۱۹ء) ایڈٹ جلد چہارم وغیرہ۔

تھا بابر اس کا سب سے بڑا بیٹا ہر محرم ۱۵۵۵ء کے دن پیدا ہوا چنانچہ ”شش محرم“ اس کی مشہور تاریخ ولادت ہے اس کی ماں قتلچنگار خانم یونس خاں حاکم ”منول“ کی بیٹی تھی جو چغتائی بن چنگیز خاں کی گیارہویں پشت میں تھا۔

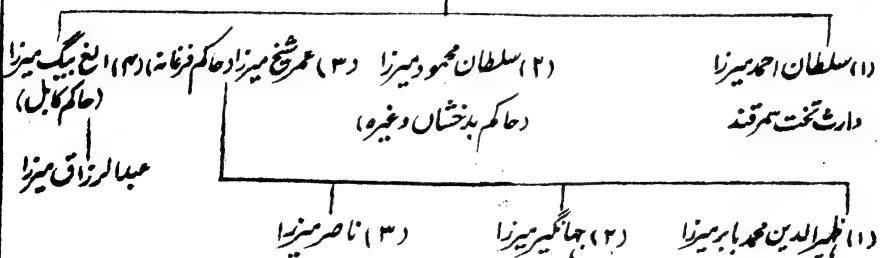
باپ کی ناگہانی وفات کے وقت (رمضان ۱۵۹۹ء) بابر کی عمر پورے بارہ سال کی بھی نہ تھی اور فرغانہ کے پائے تخت اندجان میں اس کے تخت نشین ہوتے ہی دشمنوں نے ہر طرف سے اس پر حملے شروع کر دیے ان حملوں میں اول اول اس کا بہت سا ٹھک چھن گیا لیکن تھوڑے ہی عرصے میں پہلے سلطان احمد میرزا اور پھر بابر کے دوسرے چچا محمود میرزا نے وفات پائی اور اب آل تیمور کے تمام حوصلہ مند سرداروں کی پائے تخت

ع۔ اس بیان کو پڑھتے وقت ذیل کا شجرہ نسب سامنے رکھنا مفید ہوگا :-

امیر تیمور صاحبقران



سلطان ابوسعید میرزا (جو پائے تخت سمرقند پر قابض ہو گیا تھا)



سمرقند پر نگاہ لگ گئی؛ اس قیمتی تر کے کے لئے ہر شخص خون بہانے پر آمادہ تھا اور فرغانہ کے نوجوان اور پر جوش بادشاہ نے بھی اس کے حصول کے واسطے جان اور سلطنت کی بازی لگا دی تھی۔ چنانچہ وہ سمرقند میں فاتحانہ داخل ہوا اور سات سال کی مسلسل جنگ و جدال نے ثابت کر دیا کہ کم سے کم تیمور کی اولاد میں سپہ سالاری اور حکمرانی کی سب سے زیادہ قابلیت عمر شیخ کے نوجوان فرزند بابر میں تھی۔

لیکن اب ماوراء النہر اور تیموری سلطنت کو لینے کے واسطے آل تیمور سے بھی زیادہ بہادر و جاں بازی یعنی اوزبک سردار میدان میں کود پڑے تھے اور انھی اوزبکوں کے ہاتھ سے بے در پے شکستیں کھا کر بابر نے خراسان اور چہر افغانستان کا رخ کیا جہاں اسی زمانے میں اس کے چچا الگ بیگ میرزا نے وفات پائی تھی اور گو اس کا بیٹا عبدالرزاق میرزا اکابر میں تخت نشین ہو گیا تھا لیکن اندرونی فساد کی وجہ سے اسے کابل چھوڑنا پڑا اور دو سال بعد جب بابر اس شہر کے سامنے پہنچا ہے تو اس پر قندھار کے حاکم ذوالنون ارغون کا بیٹا (محمد مقیم) قابض تھا۔

بابر نے کابل کا محاصرہ کر لیا اور اس کی جنگی شہرت اور نیز آگ بیگ سے رشتہ داری نے اہل شہر کو خود بخود اس کا طرفدار بنا دیا۔ چنانچہ چند ہفتے کے معمولی محاصرے کے بعد محمد مقیم نے ہتھیار رکھ دئے اور کسی بڑی لڑائی کے بغیر بابر کا شہر پر قبضہ ہو گیا۔ (سنہ ۱۵۰۴ء)

پانے تخت کابل پر تسلط ہونے کے معنی یہ تھے کہ نہ صرف کابل و غزنی بلکہ دریائے جہلم تک شمالی و مغربی پنجاب کے وہ اضلاع بھی (برائے نام) بابر کے دائرہ حکومت میں داخل ہو گئے جو امیر تیمور کے زمانے سے کابل کے صوبے میں شامل تھے اور بابر کے آئندہ پانچ چھ برس انھی اضلاع کو از سر نو فتح کرنے پر صرف ہوئے، اور اسی ضمن میں فتح ہند کی آرزو اس کے دل میں پیدا ہوئی۔ لیکن ابھی تک اس خیال پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اس کے شمالی دشمنوں کو شاہ اسماعیل صفوی نے سخت شکست دی

(جنگ مرو ۹۱۶ء) اور بابر کو پھر سمرقند کی آرزو نے بیتاب کر دیا۔ چنانچہ ایرانیوں کی امداد سے وہ تیسری مرتبہ تیمور کے پاس تخت میں داخل ہوا (۹۱۶ء) اور کچھ عرصے تک پھروہیں کے جھگڑوں اور لڑائیوں میں الجھا رہا۔ حتیٰ کہ ۹۱۶ء میں اوزبکوں نے دوبارہ تازہ قوت بہم پہنچائی اور بابر اور اس کے ایرانی طرفداروں کو کامل شکست دے کر پھر سمرقند چھین لیا۔ (جنگ غجدوان) جب فرغانہ اور ماوراء النہر پر قبضہ رکھنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تو بابر پھر کابل چلا آیا اور اب اس کے جذبہ کشورتانی کے لیے مشرق میں قسمت آزمائی کرنے کے سوا اور کوئی میدان نہیں رہا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ ”دیگر بہ الہام غیبی رفتن ماوراء النہر را بر طرف کردہ تسخیر مالک ہندوستان را پیش نہاد بہمت والا ساختند، لیکن ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ یہ ”الہام غیبی“ در حقیقت اوزبکوں کے مقابلے میں اپنی بے دست و پائی کا احساس تھا۔

فتح ہندوستان

القصہ اب اس کی توجہ سب طرف سے ہٹ کر فتح ہندوستان پر مبذول ہو گئی اور جب اپنے اندرونی اور مقامی جھگڑوں سے فرصت ملتی تو وہ پنجاب پر فوج کشی کرتا چنانچہ تین حملوں میں دریائے چناب تک شمال مغربی پنجاب پر اس کا مستقل قبضہ ہو گیا اور جو تھی مرتبہ دولت خاں لودھی کے اشارے سے وہ پہلے لاہور آیا اور وہاں کے لودھی سرداروں کو شکست دے کر شہر پر قابض ہو گیا۔ پھر پالپور تک بڑھا اور اس شہر کو سلطان ابراہیم لودھی کے عزا و بھائی علاؤ الدین کے حوالے کر گیا جو اپنے بھائی کا ساتھ چھوڑ کر بابر سے آ ملا (۹۳۰ء) (۱۵۲۲ء)

معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک پنجاب کے بعض افغان سردار اور علاء الدین لودھی اس بات کی امید رکھتے تھے کہ بابر دریائے ستلج سے آگے نہ بڑھے گا اور خود بابر بھی شمالی پنجاب پر قناعت کرنی چاہتا تھا۔ لیکن ان افغان سرداروں میں جو اس سے آگے تھے سخت نا اتفاقی تھی۔ دوسرے علاء الدین لودھی نے بابر کی

امداد سے دہلی پر جو حملہ کیا اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ پس بابر کو نظر آنے لگا کہ جب تک سلطان ابراہیم لودھی سے لڑ کر فیصلہ نہ کیا جائے پنجاب کے معاملات بھی خاطر خواہ طے نہ ہو سکیں گے۔

جنگ پانی پت

اس ارادے سے وہ بارہ ہزار سوار کا چیدہ لشکر لے کر پانچویں ستمبر ہندوستان روانہ ہوا (ماہ صفر ۹۳۲ھ) اور مخالف افغان سرداروں سے ملک پنجاب کو صاف کرتا ہوا، انبالہ و شاہ آباد کے راستے جمنائے کنارے کنارے دہلی پر بڑھایا، تنزک بابر ہی کے مطالعے سے ہی ہر ہوتا ہے کہ اس حملے میں بھی اسے اول اول ہندوستان خاص پرتسلط حاصل ہو جانے کا پورا یقین نہ تھا بلکہ خود سلطان ابراہیم کا مقابلہ کرنے سے بھی آخر تک اس کے ساتھی ہچکچاتے رہے۔

لیکن اول تو پنجاب میں اور پھر حمید خاں حاکم حصار کے مقابلے میں (جو معقول فوج لے کر پانی پت کی طرف سلطان ابراہیم کی مدد کو بڑھا تھا) مغلوں کو نمایاں کامیابی ہوئی جس نے ان کا دل بڑھا دیا اور دوسرے پانی پت پہنچتے ہی بابر نے نہایت مستحکم مورچے اور مددے قائم کر لئے کہ ان کی پناہ نیکر دشمن کا مقابلہ کیا جاسکے۔

سلطان ابراہیم کی بے تمیزی اور شکست

سلطان ابراہیم لودھی کی غفلت کا ایک ثبوت تو یہی ہے کہ اس نے اپنے سردار حمید خاں کو بچانے کا انتظام نہیں کیا اور پھر بابر کو اتنی فرصت دیدی کہ وہ راستے میں اطمینان سے گاڑیاں اور مدافعت کا سامان فراہم کر تا ہوا آیا اور کئی دن تک ہندوستانی لشکر کے قریب ہی پانی پت میں مورچے

مغلوں کے تردد کا تنزک بابر ہی سے جا بجا اندازہ ہوتا ہے (تنزک - حالات ۹۳۲ھ) نیز فرشتہ نے تصریح کی ہے کہ پنجاب کے لودھی سرداروں کا برائے آسانی قلع قمع کرنے کے بعد جب بابر نے دیکھا کہ خود سلطان ابراہیم لودھی کے امرا اور درباری اپنے بادشاہ کے دشمن ہیں تو اس وقت "عازم تغیر کامی ہندوستان شدہ متوجہ دہلی گردید" (فرشتہ صفحہ ۲۰۴) یعنی اس سے پہلے اس کا یہ ارادہ مصمم نہ تھا۔

بنواتا رہا۔ دوسرے اس کی سب سے بڑی غلطی بلکہ حماقت یہ ہوئی کہ بے سوچے سمجھے اس جال میں پھنس گیا جو بابر نے اس کے واسطے تیار کیا تھا۔
 شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ جب بابر نے اپنے دماغے بنا کر توپ و تفنگ کو ان کے پیچھے جمایا تو سلطان ابراہیم کے غدار سرداروں کے اشارے سے ایک رات مغلوں کے دستے نے ہندوستانی لشکر پر چھا پا مارا۔ اور گو اس میں حملہ آوروں کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی تاہم اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان ابراہیم جو پانی پت سے چندیل دور دشمن کے میدان میں نکلنے کا انتظار ہی کر رہا تھا، دوسرے دن بابر کے پڑاؤ پر حملہ کرنے کے ارادے سے خود فوج لے کر بڑھا اور گویا اپنے آپ دشمن کی توپ اور ”ضرب زن“ کا نشانہ بن گیا۔ بابر کی آرزو یہی تھی اور جب اس کی صفوں سے ایک میل کے قریب فاصلے پر پہنچ کر ہندوستانی لشکر ٹھٹھا کا تو پھر بابر نے اسے سوچنے سمجھنے یا توپوں کی زد سے ہٹنے کی مہلت نہیں دی اور معسل سواروں نے پہلوؤں پر اس قدر حملے کیے کہ ہر طرف سے فوج سمٹ سمٹ کر قلب لشکر میں جمع ہونے لگی جس پر بابر کی توپیں گولے برسار ہی تھیں۔

سلطان ابراہیم نے شجاعت ذاتی سے اپنی ناتجربہ کاری اور بیوقوفی کی تلافی کرنی چاہی تھی۔ لیکن اس کا دلیرانہ حملہ بابر کے مستحکم مورچوں پر کوئی اثر نہ کر سکا اور وہ اپنے چار پانچ ہزار جانباز رفیقوں کے ساتھ مارا گیا۔ باقی ماندہ ہندوستانی فوج کی حالت اس سے بھی بدتر ہوئی۔ اپنے سپہ سالاروں کی بد نظمی اور نیز دشمن کے سبک رفتار سواروں اور چالاک تیراندازوں کے پیہم حملوں نے انھیں بازوؤں کی حفاظت کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور دشمن کے قلب پر جہاں مضبوط مورچے بنے ہوئے تھے اور جہاں سے توپیں گولہ باری کر رہی تھیں وہ کوئی کارگر حملہ نہ کر سکے اور سلطان ابراہیم نے حملہ کیا بھی تو وہ بالکل ناکام ہوا۔ ادھر فوج کی کثرت اور صفوں میں الجھل کی وجہ سے ان کو آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا دشوار ہو گیا تھا غرض دو تین گھنٹے تک گولیاں اور تیرے کھانے کے سوا ہندوستانی فوج کی جماعت کثیر لڑائی میں کوئی حصہ نہ لے سکی

اور سورج کے ڈھلتے ڈھلتے بے ترتیب ہو کر بے تحاشا بھاگ نکلی (ماہ جب ۱۹۳۲ء مطابق اپریل ۱۹۵۶ء)

تاریخ ہند کی مشہور لڑائی چند گھنٹے میں ختم ہو گئی۔ اس کی تیاری میں بابر نے جس قدر دوسری کی تھی جیتنے میں اس کی آدھی بھی نہیں اٹھانی پڑی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ فتح کی اصلی تکمیل سلطان ابراہیم لودھی کی موت سے ہوئی ورنہ ہندوستان میں لڑنے والوں کی ابھی تک کچھ کمی نہ تھی، بہر حال، تقدیر نے بہت آسانی سے بابر کو دہلی اور آگرے کا مالک بنا دیا اور اسی بنا پر اگر وہ اپنے آپ کو تمام شمالی ہندوستان کا بادشاہ جائز سمجھ کر مسرور و نازاں ہوا تو یہ کچھ عجیبات نہ تھی۔ اس فتح نے اس کے دل میں نئے نئے ولولے پیدا کر دیے تھے اور اس نے ہندوستان میں مستقل طور پر رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی لیے بعض مغل سرداروں نے دہلی اور آگرے کی لوٹ سے مالا مال ہو کر واپسی کی گفتگو چھیڑی تو بابر ناراض ہوا اور کہنے لگا کہ اتنا وسیع ملک کہ بایں مشقت بدست آور دیم گزاشتن وہ ”نگلنئے کابل“ گرفتار گشتن ”کو نسی عقلندی کی بات ہے؟ پھر اسنے صاف صاف کہہ دیا کہ اب میں ہندوستان سے جانا نہیں چاہتا اور یہاں کے فوائد و مصلح اور میری رفاقت چھوڑ کر بھی اگر کوئی وطن جانا چاہے تو اسے اجازت ہے، چلا جائے!

مردل عزیز بادشاہ کی ایسی تقریر سن کر کسی نے اس کی رفاقت چھوڑی پسند نہ کی۔ لیکن ایک نامور امیر خواجہ کلاں کا دل ہندوستان کی ایک ہی گرمی دیکھ کر سرد ہو گیا تھا۔ اس نے پھر بھی وطن جانے پر اصرار کیا اور بابر نے

ع۔ بابر نے اپنی ترک میں تفصیل سے ہندوستان کے محاصرہ سلاطین اور سیاسی و تمدنی حالات کا ذکر کیا ہے۔ یہاں کی گرمی اور لوگوں کی بد صورتی اور بدودتی کی وہ جا بجا شکایت کرتا ہے لیکن اس نے کئی ورق میں ہندوستان کی پیداوار، پھل پھول اور مختلف شکاری اور اہلی جانوروں کا دلچسپ حال بیان کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ہندوستان میں آتے ہی اس ملک سے خاص الفت و دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

طوا کر ہاس کو کابل جانے کی اجازت دیدی۔

دوسری فصل :- شمالی ہند والوں کی آخری جدوجہد۔

ہندوستان میں مستقل سکونت کے فیصلے نے بابر کے اس حملے کی نوعیت کو بدل دیا اور بہت جلد اس کے عمدہ نتائج کا ظہور ہونے لگا، اول تو مغل سپاہیوں نے لوٹ مار کا خیال چھوڑ دیا اور یہ سمجھ کر کہ آئندہ ہندوستان ہی کے لوگوں میں زندگی گزارنی ہے تالیف قلوب اور میل جول پر مائل ہو گئے۔ ادھر نواح دہلی اور مغربی دہلی کی عام رعایا اور کسان جو یہ سمجھ کر گھروں سے فرار ہو گئے تھے کہ تھوڑے دن بعد مغل چلے جائیں گے تو واپس آجائیں گے، چاروناچار واپس آکر بابر کی اطاعت قبول کرنے لگے بعض چھوٹے چھوٹے رئیس اور قریب حکام کو بھی مصلحت یہی نظر آئی کہ فاتح کی اطاعت قبول کر لی جائے۔ ان واقعات نے قدرتی طور پر بد امنی والے اطمینان کو دفع کر دیا اور اسی کے ساتھ رسد رسانی اور باربرداری وغیرہ کی وہ ابتدائی دقتیں جن کی بابر نے ترک میں شکایت لکھی ہے رفع ہو گئیں۔

بعض افغانی قلعہ داروں نے اپنے مقامی حریفوں سے بچنے کے لیے بابر سے امداد کی درخواست کی اور بعد میں قلعے سپرد کر دیے چنانچہ سنبل اور گوالیار میں یہی ہوا، لیکن ان فوائد کے ساتھ مغلوں کا ہندوستان میں مستقل سکونت اختیار کرنا بہت سے افغان سرداروں کے واسطے مایوس کن تھا اور اسی مایوسی نے ان کو جابجا باہمی اتحاد اور مغلوں کی مخالفت پر کمر بستہ کر دیا لیکن اول اول مشرقی دہلی اور ہمایوں کی گروہ بندی کے خطرناک بن جانے سے پہلے شہزادہ ہمایوں چیدہ افواج لے کر ادھر پہنچا اور جو تھوڑے دنوں میں اس نے دشمنوں سے ملک کو صاف کر دیا اور ہر جگہ اپنے قلعہ داروں کو مستعین کر دیئے۔ مگر یہ انتظام مکمل ہو جانے نہیں پایا تھا کہ ایک دوسرے جیسے کی اطلاع ملی جس نے چھوڑ کے راجہ رانا سانگا کی سرداری میں بہت اندیشہ ناک قوت بہم پہنچائی تھی، مغلوں کو اس کے مقابلے میں پھر ایک مرتبہ اپنی پوری طاقت سے جنگ کی تیاری کرنی پڑی اور سلطنت ہند کے مستقبل پر

راجہ سانگا کا تختہ

۱۔ خواجہ کلاں کا یہ شہر مشہور ہے جو وہ چلتے وقت دہلی میں کسی شاہی عمارت پر لکھ گیا تھا۔

اگر بخیر و سلامت گزیر سہند کنم
سیاہ روئے شوم گر ہوائے ہند کنم

بابر نے ترک میں ایسا شعر لکھنے پر اپنی ہلکی ظاہر کی ہے اور خود بھی جواب میں فی البدیہہ رباعی لکھ کر خواجہ کلاں کو کابل بھیجی تھی۔

دوبارہ امید و بیم کا پردہ پڑ گیا۔
میواڑ کا یہ راجہ جس کا پورا نام سنگ رام سنگھ ہے، ہندوستان
میں اپنے عہد کا مشہور سپہ سالار تھا اور گجرات و ماتوے کے سلاطین
کے ساتھ تیج آزمائی کی مشق نے اس کی جنگی قوت بہت بڑھا دی تھی۔
کرنل ٹاڈ نے اس کی سپہگري اور قبائلی زندگی کے بیان میں حسب عادت
مبالغے سے کام لیا ہے لیکن ونسنٹ اسمتھ کے اس قول کی تزک باری
اور معصومہ تواریخ فارسی سے بھی تائید ہوتی ہے کہ بابر سے جنگ کے
وقت اس کے لشکر میں اسی ہزار سوار اور پانچ سو جنگی ہاتھی تھے اور افغان
اتحادیوں کی امدادی فوج نے کل تعداد کو دو لاکھ کے قریب پہنچا دیا تھا۔
دشمن کی کثرت کے علاوہ مغلوں کے ہر اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اگر
کی جانب رانا کے بڑھنے کی خبر منتشر ہوتے ہی ملک میں ہر طرف شورش برپا
ہو گئیں اور کول، سنبھل، چند اور، قنوج وغیرہ مقامات کی مغل فوجوں کو مجبوراً
ہٹ کر آگرے آنا پڑا اور بعض قلعوں کے دستے وہیں محصور ہو گئے غرض
جیسا کہ بابر نے لکھا ہے، روزانہ ہر سمت سے بری خبریں آتی تھیں اور
ہندوستانی سپاہی اور سردار مغلوں کا ساتھ چھوڑ کر بھاگنے لگے تھے۔
اتفاق سے اسی زمانے میں بابر کے چند احباب اور ایک دستہ فوج کابل
سے آگرے پہنچا اور انہی میں محمد شریف نامی ایک نجومی بھی تھا۔ اس نے
شکست کی فائیں نکال نکال کر لوگوں کو اور بھی بدول کرنا شروع کیا اور مغل

جنگ کا نوہ

علاء اکبر اور ہسٹری صفحہ ۳۲۳۔ نیز دیکھو اکبر نامہ صفحہ ۱۰۶۔ فرشتہ صفحہ ۲۰۸ وغیرہ وغیرہ مختلف
قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید ان افغانی سرداروں کا ابراہیم لودھی کے وقت سے
رانا سنگا کے ساتھ میل جول تھا چنانچہ اس نے بھی بابر کے حملہ کرنے سے پہلے اس کے پاس
کابل میں پیام بھیجا تھا کہ اگر تم شمال سے دہلی پر فوج کشی کرو گے تو میں تم کو مدد دینے کے لیے
جنوب سے پیش قدمی کروں گا (ترک حالات ۱۵۲۶ء۔ نیز دیکھو ترجمہ مسز بیورج،
حصہ سوم صفحہ ۵۲۹)

سرداروں میں پھر ہندوستان چھوڑ کر کابل چلنے کی سرگوشیاں ہونے لگیں۔ لیکن بابر نے ان حوصلہ شکن باتوں کی مطلق پروا نہیں کی اور آگرے سے پچیس تیس میل مغرب میں بڑھ کر (سیکری پر) دشمن کے قریب پڑاؤ ڈال دیا۔ (جمادی الاول ۹۳۳ھ)

پانی پت کی طرح یہاں بھی بابر نے خندقیں کھدوا کر مورچے بنوائے تھے اور اس اثنا میں طرح طرح سے اپنے سپاہیوں کو ابھارتا اور بہت دلا تارہا تھا۔ لیکن لڑائی مورچوں سے کچھ دور آگے موضع کاٹوہ (یا کنواہ) کے میدان میں ہوئی جسے ابوالفضل ”کاٹوہ“ لکھتا ہے۔ اور دن بھر کی شدید غول ریزی کے بعد راجپوت اور ان کے حلیف سخت نقصان اٹھا کر میدان سے فرار ہو گئے۔ مغلوں کو کامل فتح حاصل ہوئی اور سچ یہ ہے کہ بابر اگر اس موقع پر تعاقب کرتا چلا جاتا تو اسی ایک لڑائی میں راجپوتوں کی قوت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا تھا۔۔۔۔۔“ مگر بابر کو وقت کے وقت ”میوات“ اور دو آب کے قریبی اضلاع کی فکر ہوئی۔ اور آگرے واپس آ کر کئی چھینے کی محنت میں اس نے یہاں کا انتظام درست کیا اور دوبارہ ممالک مشرقی کی طرف فوجیں روانہ کیں جہاں افغانی امرا نے سخت شورش بپا کر رکھی تھیں۔ خود بادشاہ نے سال آئندہ جنوب مغربی راجپوتانے پر پیش قدمی کی اور چند یرمی کے مستحکم قلعے کو ہلہ کر کے چھین لیا جسے راجپوتوں نے چند سال سے اپنا جنگی مرکز بنا لیا تھا۔ پھر جبکہ راجپوتانے کی جانب سے اطمینان ہو گیا تو اس نے پوری فوج سے خود بہار پر فوج کشی کی جہاں سلطان ابراہیم لودھی کے بھائی محمود لودھی کے ماتحت بہت سے افغان سردار بابر کے خلاف جمع ہو گئے تھے۔

دیگر فتوحات

۱۔ بابر نے اسی موقع پر شراب سے توبہ کی اور اس کے متعلق ایک جوش انگیز فرمان شائع کیا۔ سپاہیوں کے سامنے اس نے جو پرزور تقریر کی تھی وہ بھی ترک میں محفوظ ہے اور اسی کے اثر سے مغلوں نے حلف اٹھا لیا تھا کہ جیسے جی لڑائی سے منہ نہ پھیریں گے۔
۲۔ لین پول، بابر، صفحہ ۱۸۱۔

باب
جنگ لاگرا

بابر کے کرلے پہنچتے ہی مشرقی دو آب کے فتنے فرو ہو گئے۔ اور محمد زماں میرزا کی اتھٹی تین جو فوج اس نے بہار پر بھیجی تھی اس نے گنگا کے جنوبی اضلاع کو بھی مفدوں سے صاف کر دیا۔ لیکن افغان سردار اب شمالی بہار کے علاقے میں جمع ہو رہے تھے جس پر سلاطین بنگالہ کو اپنی ملکیت کا دعویٰ تھا۔ بنگالے میں ان دنوں نصرت شاہ بن علاء الدین حسین فرما رہا تھا اور فرشتہ کی روایت کے بموجب سلطان ابراہیم لودھی کی بیٹی اسے بیاہی تھی۔ اس بادشاہ نے بابر کے بہار میں آنے سے پہلے مصالحت کی گفتگو شروع کر دی تھی مگر معلوم ہوتا ہے گاگرا اور گنگا کے سنگم پر افغانی سرداروں سے جو لڑائی ہوئی اس میں بنگال کی فوج نے بھی حصہ لیا اور بابر کو دریا اترنے سے روکا۔ ان کے پاس مغلوں کے جواب میں توپیں بھی موجود تھیں اور غالباً ہندوستان کی یہ پہلی جنگ ہے جس میں دونوں فریق اس جدید آلہ آتش بار سے مسلح ہو کر لڑے۔ لیکن بابر نے دریا پر جنگ کرنے اور دریا اترنے کے لیے وسیع پیمانے پر تیاریاں کی تھیں اور لمبی مار کی توپیں ایسے عمدہ موقع سے نصب کی تھیں کہ دشمن کی کشتیاں مغلوں کو دریا اترنے سے نہ روک سکیں، چنانچہ یکے بعد دیگرے بابر کے چھ دستے دریا کے پار ہو گئے اور دو دن کی جنگ میں غنیم شکست کھا کے میدان سے ہٹ گیا (۱۵۲۹ء)۔ اس لڑائی کے وقت خود بابر کا مزاج ناساز تھا اور بنگالے میں آگے بڑھنا مصلحت کے بھی خلاف تھا لہذا نصرت شاہ سے صرف اطاعت و پیشکش سالانہ کا اقرار لے کر بابر آگرے چلا آیا اور یہاں کچھ عرصے سمرقند اور بدخشاں کے معاملات نیز اندرونی انتظامات میں مصروف رہا۔

۱۔ فرشتہ جلد دوم، صفحہ ۳۰۲۔

۲۔ اس لڑائی کے حالات فارسی تواریخ اور نیز اسکین کی انگریزی کتاب میں (جلد اول صفحہ ۵۰۲ وغیرہ) ترک بابر کی مدد سے لکھے ہیں لیکن غالباً سب سے واضح اور دلچسپ بیان لین پول کا ہے۔

بابر کی وفات

تیموری پائے تخت کی ہوس ابھی تک اس کے دل میں باقی تھی لیکن اس طرف فوج کشی کا کوئی موقع نہ مل سکا بلکہ خود صوبہ بدخشاں کا حکومت جس پر بابر کا قبضہ تھا معرض خطر میں پڑ گئی۔ اور اس کی صحت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ کئی مہینے کے علاج سے کوئی نمایاں فائدہ نہیں ہوا حتیٰ کہ ماہ جمادی الاول ۹۳۰ھ (مطابق دسمبر ۱۵۲۱ء) میں اس نے وفات پائی اور وصیت کے مطابق اس کا جنازہ کابل لے گئے جہاں بابر کا مقبرہ اور اس کا باغ آج بھی اہل شہر کی سیرگاہ ہے۔

حد و سلطنت

شمالی ہندوستان کے ایک وسیع حصے پر تسلط اور یہاں کی سکونت اختیار کر لینے کے علاوہ دریائے سندھ کے مغرب میں بھی کئی صوبوں پر بابر کا قبضہ تھا ماوراء النہر کو فتح کرنے کی آرزو برابر اس کے دل میں گدگدی پیدا کرتی رہی اور قند و بدخشاں (یعنی بالائی سیحون کے جنوبی کناروں) پر اس نے آخر تک اپنا قبضہ رکھنے کی کوشش کی کہ شاید کسی وقت میں اس راستے سمرقند پر فوج کشی کا موقع مل جائے۔ بدخشاں کے مغرب اور جنوب میں اس کی حدود حکومت بلخ و ہرات سے جاملتی تھیں اور اضلاع کابل، غزنی و قندھار پر اس کا مستقل تسلط قائم تھا۔ بے شبہہ کہ ہستان سلیمان کے وہ جنگجو قبائل جو آج تک انگریزی حکومت کو دقت کرتے رہتے ہیں ایک حد تک آزاد تھے لیکن جلال آباد، پشاور، سوات و باجوہ کے زرخیز و آباد اضلاع پوری طرح قابو میں آ گئے تھے۔ جنوبی سندھ میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا مگر اندرونی طور پر شاہ حسین (بن شاہ بیگ) ارغون یہاں کا آزاد حاکم تھا اور بابر کی براہ راست حکومت ملتان سے شروع ہوتی تھی۔ تیسری صدی عیسوی سے ایک خود مختار اسلامی سلطنت قائم تھی جس کا محل احوال آئندہ ہماری نظر سے گزرے گا باقی پنجاب اور ہندوستان خاصہ کے تمام علاقوں میں مغلوں کا سکہ چلتا تھا۔ راجپوتانے اور مالوے میں ابھی تک ان کی سرحدی چھاونیاں بیانہ، رنتھنپور اور چندیری سے آگے نہ بڑھی تھیں لیکن ان دونوں علاقوں کے آزاد رئیسوں کی قوت کچھ سیکری کی جنگ اور کچھ آپس کی لڑائیوں نے کمزور کر دی تھی اور ان کے ختم کرنے میں

بظاہر صرف تھوڑی سی مشقت اور فرصت درکار تھی، دو آب کے جنوب میں بندھیل کھنڈ، اور اسی طرح جنوب مشرقی بہار کے پہاڑی علاقوں پر بابر کا قبضہ نہیں ہوا تھا اور بنگالے کی حکومت بھی، خراج گزاری کے رسمی ہمد و پیماں کے باوجود خود مختار تھی۔

لیکن اس عہد کی تاریخوں کو بغور پڑھنے سے معلوم ہو گا کہ مغلوں کی نئی حکومت کو اصلی خطرہ انھی افغان سرداروں سے تھا جنہوں نے دو آب و بہار کی آخری لڑائیوں میں بظاہر ہتھیار ڈال دیئے تھے اور اب جوق جوق مغلوں کی اطاعت و ملازمت قبول کر رہے تھے۔ اس بارے میں فارسی مورخین بالخصوص ابوالفضل کے مبالغہ آمیز بیان سے طالب علم دھوکے میں پڑ جاتا ہے اور گاراکا کی جنگ کو افغانوں کی آخری شکست سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ گوان افغان سرداروں میں باہم شدید تفاق تھا اور مل کر کوئی بڑا کام انجام دینے کی صلاحیت باقی نہ رہی تھی۔ تاہم ان میں لڑنے والوں کی کچھ کمی نہ تھی اور مالک مشرقی میں بہت سے افغان جاگیردار ایسے موجود تھے جو کافی دو تہمند اور حکمرانی کی لذت سے آشنا تھے اور جن کو اپنی سلطنت کے ہاتھ سے نکل جانے اور مغلوں کے تسلط کا قدرتی طور پر دلی صدمہ تھا لیکن ب سے بڑی بات جسے ان کی اخلاقی قوت کہنا چاہئے یہ تھی کہ بار بار شکست کھانے پر بھی وہ شجاعت ذاتی کے اعتبار سے اپنے آپ کو مغل سپاہیوں سے کمزور یا کمتر نہیں سمجھتے تھے اور شیر خاں سوری نے بہت دن پہلے پیشین گوئی کر دی تھی کہ خدا نے چاہا تو تمھوڑے عرصے بعد میں ان مغلوں کو ہندوستان سے نکال دوں گا۔ حالانکہ وہ اس وقت بابر کی فوج میں ملازم اور معمولی سردار تھا۔

۱۔ مثل ارکن (صفحہ ۵۰۵) اور نیرین پول (صفحہ ۱۹۲) دونوں یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس لڑائی نے افغانوں کی قوت کا خاتمہ کر دیا۔

۲۔ انگریزی ترجمہ تاریخ شیر شاہی (ایڈٹ جلد چہارم صفحہ ۳۳۰) یہ تاریخ جسے اکبر کے عہد میں عباس خاں (سردانی بالین) نے تالیف کیا تھا، ہندوستان میں کیا ہے۔

شیر خاں نے چند سال بعد، واقعی اپنا دعویٰ صحیح کر دکھایا لیکن ماننا پڑتا ہے کہ اس میں اس کی ذاتی قابلیت کو جتنا دخل تھا، اسی قدر تقدیر نے بھی مساعدت کی اور بابر کی وفات نے ایک حد تک اس کی کامیابی کا راستہ صاف کر دیا۔ کیونکہ گو ذاتی شجاعت یا دیگر اوصاف شاہانہ کے اعتبار سے بابر کا جانشین اپنے باپ سے کم نہ تھا لیکن اس کی قیاضی اور مروت اخلاقی کمزوری کی حد تک پہنچتی تھی اور اس کی بادشاہی کا اعلان ہوتے ہی خود اس کے بھائی درپردہ اس کی قوت کو مضلل کرنے لگے تھے چنانچہ میرزا کامراں جسے باپ نے کابل کی حکومت دی تھی مبارک باد کے بہانے پنجاب میں آگیا اور بجایا اپنے عہدہ دار مقرر کرنے لگا۔ بایں ہمہ ہمایوں نے نہ صرف چشم پوشی سے کام لیا بلکہ رعایت برادرانہ سے خود ہی کابل کے ساتھ اقطاع پنجاب (تاستلج) کی سند حکمرانی بھی اس کو بھجوا دی!

دوسرے بھائیوں کو بھی اس نے مناصب جلیل عطا کئے اور جشن تخت نشینی کے موقع پر اس قدر داد و دہش کی کہ عام و خاص بادشاہ کے گردیدہ ہو گئے۔ پھر اس نے باپ کا آخری ارادہ پورا کیا اور بندھیل کھنڈ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷) اور ہیں اس کے انگریزی ترجمے پر جو ایٹ کی تاریخ ہند میں شامل ہے، اتنا مت کرنی پڑی۔ مورخ شیر شاہ سوری کا رشتہ دار تھا اور اس کے خاص رفق اور سرداروں کی چشم دید روایات بیان کرتا ہے جس نے اس تاریخ کو نہایت دلچسپ اور مستند بنا دیا ہے۔ مختلف شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب دو صدی پہلے تک ہندوستان میں کافی شہرت و قبولیت رکھتی تھی اور اس کے ایک حصے کا اردو یا ہندوستانی زبان ترجمہ بھی شائع کیا گیا تھا لیکن اہل ہند کی علمی غفلت کی بدولت اب یہاں کے بڑے بڑے کتب خانوں میں غالباً نہ اصل فارسی نسخہ محفوظ ہے نہ یہ اردو ترجمہ۔

عہد ہمایوں کے کوئی بھائی سوتیلی ماؤں سے تھے۔۔۔ کامراں میرزا، ہندال میرزا، اور سکری میرزا تین سگی بہنیں تھیں ان میں ہمایوں نامہ کی مصنفہ گلبدن بیگم کا نام مشہور ہے۔

افغانی حریف
(۱) جونپور میں

کے مشہور سردہ کی قلعہ کا لہجہ کو محاصرہ کر کے فتح کر لیا۔
اسی اثنا میں اطلاع ملی کہ محمود لودھی (برادر سلطان ابراہیم) جو بابر
کے سامنے سے فرار ہو کر بنگال کے علاقوں میں جا چھپا تھا، پھر مشرقی
دو آب پر حملہ آور ہوا اور افغانی سرداروں کی مدد سے جونپور پر قابض ہو گیا
سے لہذا بادشاہ نے کاتنجر سے جونپور کی طرف کوچ کیا اور پھر افغانوں کو
شکست دے کر یہ حصہ ملک چھین لیا۔ ابو الفضل کی روایتوں سے معلوم
ہوتا ہے کہ اب ہمایوں کو صاف صاف نظر آنے لگا تھا کہ جب تک بنگالے
پر مغلوں کا مستقل قبضہ نہ ہو، افغان سرکشوں کی شورش خاطر خواہ دفع نہیں ہو سکتی
چنانچہ وہ کافی جنگی ساز و سامان کے ساتھ فتح بنگالہ کے ارادے سے
روانہ ہو چکا تھا کہ جنوب کی طرف سے ایک نئے نئے فتنے نے سراٹھایا اور بادشاہ
کو مالک مشرقی کی بجائے مالوے اور گجرات پر فوج کشی کرنی پڑی؛
اس فوج کشی کا سبب یہ پیش آیا کہ چند مغل سرداروں نے بادشاہ کے
خلاف دو مرتبہ سازش کی اور دوسری مرتبہ ان میں سے ایک (محمد زماں میرزا)
قید سے چھپ کر فرار ہو گیا اور اس نے بہادر شاہ دلی گجرات کی پناہ لی۔
ادھر علاء الدین لودھی بھی جو اول ہی اول کابل میں بابر کے پاس
پناہ گزیں اور ایک حد تک حملہ ہند کا محرک ہوا اور مغلوں کی مدد سے پہلے
خود ہندوستان پانے کا امیدوار تھا بدخشاں سے بھاگ کر گجرات چلا آیا
تھا جہاں سلطان ابراہیم لودھی کے اور بہت سے مفرو درباری موجود
تھے۔

(۲) دربار گجرات

۱۔ فتح پانی پت کے بعد بابر نے اس کے ارادوں سے اندیشہ مند ہو کر اسے
بدخشاں بھیج دیا اور وہاں وہ غالباً قید یا نظر بند کر لیا گیا تھا (دیکھو اکبر نامہ ۱۲۹)
۲۔ مثلاً عمر خاں و قطب خاں لودھی جن کی بہادر شاہ نے بہت
خاطر مدارات اور دلجوئی کی تھی اور اپنے پاس ہمان رکھا تھا۔ (فرشتہ جلد دوم
صفحہ ۲۱۴)

واضح رہے کہ گجرات کی اسلامی سلطنت ان دنوں بڑے عروج پر تھی اور بہادر شاہ بن مظفر شاہ نے (جلوس ۹۳۲ھ) جو وہاں کا دسواں بادشاہ تھا اس کی وسعت و قوت میں کہیں زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ نہ صرف خاندیس و برار بلکہ احمد نگر میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور ۹۳۷ھ میں اس نے مالوے کی خود مختاری کا خاتمہ کر کے اس ملک کو اپنی سلطنت کا جزو بنالیا تھا۔ وسط ہند کی تیسری بڑی ریاست میواڑ کی جنگی قوت جنگ کاٹھو میں ٹوٹی اور چندیری کی شکست نے راجپوتوں کا رہاسہا اثر بھی زائل کر دیا تھا۔ مختصر یہ کہ بہادر شاہ کو اس پاس اب کوئی مد مقابل نظر نہ آتا تھا اور اس حالت میں اگر افغانی امر کی شہ سے اس کے دل میں تمام شمالی ہند فتح کرنے کی ہوس پیدا ہو گئی ہو تو کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ کم سے کم مغلوں کی جنگی قوت کا اسے کچھ خوف نہ تھا اور جب ہمایوں نے دوسری مرتبہ مطالبہ کیا کہ اگر ہمارے مفروضہ رسموں کو حوالے نہ کیا جائے تو گجرات سے ضرور خارج کر دیا جائے، تو بہادر شاہ نے شاہی مراسلے کا جواب بھی نہ دیا اور علاء الدین لودھی کے پرچش فرزند تاتار خاں کو ہر قسم کی مالی اور فوجی امداد دی کہ وہ خود آگرے پر پیش قدمی کرے۔

تاتار خاں کی فوج میں تقریباً چالیس ہزار افغان سپاہی جمع ہو گئے اور اسی واقعے سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اس قوم کی کافی جنگی قوت اور نیز مغلوں سے تیغ آزمائی کا جوش ابھی تک موجود تھا۔ یہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ شمال مشرقی راجپوتانے میں مغلوں کی سرحدی چھاؤنی اس وقت بیانہ میں تھی اور جب تاتار خاں کی فوج نے یک بہ یک حملہ کر کے یہ قلعہ فتح کر لیا، تو ہمایوں کو اپنی مشرقی مہم ملتوی کرنی پڑی اور تاتار خاں کے مقابلے میں عسکر می میرزا اور ہندال میرزا کو بھیج کر خود اس نے ارادہ کر لیا کہ پہلے بہادر شاہ کی قوت توڑ دی جائے جس کی مخالفت نے اب علانیہ جنگ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تاتار خاں کی فوج میں نظم نہ تھا اور غالباً بہت سے سپاہی فقط لوٹ مار

مالوہ و گجرات

باب

جنگ مندر

کے لالچ میں بھرتی ہو گئے تھے۔ لہذا اس ”لشکر“ کو پراگندہ کرنے میں کچھ زیادہ زحمت نہ پیش آئی اور ایک لڑائی میں خود تاتار خاں گرفتار ہو کر مارا گیا۔ بادشاہ نے ادھر سے مطمئن ہو کر مالوے پر پیش قدمی کی جو حال میں سلطنت گجرات کا صوبہ بن گیا تھا اور سارنگ پور کو (جو آج کل ریاست دھار کے علاقے میں ہے) فتح کر لیا۔ سلطان بہادر شاہ مغلوں کی فوج کشی کے وقت (۹۴۱ھ/۱۵۳۲ء) قلعہ چتوڑ کا محاصرہ کر رہا تھا، کیونکہ گومیواڑ کی ریاست اب کمزور ہو گئی تھی پھر بھی وہاں کے منجھے راجپوتوں نے اپنے مشہور و مستحکم آبائی قلعے کے زعم پر شاہ گجرات کی اطاعت قبول نہیں کی تھی اور اسے ان کی آزادی اپنے مالوی علاقوں کی حفاظت کے منافی نظر آتی تھی۔ حتیٰ کہ مغلوں کی آمد آمد سن کر بھی اس نے محاصرے سے ہاتھ نہ اٹھایا اور چونکہ ہمایوں نے عہد اس کے اور والئی چتوڑ کے معاملے میں مداخلت نہیں کی لہذا گجراتی فوج نے کمال ہمت و استعداد سے چند روز کی ہمت میں یہ مضبوط قلعہ مستحکم کر لیا درمضان ۹۴۱ھ اور اس تازہ فتح کے جوش میں مغلوں سے مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھی، فریقین کا مقابلہ مندر سور کی نواح میں ہوا جو راجپوتانے کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے مغلوں کی تازہ دم اور جنگجو فوج کو دیکھ کر گجراتی سپاہیوں کی ہمت پست ہو گئی اور بہادر شاہ کو جنگ کی بہترین صورت یہی نظر آئی کہ خندق اور مورچے بنا کر ہر طرف اپنی توپیں نصب کر دیں جن پر اس کو بہت ناز اور بھروسہ تھا کہ دشمن کے حملہ کرتے ہی ان کی آتش باری اسے پراگندہ اور تباہ کر دے گی۔

لیکن بابر کا فرزند آسانی سے دشمن کے جال میں پھنسنے والا نہ تھا۔ اُسے بہت جلد گجراتیوں کی کمزوری معلوم ہو گئی اور عام حملے کا خیال چھوڑ کر اس نے اپنے تیر انداز سواروں کے چند دستے چاروں طرف پھیلا دیئے جن کا کام یہ تھا کہ دشمن کو رسد نہ پہنچنے دیں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور چند ہی روز میں گجراتیوں کے لشکر میں اجناس خردی کا قحط پڑ گیا۔ ان کے بیل اور گھوڑے ہلاک اور سپاہی فرار ہونے لگے۔ توپیں مورچوں میں بیکار دھری رہ گئیں اور بیان کرتے ہیں کہ جس وقت خود بہادر شاہ رات کو چھپ کر لشکر گاہ سے فرار ہوا تو صرف پانچ رفیق اس کے ساتھ تھے۔

(شوال ۹۴۱ھ - ۱۵۳۵ء)

اس شکست نے، جس میں کسی بڑی لڑائی کی نوبت نہیں آئی، وقت کے وقت شاہ گجرات کو بالکل بے دست و پا کر دیا اور مالوہ ایک طرف، اب گجرات کا بچانا بھی محال ہو گیا کیونکہ لشکر مغل برابر تعاقب میں بڑھ رہا تھا اور مالوے کا الحاق اور انتظام کرنے کے بعد خود ہمایوں اس کے ملک میں پہنچ گیا تھا۔ واضح رہے کہ پندرہویں صدی عیسوی کے اواخر میں، جب سلاطین گجرات کی حدود حکومت مالوے اور خاندیس و دکن کی طرف بڑھیں تو انھوں نے اپنا مستقر بھی احمد آباد کے جنوب میں چمپانیر یا جانیانر کو بنالیا تھا اور اس کے پہاڑی قلعے کو از سر نو بنا کر پہاڑ کے دامن میں ایک وسیع شہر محمود آباد بسایا تھا جس کی تجارت اور دولت چند ہی روز میں دور دور مشہور ہو گئی تھی۔ لیکن سلطان بہادر شاہ اپنی شکستہ حالی میں یہاں بھی زیادہ عرصے نہ ٹھیر سکا اور مغلوں نے مالوے سے بڑھ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ قلعے کی فوج نے استقلال اور بہادری سے مدافعت کی مگر جب ہمایوں صرف تین سو چیدہ سپاہیوں کے ساتھ رات کو ایک طرف سے دیوار میں میخیں گاڑ کر چڑھ گیا اور قلعے کے اندر دربانوں کو مار کر دروازہ کھول دیا تو پھر محصورین، مغلوں کو دروازے کے اوپر قریب قریب سب لڑ کر مار گئے۔ چمپانیر جو ان دنوں گجرات کا پائے تخت سمجھا جاتا تھا، فتح ہو گیا۔ (ماہ صفر ۹۴۱ھ - ۱۵۳۵ء)

گجرات کا شکست خوردہ بادشاہ اب محض ایک مفروز پناہ گزیں کی حیثیت سے پرگنیروں کے پاس مقیم تھا جنھوں نے کچھ مدت سے گجرات کے جنوب مغربی سرے پر قدم جمالیے تھے اور دیو یا دیب نامی بندر گاہ کو نہ صرف تجارتی مرکز بلکہ اپنا جی مستقر بنالیا تھا۔ جب تک ہمایوں اپنی فوج کے ساتھ گجرات میں رہا، بہادر شاہ کو نہ یہ ہمت ہوئی نہ فرصت کہ کوئی بڑی فوج مرتب کر لیتا۔

۱۔ محمود آباد چمپانیر کا ریشم اور نولاد کی مصنوعات مشہور تھیں اور بڑودہ کے کپس سل شمال میں اس شہر کے وسیع اور شاندار کھنڈروں میں اب بھی چند محلات و مساجد قابل دید ہیں (رگنہ ٹیڑ جلد دوم صفحہ ۱۳۵)۔

لیکن اہل گجرات دل سے اس کے طرفدار تھے۔ اکثر مسلمان سرداروں نے بھی اس کی رفاقت ترک نہیں کی تھی، اور نہ خود وہ مغلوں کی اطاعت پر آمادہ تھا، ایسی حالت میں گوجراتیوں نے ملک میں ایک گشت لگا کر جا بجا اپنے حکام متعین کر دیئے، بایں ہمہ فتح کی تکمیل نہیں ہوئی اور بہادر شاہ کے بعض فوجی سردار جہاں سے موقع ملتا تھا خود مالگڑازی وصول کر لیتے اور کبھی کبھی مغل سپاہ سے ان کی لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں، گوجراتیوں نے اس چھیڑ چھاڑ کو چنداں وقعت نہیں دی اور غلطی سے دشمن کا اصلی ملک چھوڑ کر شاہ گجرات کے بس روئی مقبوضات کی فتح پر متوجہ ہو گیا۔ یعنی کنباہیت و بروج کے اضلاع لیتا ہوا خاندیس، اور مالوے آگیا جہاں کی آب و ہوا اور مناظر اسے بہت پسند تھے۔

فرشتہ کی روایت کے بموجب اسی سفر میں بادشاہ کو شیر خاں سوری کی شورش و بغاوت کی اطلاع ملی اور اسی کے ساتھ معلوم ہوا کہ گجرات کے نئے مغل حکام کی باہمی مخالفت گجراتیوں کو دوبارہ چہرہ دست بنارہی ہے۔ بادشاہ کی پہلی غلطی کو اس واقعے نے اور نمایاں کر دیا کہ احمد آباد کا حاکم یا گجرات کا صوبہ دار اس نے اپنے بھائی عسکری میسرز کو مقرر کیا۔ جو حکومت پاتے ہی اپنی خود مختار بادشاہی کے منصوبے سوچنے لگا تھا، لیکن اوہڑ تو جتپور کے لائق و منظم مغل صوبہ دار سلطان جنید برلاس کی وفات نے مشرقی دہلاؤ اور بہار کے انتظامات میں اتاری پیدا کر دی تھی اور اوہڑ شیر خاں (سوری) کی سرداری میں افغان سرکشوں نے از سر نو ہنگامہ برپا کر دیا، بغرض ہمایوں کو گجرات کا خیال چھوڑ کر اگرے جانا پڑا کہ مالک مشرق کی بغاوت فرو کرنے کے لیے دوبارہ فوج کشی کا سامان کرے۔ مگر ابھی وہ آگرے نہیں پہنچا تھا کہ عسکری میسرز، کچھ مغل سرداروں کی مخالفت اور کچھ گجراتیوں کی جنگی چھیڑ چھاڑ سے تنگ آکر احمد آباد سے واپس چلا آیا اور یہ ملک جسے ہمایوں نے کافی دروسہ می اور ایک حد تک ذاتی جانبازی سے فتح کیا تھا چند مہینے کے اندر مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

شیر خاں کا عروج

مگر یہ محض اُن مصائب اور ناکامیوں کی ابتدا تھی جو ہمایوں کو مغرب پیش آنے والی تھیں کیونکہ اس چند سال کے عرصے میں شیر خاں افغان نے بہاریں بڑی قوت

علا شیر خاں کا اصلی نام فرید خاں ہے اور اس کا خاندان سلاطین غور کی اولاد میں ہونے کا دعویٰ کرتا تھا

بہم پہنچالی تھی اور بنارس کو لوٹ کر چنار کے مستحکم اور باموقع قلعے پر قابض ہو گیا تھا۔ یہ غالباً ۹۳۹ء کا واقعہ ہے جبکہ مہم مالوہ و گجرات پیش آ جانے کی وجہ سے ہمایوں کو اس طرف فوج کشی ملتی کرنی پڑی اور شیر خاں نے بھی رسمی طور پر اطاعت کا عہدہ و پیمان کر کے اسے فی الجملہ مطمئن کر دیا۔ پھر آئندہ تین چار سال تک اس کی حکومت بنگالہ سے لڑائیاں ہوتی رہیں جس نے جلال خاں لومانی کی حمایت میں زبردستی شیر خاں سے لڑائی مول لی تھی۔ بنگالے میں انہی دنوں نصرت شاہ کی وفات (۹۴۳ء) کے بعد وہاں کا ایک امیر سلطان محمود شاہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳) اول اول اس کا دادا ابراہیم شہسوار جو گھوڑوں کی سوداگری کرتا تھا ہندوستان میں آکر بسا اور سکندر لودھی کے عہد میں اس کے باپ کو شہسرام کے ضلع میں فوجی سردار کی حیثیت سے جاگیر ملی جس کے لیے شیر خاں کا بہت دن تک سوتیلے بھائیوں سے جھگڑا ہوتا رہا جنگ پانی پت کے بعد وہ کچھ عرصے تک بارہ کی فوج میں بھی ملازم رہا لیکن باہر اس کی طرف سے بدگمان ہو گیا اور شیر خاں پھر بہار چلا آیا جہاں ان دنوں دو افغان سردار بادشاہی کے مدعی تھے ان میں سے ایک (یعنی سلطان محمود بن سکندر لودھی) کی مخلوں نے قوت توڑ دی لیکن دوسرا (یعنی بہار خاں الملقب بسلطان محمد اصفانی) ابھی تک جنوبی بہار کے ویران کو بہت سی اضلاع میں خود مختاری کا دعویدار تھا۔ شیر خاں ان میں سے حسب موقع کبھی ایک فریق کے ساتھ ہو جاتا تھا کبھی دوسرے کے حتیٰ کہ سلطان محمد نے وفات پائی اور اس کے صفیر بن بیٹے کی طرف سے شیر خاں اس کی تمام فوج اور علاقے پر عادی ہو گیا۔ شیر خاں کی سوانح کو مفصل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے تاریخ شیر شاہی (ترجمہ ایٹ جلد چہارم) اور منتخب التواریخ (صفحہ ۳۵۶) وغیرہ میں یہ حالات تفصیل موجود ہیں۔ ابو الفضل نے مخلوں کی طرفداری میں تصویر کا برائے رخ دکھایا ہے۔ داکٹر نامہ صفحہ ۱۴۸) اور فرشتہ نے اپنے طور پر ان سب تواریخ کا خلاصہ پیش کر دیا ہے (فرشتہ صفحہ ۱۲۰)۔ ۱۔ یہ قلعہ بندس کے جنوب میں دریاے گنگا کے جنوبی کنارے پر واقع ہے اور اس زلزلے میں جنگی اعتبار سے بہار و بنگال کے راستے پر نہایت باموقع اور مستحکم مقام تھا اور کچھ عرصے بعد قلعہ رہتاس کی فتح نے (جو اس سے تقریباً پچھتر میل جنوب مشرق میں دریاے سون پر بہت مضبوط پہاڑی قلعہ ہے) چنار کی جنگی اہمیت اور بھی بڑھادی تھی۔

۲۔ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۰۲ م) مگر انفسٹن کی تاریخ کے تحتے میں ۹۴۰ء درج ہے (صفحہ ۴۸) اور ریاض السلاطین میں اگرچہ ایک جگہ ۹۴۲ء لکھا ہے (صفحہ ۱۳۸) لیکن دوسرے مقام پر تحریر ہے

کے نام سے سلطنت کا مالک بن گیا تھا اور قرینہ کہتا ہے کہ اس انقلاب نے بھی حکومت کی اندرونی قوت کمزور کر دی ہوگی۔ بہر حال حکومت بنگالہ سے جنگ میں شیر خاں کو نمایاں فتح حاصل ہوئی اور بہت سی ٹوہیں اور جنگی ساز و سامان ہاتھ آ گیا اور اب اس نے خود بنگالے پر فوج کشی کی اور سلطان محمود والی بنگالہ کو پامے تخت گور میں محصور کر لیا۔

عزت بہادر بنگال

یہ وقت ہے جب کہ ہمایوں نے دوبارہ ممالک مشرقی کی فتح اور شیر خاں کی سرکوبی کے لیے جنپور کی جانب کوچ کیا۔ (صفر ۹۴۲ھ) اہم کا آغاز چار کے محاصرے سے ہوا جہاں اس وقت شیر خاں کی طرف سے غازی خاں قلعے کا حاکم تھا۔ محصورین بڑی جان بازی سے بڑے مگر دریا کی طرف سے منگلوں کی توپوں نے وہ آگ برسائی کہ آخر کار مدافعت سے ناامید ہو گئے اور انھیں اطاعت قبول کرنی پڑی۔ لیکن اس ایک قلعے کی تسخیر میں چھ مہینے صرف ہو گئے اور اس اثنائے شیر خاں نے بنگالے کے بادشاہ کو بہیم شکست دے کر ملک سے نکال دیا اور خود گور پر قابض ہو گیا۔

سلطان محمود نے شکست کھا کر منگلوں کی پناہ لی اور ہمایوں کو آمادہ کیا کہ جہاں تک جلد ملن ہو بنگالے پر حملہ کیا جائے چنانچہ ہمایوں نے ۹۴۵ھ کے شروع میں گور پر پیش قدمی کی۔ راستے کے پہاڑی دروں میں شیر خاں کے بیٹے نے شاہی ہراول کو روکا اور شکست دے کر پناہ لیا لیکن جب منگلوں کی پوری فوج وہاں آئی تو اس نے ہٹ کر جنوبی پہاڑیوں کی پناہ لی اور ہمایوں کو بنگالہ فتح کرنے کی ایسی جلدی تھی کہ قلعہ رہتاس پر توجہ نہ کی اور آگے بڑھ گیا۔

ہمایوں کی شکست

ابو الفضل کا بیان ہے کہ یہ قلعہ اس وقت ایک برہمن راجہ کے قبضے میں تھا۔ بہر صورت منگلوں کا اس طرف توجہ نہ کرنا، فن جنگ کے لحاظ سے دور اندیشی کے خلاف تھا اور جب شیر خاں ہمایوں کے مقابلے سے بچ کر یہاں پہنچ گیا تو انھیں بہت جلد اس

درتبیہ حاشیہ صفحہ ۲۴) (ص ۱۲۲) کہ اس نے پانچ سال تک بادشاہی کی جس سے شہمہ ہوتا ہے کہ شاید یہ مسئلہ میں ہی تحت نشین ہو گیا تھا۔

۱۔ انغشن کا قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قلعے پر منگلوں کی فوج کشی بنگالہ کے وقت شیر خاں کا

علی پریشاں ہونا پڑا۔ واضح رہے کہ شیر خاں نے بنگالے یا گور کی کوئی مدافعت نہیں کی بلکہ مغلوں کے ادھر بڑھتے ہی یہاں کا تمام مال غنیمت اور اپنی فوج لے کر غیر معروف پہاڑی راستوں سے بھر ہمار کی جنوب مغربی سمت میں آگیا اور قلعہ رہتاس پر قابض ہوتے ہی بنگالے کی بڑی شاہراہ گویا اس کی زد میں آگئی۔

ہالیوں نے گور پہنچ کر بنگالے کا الحاق اپنی سلطنت سے کر لیا تھا لیکن ادھر تو کثرتِ بارش نے بنگالے میں آمد و رفت کے تمام راستے مسدود کر دیئے اور ادھر موسم کی مرطوب آب و ہوا سے مغلوں کی فوج میں طرح طرح کے امراض پھیل گئے۔ سب سے بڑی پریشانی یہ پیش آئی کہ ہندال میرزا نے جو منگھیر تک بادشاہ کے ساتھ آیا تھا اگرے واپس جا کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور گواکٹر نعل سردار اس کی غداری پر نفیر کرتے تھے اور لاہور سے کامراں میرزا بھی بظاہر ہالیوں کی مدد کے لئے آگرے آ رہا تھا جس نے ہندال میرزا کو آگور کی طرف ہٹنے پر مجبور کیا۔ لیکن ان واقعات نے ”ہندوستان خاص“ کے اضلاع میں بھی اتنی ابتری ضرور پیدا کر دی کہ ہالیوں کو وہاں سے کسی فوجی کمک کے آنے کی امید نہیں رہی اور اسے معلوم ہو گیا کہ جب تک وہ خود آگرے نہ جائے معاملات رو بہ راہ نہ ہوں گے۔

لیکن اس عرصے میں بادشاہ کی غفلت و بیکاری سے فائدہ اٹھا کر شیر خاں تمام مشرقی دو آب اور بہار پر قابض ہو گیا تھا۔ منگھیر سے قنوج تک گنگا کے دونوں طرف اور ہندوستان کے راستے کے ہر باموقع مقام اور قلعے میں اس کے فوجی دستے متعین تھے اور گور سے ہالیوں کی روانگی کے وقت دوجونپور کا محاصرہ کر رہا تھا۔ بے شبہ مغلوں کی پوری

جنگ چوتھی
ماہ صفر ۱۰۳۹ھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵) قبضہ تھا۔ لیکن اکبر نامہ (صفحہ ۱۵۳) اور منتخب الثواریخ (۳۴۹) میں صاف صاف تحریر ہے کہ اس قلعے پر شیر خاں نے بنگالے سے داپی کے بعد دھوکے سے قبضہ کیا۔ ابو الفضل کا بیان ہے کہ ہندال کی ماں نے بیٹے کو آگور سے بلا کر کامراں سے مصالحت کرادی تھی اور پھر یہ دونوں بھائی ہالیوں کی مدد کے لیے شیر خاں سے لڑنے پہلے تھے لیکن وقت پر نہ پہنچ سکے اور توفیق اس خدمت دولت پیرائی نیا فتنہ (اکبر نامہ

فوج سے لڑنے کی ابھی تک افغانوں کو جرأت نہ تھی لیکن راستے کے تمام علاقوں سے مغل حکام کا اخراج اور دشمن کا قبضہ مغل سپاہ کی بے دلی اور شکلات سفر میں اضافہ کرنے کے لیے کافی تھا اور جس وقت شیر خاں اپنے تمام دستے سمیٹ کر بنارس کی طرف سے مقابلے کے لیے بڑھا تو اکثر مغل سرداروں نے بادشاہ کو حملہ کرنے کی بجائے دفاعی مورچے بنانے کی صلاح دی اور معلوم ہوتا ہے ہمایوں بھی شیر خاں کے مصالحتانہ پیام سلام اور کچھ اپنی بے سامانی دیکھ کر لڑ کر راستہ نکالنے کے ارادے سے باز آ گیا۔

اب مغلوں کا لشکر بھوجپور کے پرگنوں میں موضع چوتہ کے قریب مقیم تھا جو آراہ سے پچاس میل مغرب میں گنگا کے کنارے واقع ہے اور دیگر دفاعی تدابیر کے ساتھ دریا میں گشتیاں بھی جمع کی جا رہی تھیں کہ اگر صلح نہ ہو سکے اور جنگ کا موقع بھی نہ ملے تو پل بنا کر گنگا کے دوسرے (شمالی) کنارے پر فوج کو ہٹا لیا جائے تاکہ دو افغانوں کے حملے اور تعاقب سے ایک حد تک محفوظ ہو کر آگرے کا سفر جاری رکھ سکے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات نے تھکے مارے مغلوں کی ہمت اور بھی پست کر دی اور جب شیر خاں نے دھوکے سے ایک دستہ فوج بھیج کر ناگہاں ان پر عقب سے حملہ کیا تو لڑائی کا شور ہوتے ہی ہر مغل سپاہی کو بھاگنے کی پٹا لگئی اور اس وقت سامنے سے شیر خاں کی پوری فوج نمودار ہوئی جس نے مغلوں کو اور بھی بھجوا کر دیا اور ہزاروں آدمی دریا میں کود کر تلف ہو گئے۔ کیونکہ ہر شخص کو سلامتی صرف اس میں نظر آتی تھی کہ کسی طرح دریا کے پار ہو جائے اور پل ابھی تک پورا نہیں بنا تھا کہ اس تباہ کن فراری میں کچھ مدد مل جاتی۔

مغلوں کی اس کامل شکست نے شمالی ہند کے اکثر حصوں میں انقلاب پیدا

۱۔ فارسی تاریخوں میں اس لڑائی کے بہت سے چشم دید راویوں کی روایات محفوظ ہیں مگر ان کی جزئیات میں اختلاف ہے۔ مغلوں کے طرفدار مورخ شکست کی اصلی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ شیر خاں نے ضلع کاہمدو بیان کر لیا تھا اور کمال دغا بازی سے دھوکا دیکر حملہ کیا، ٹولف شیر شاہ نے اس الزام کو دفع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن تمام بیانات کو بغور پڑھنے سے آتا تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس شکست میں دشمن کے قریب سے زیادہ خود مغل سپاہیوں کی بے سوسامانی اور پست ہمتی کا دخل تھا اور

بہت مضبوط مورچے بنائے تھے اور ان کے پاس سات سو چھوٹی (۲۱۲ سیر گولے کی) اور اکیس بڑی (تقریباً ۲۵ سیر گولے کی) توپیں تھیں مگر اول تو بعض نمک حرام سرداروں نے اس نازک وقت میں ساتھ چھوڑنا شروع کیا دوسرے بارش نے لشکر گاہ میں رہنا دشوار کر دیا کیونکہ وہ ایسی نشیبی جگہ میں تھا کہ خیموں میں پانی بھر آیا۔ غرض جب مغل سردار بادل ناخواستہ لڑنے کے لئے نکلے تو دشمن کا سامنا ہوتے ہی ان کے غلام اور نوکروں میں گھبراہٹ پیدا ہوئی اور مہمند کی فوجیں جن کی طرف خود شیر شاہ حملے کے لئے بڑھا تھا، لڑائی کی فوج بھی نہ آئی تھی کہ بھاگ بھاگ کر منتشر یا قلب کی جانب پیاہونے لگیں! ایسی لڑائی کا نتیجہ نکلتا تھا وہ ظاہر ہے۔ مغلوں کے صرف چند دستے ایسے تھے جو تھوڑی دیر جم کر لڑے ورنہ ساری فوج میں اتاری پھیل گئی اور شروع ہی سے ترتیب میں ایسا خلل آیا کہ پھر لڑائی کسی کے سنبھالنے نہ سنبھلی اور مغلوں کو کامل ہزیمت ہو گئی۔ (محمّد علی شاہ) ہمایوں اس میدان سے بھی بچ کر نکل گیا۔ لیکن اب اگرے یا دہلی میں ٹھہرنا دشوار تھا۔ فتحند افغانی فوجیں تعاقب میں آرہی تھیں۔ مغل حکام اور سردار ہر طرف سے سمٹ کر پنجاب میں آنے لگے اور لاہور میں ان پناہ گزینوں کی اس قدر کثرت ہوئی کہ رہنے کے لیے مکان میسر نہ آتا تھا۔ مگر باہمی نفاق اور بے سرو سامانی و پست ہمتی کی وجہ سے یہاں بھی دشمن کی مزاحمت یا مقابلے کی کوئی تیاری نہ ہو سکی۔ دوسرے شیر شاہ نے شکست خوردہ مغلوں کا تعاقب نہ چھوڑا تھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ مغلوں سے ملک ٹھالی کر لینے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہ ملے گا لہذا اگرے میں تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ پھر لاہور پر بڑھا اور اس کی آمد آمد کا متعلق سن کر مغل فوجیں کابل و کشمیر کی طرف پر اگندہ ہو گئیں خود میرزا کا مرال جس نے ہمایوں کی مروت سے فائدہ اٹھا کر پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا

مغلوں کا اخراج

ملہ ان کی "پر تاب" کے متعلق کسی قدر شبہ ہے۔ بابر نے اپنی بڑی توپوں کی ارسولہ سو قدم تک بیان کی ہے مگر صاحب تاریخ رشیدی نے لکھا ہے کہ ہمایوں کے ساتھ کی یہ بڑی توپیں "ایک فرسخ" یعنی تین میل سے بھی زیادہ دور تک مارتی تھیں۔ تاریخ رشیدی حالات جنگ تنوچ الیٹ جلد پنجم صفحہ ۱۳۱۔ نیز دیکھو لین پول کی کتاب "بابر" حاشیہ صفحہ ۱۶۱ وغیرہ۔

علاء تاریخ رشیدی۔

اب کمال بڑولی سے ان دعاوی سے دست بردار ہو گیا اور بھائی کو اس پریشان حالی میں چھوڑ کر کابل چل دیا۔ دوسرے بھائیوں نے بھی اسی کی پیروی کی۔ لیکن شیردل بھائیوں کی ہمت پست نہیں ہوئی ناکامیاں اس کی شجاعت و شرافت کے جوہر کو چمکار ہی تھیں اور اس بے سرو سامانی میں بھی بابر کے خلف الرشید کو ہندوستان کی تاجدار کی کا دعویٰ تھا اور اب (رجب ۹۸۵ھ) وہ چند رفیقوں کے ہمراہ جنوبی سندھ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ وہاں کے حاکم (شاہ حسین ارغون) سے مدد لے کر گجرات پر حملہ کرے اور دوبارہ شیرشاہ کے ساتھ تیغ آزمائی کی قوت بہم پہنچائے!

بھائیوں کو ان منصوبوں میں سپہم ناکامی ہوئی جن کا اجمالی ذکر آگے آئے گا۔ تسلسل تاریخی کے لحاظ سے یہاں ہمیں اس کے فہمید حریف کے حالات پر ایک نظر ڈالنی چاہیے جو اب دریائے جہلم سے دریائے برہم پتر تک تمام شمالی ہند کا فرمان روا ہو گیا تھا۔ اس اعتبار سے کہ ادنیٰ رتبے سے ترقی کر کے تخت شاہی تک پہنچا، شیرشاہ (سور) اس بادشاہی سلسلے کی آخری کڑی ہے جس کا سہ حلقہ سلطان قطب الدین (ایک) تھا کیونکہ اس کے بعد کسی غیر شاہی خاندان کے آدمی کو ہندوستان کی فرماں روائی کرنی نصیب نہ ہوئی اور یہی ایک واقعہ شیرشاہ کی غیر معمولی قابلیت کے ثبوت میں کافی ہے لیکن جب ہم اس بات کو یاد کرتے ہیں کہ شیرشاہ کو محض بہار و بنگال کے افغان بادشاہوں سے ہی لڑنا نہیں پڑا بلکہ اس نے مغلوں کی وسیع سلطنت کا مقابلہ کیا اور ان کی جہمی جمائی قوت کو بزور بازو اکھاڑ دیا تو قدرتی طور پر ہمارے دل میں اس کی عظمت سو اہو جاتی ہے اور مغلوں کے طرفدار مورخ اس کی کیسی ہی ناقدری کریں، تمام واقعات کو پڑھ کر چار و ناچار سہسرام کے اس افغان سپاہی کا نام ہند کے شاہان اعظم کی فہرست میں درج کرنا پڑتا ہے۔

۱
(۱) حالی مصنفی اور مغربی شناسی

خوش قسمتی سے اس کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لیے ہمارے پاس تاریخی مصالحو

عہد بلقات اکبری اور تاریخ فرشتہ کے علاوہ منتخب التواریخ میں شیرشاہ کے حالات کافی صحت و تحقیقات کے ساتھ تحریر ہیں اور فاضل مولف نے جابجا چشم دید اور ثقہ راویوں کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن اس کے اوصاف اور کاموں کو سب سے زیادہ واضح طریق پر عباس خاں صاحب تاریخ "شہر شاہی" نے تحریر کیا ہے۔ بتدریج

موجود ہے اور اس کے زمانے کی معتبر شہادتوں کی بنا پر ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شیرشاہ محض ایک ”فہنہ سرشت خداع نش“ لٹیرانہ تھا جیسا کہ ابوالفضل نے اسے دکھانے کی کوشش کی ہے بلکہ نہایت عالی حوصلہ اور فرض شناس بادشاہ گزرا ہے جو اپنے رتبہ جلیلہ کی ذمہ داریوں کو بخوبی پہچانتا تھا۔ تاریخ شیرشاہی کے مؤلف نے اس کے روزانہ مشاغل کا وضاحت سے ذکر کیا ہے جن کے مقررہ اوقات سفر و حضر کسی حالت میں نہ بدلتے تھے۔ مذہبی فرائض و عبادات کے علاوہ اس کا زیادہ وقت ملکی انتظامات اور لوگوں کی دادرسی میں صرف ہوتا تھا اور وہ اس اصول کو خوب سمجھتا تھا کہ دنیا میں رتبہ عالی کے اہل و تحقیق وہ لوگ ہیں جو زیادہ سے زیادہ محنت و ذمہ داری کے کام انجام دینے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ اس کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہی محنت کشی اور مستعدی تھی اور بادشاہ ہونے کے بعد بھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ کہنا چاہئے کہ مرتے دم تک وہ اسی طرح مستعد اور سرگرم کار رہا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱) شیرشاہ کا دل سے مداح ہے لیکن اس کی مدح محض قومی طرفداری پر مبنی نہیں اور نہ اس نے شاعرانہ مبالغے سے کام لیا ہے بلکہ اپنی تاریخ میں بہت سے ایسے واقعات اور دلچسپ حالات جمع کر دیے ہیں جو اس تفصیل و تحقیق سے اور کسی نے نہیں کیے۔ جیسا کہ ہم ایک حاشیہ میں لکھ چکے ہیں اس کتاب کا اصلی نسخہ ہمارے سامنے نہیں مگر الیٹ کے انگریزی ترجمے کی خوبی ان حواشی سے بڑھ گئی ہے جن کا اس تاریخ کی روایات کی تائید میں ”واقعات مشاق“ اور ”تاریخ داؤدی وغیرہ“ دوسری تاریخ کے حوالے سے تبرہم نے جا بجا اضافہ کر دیا ہے (الیٹ جلد چہارم صفحات ۳۰۱ تا ۴۳۳) ان سب کے سوا ہمارا ایک ماخذ اور ڈاماس کی کتاب ”دکر الملک و الف دی پٹھان گلزار“ ہے جس نے ہمد شیرشاہ کی تویخ اور سکوں سے کمال محنت و تحقیقات کے ساتھ نہایت محققانہ اور حیرت انگیز تاریخی نتائج نکالے ہیں (صفحات ۳۹۲ تا ۴۱۰)۔

۱۔ چنانچہ جب محاصرہ کا بوجھ کے دوران میں، ایک آتش بازی کے ٹٹو سے شیرشاہ کے کپڑوں میں آگ لگ کر جا بجا سے بدن جل گیا اور اسے نیچے میں اٹھا کر لانے تو اسی تکلیف و سوزش کی حالت میں تہہ گاہ کہ اند کے بحال می آمد فریاد بر مردم زدہ، ترغیب برگرفت قلعہ می نمود و ہر کس کہ بدیدن (یعنی یہ عیادت الہی آمد اشارت بچنگ می کرد و.....) ”حالت جاں کنی میں بادشاہ کی اس حیرت انگیز توجہ نے سپاہیوں

باب
قوم پرستی

لیکن اس زمانے کے مذاق کے مطابق شیر شاہ کا سب سے نمایاں وصف وہ قوم پرستی ہے جس کے والہانہ جوش میں اس نے جان کی بازی لگا دی تھی۔ اپنے ہمعوم افغانوں کی جنگی اور انتظامی برتری کے ثبوت میں جب تقریروں سے کام نہ چلا تو اس نے طاقتور مغلوں کے خلاف تلوارِ علم کی اور شاید اسی جذبہ قوم پرستی کا طفیل تھا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا آخر سچ کر دکھایا۔

ہندی افغانوں کی ہر میت خوردہ قوم کو دوبارہ آزاد و حکمران بنانے کے واسطے سب سے دشوار و اہم کام یہ تھا کہ ان کے باہمی نفاق کو دور کیا جائے جس نے ہر افغانی خاندان کی قوت منتشر کر رکھی تھی۔ اس میں شیر شاہ کی سعی مشکور ہوئی۔ افغان لوگ نہ صرف آپس کی مخالفت سے باز آئے بلکہ نہایت منتظم اور طاقتور قوم بن گئے اور حق یہ ہے کہ اس قومی خدمت پر شیر شاہ جس قدر ناز کرتا بجا تھا چنانچہ قوتِ جنگ کے نازک موقع پر اس نے افغانی سرداروں کے سامنے ایک جوش ایجنہ تقریر کی اور انھیں یاد دلایا کہ مجھ سے جہاں تک ممکن تھا میں نے تم کو متحد و فراہم کرنے کی کوشش کی اور مل کر جنگ کرنے کے قاعدے سکھائے اور یہ سب کچھ کوشش و تدبیر آج کے دن کے واسطے تھی۔ اب وہ آرایش کا وقت آگیا۔ اور آج مجھے دیکھنا ہے کہ تم میں سے کون کون سا بہادر میدان میں شجاعت کے جوہر دکھاتا اور ہمتیوں پر بازی لے جاتا ہے..... ملجواب میں سرداروں نے اس کے احسانات کا اعتراف اور اطاعت و جاں نثاری کا اقرار کیا اور اپنے اپنے ماتحت و کول میں اسی قومی جوش جنگ کی روح پھونک دی۔

ہندی افغانوں
کے عمل حالات

یہ سب اس وقت کی باتیں ہیں جب کہ ایک دشمن قومی سے مقابلہ درپیش تھا۔ لیکن جب ان قومی خدمات کے صلے میں خدا نے اسے دنیا کے سب سے بڑے ہمعصر سلاطین میں شامل ہونے کا شرف دیا تو گویا جب قومی کے اہلکار کا بہترین موقع مل گیا اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲) میں عجیب جوش پیدا کر دیا اور انھوں نے ایسا جان توڑ کر حملہ کیا کہ انھیں مسیا مغبوط قلعہ چند گھنٹے میں فتح ہو گیا۔ نوید فتح سن کر شیر شاہ نے اطمینان سے جان دی اور مرتے مرتے سپاہیہ اسے ادائے فرض اور غم دلیرانہ کی یہ دلولہ خیر نشال یادگار چھوڑ گیا۔
علا تاریخ شیر شاہی مترجمہ الیٹ جلد چہارم صفحہ ۳۸۱۔

اس نے ہندی اور نیز خالص افغانوں پر بڑی بڑی نوازشیں کیں۔ واضح رہے کہ افغانستان کے جنگجو سپاہیوں کی ہمیشہ سے ہندوستان میں قدر کی جاتی تھی حتیٰ کہ مسلمانوں کی فتوحات ہند کے وقت بعض ہندو ریاستوں میں بھی افغان سپاہیوں کے ملازم ہونے کا سراغ ملتا ہے۔ پھر جب دہلی میں اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو قدرتی طور پر بہت سے افغانی مسلمان سوداگری یا ملازمت کے لیے ہندوستان میں آنے لگے اور ان کے بعض خاندان پنجاب و دود آب کے اقطاع میں آباد ہو گئے۔ منسل حلقہ آوروں کے ساتھ بھی کہیں کہیں افغانوں کی آمد کا ذکر آتا ہے۔ مگر انھیں ہندوستان میں سب سے پہلے عروج اس وقت حاصل ہوا جب کہ ان ہی کے ایک ہجوم بہلول لودھی نے تخت دہلی پر قبضہ کر کے شمالی ہند میں خاصی وسیع سلطنت قائم کر لی اور بڑے بڑے عہدے اور بہت سی جاگیریں دے کر صد ہا تازہ ولایت افغانوں کو ملک میں جا بجا آباد کر دیا۔ یہی جاگیر دار تھے جو لودھیوں کی مرکزی حکومت ٹٹنے کے بعد بھی بارہو ہمایوں سے ساہا سال تک لڑتے رہے اور بہت سی ناکامیاں اٹھانے کے باوجود آخر کار انھوں نے شیر شاہ کی سرکردگی میں مغلوں کو نکال کر ایک مرتبہ پھر اپنی حکومت قائم کر لی۔

یہ نیا افغان بادشاہ بہلول لودھی سے کہیں زیادہ جب قومی کا جذبہ رکھتا تھا اور قدرت نے سلطنت بھی اسے زیادہ وسیع عطا کی تھی پس ہر افغان زادے کو جو اپنی وطنی زبان (پشتو) میں بے تکلف شیر شاہ سے گفتگو کر سکتا تھا، سہ گری کی معمولی قابلیت دیکھ کر حکومت کی طرف سے معقول مناصب و جاگیر مل جاتی تھی اور یہ فیاضی اس قدر عام تھی کہ مولف تاریخ شیر شاہی کے الفاظ میں ”رو ۵ اور ہندوستان کا کوئی افغان باشندہ اس کے عہد حکومت میں نادار و محتاج نہ رہا بلکہ سب خوشحال اور امیر ہو گئے تھے“۔

”روہ“ اس علاقے کو کہتے تھے جو دریائے سندھ سے کابل تک اور چترال سے

سیاح

معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ کو اپنی وطنی زبان سے خاص محبت تھی اور وہ افغانوں سے بالعموم اسی زبان میں گفتگو کرتا تھا (تاریخ شیر شاہی) ایٹ جلد چہارم صفحہ ۴۱۳۔
ایٹ جلد چہارم صفحہ ۴۱۴۔

موجودہ وزیرستان تک پھیلا ہوا ہے اور جس کا بیشتر حصہ آج کل ”صوبہ سرحدی“ میں داخل ہے۔ شیرشاہ کا خاندان ہندوستان آنے سے پہلے اسی ”دروہ“ کے جنوبی اضلاع کا رہنے والا تھا اور یوں بھی یہ علاقہ ہمیشہ سے افغانوں کے اکثر مشہور و ذی اثر قبائل کا مسکن رہا ہے۔ لیکن قومی ہمدردی کے علاوہ ہندوستان کے اس ہوشمند بادشاہ کا اہل روہ کے ساتھ اس قدر فیاضی کرنا مصلحت سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ گو ہمایوں دو سال تک سرگرداں پھرنے کے بعد ۹۵۰ھ (ماہ ربیع الثانی) میں ہندوستان کے حدود سے نکل گیا تھا، تاہم کابل و قندھار میں مغلوں کی حکومت تھی اور ادھر حیدر میرزا (دوغلات) نے کشمیر فتح کر کے (۹۵۰ھ) پنجاب کے شمال میں اس قوم کا ایک بنیام مرکز بنالیا تھا۔ خود شمال مغربی ہند میں جہلم کے پار میدانی اضلاع پر بغل سردار داخل تھے اور شیرشاہ کو دوسرے کاموں سے اتنی فرصت نہ تھی کہ وسیع پیمانے پر فوجی مہم بھیج کر ان مغلوں کے اخراج کی کوشش کرتا۔ نظربریں روہ کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانا گویا دشمن کے راستے میں اپنے حلیف بھیا کر لینا تھا اور یہ اسی قسم کی حکمت عملی تھی جس کی بنا پر آج تک ہندوستان کی انگریزی حکومت افغانوں کے سرحدی قبائل کے ساتھ غیر معمولی مراعات کرتی رہتی ہے۔

جنگی اصطلاحات

ظاہر ہے کہ سلطنت کی اصلی قوت خود اس کی فوج اور جنگی ساز و سامان پر منحصر ہے اور شیرشاہ اس فرض کی طرف سے کسی طرح غافل نہ ہو سکتا تھا۔ مگر حقیقہ یہ ہے کہ اس نے چار پانچ سال کے اندر سلطنت ہند کی جنگی قوت کو جس مرتبے پر پہنچا دیا اس کی نظیر نئی دشوار ہے۔ اس کی فوج میں تقریباً پانچ ہزار (جنگی) ہاتھی، ڈیڑھ لاکھ سوار اور پچیس ہزار پیادہ سپاہی تھے۔ لیکن ہاتھیوں پر بھروسہ کرنے کا اب زمانہ نہیں رہا تھا اور شیرشاہی افواج کے متعدد دجوش جدید ترین آلات حربہ یعنی توپ و تفنگ سے مسلح تھے۔ تاریخ شیرشاہی نے صراحتہً جو بیس ہزار تفنگچیوں کی تعداد بتائی ہے جو مختلف چھاؤنیوں اور قلعوں میں متعین تھے۔

علیہ اور ذیل کے واقعات تاریخ شیرشاہی مترجم ایڈٹ کے آخری حصے (صفحات ۲۰۹ تا ۲۳۲) سے اخذ ہیں اور ان کی مترجم کے حاشیہ نیز دیگر فارسی تواریخ سے ایک حد تک تائید ہوتی ہے۔

پائے تخت کی خاص شاہی افواج کو چھوڑ کر سب سے بڑی اور قوی فوجیں پنجاب کی سرحدوں پر تھیں جو شمال مغرب کے خطرناک حریفوں کا پرانا راستہ ہے لیکن اس وقت کابل و کشمیر میں مغلوں کے جنگی مرکز ہونے کی وجہ سے، دینر شمال مغربی پنجاب کے کھوکھوں پر نظر رکھنے کے واسطے جو کسی حد تک مغلوں کے طرفدار تھے، شیر شاہ شمالی پنجاب کے وفاعی انتظامات کو ملتان و دپال پور کی چھاؤنیوں سے زیادہ اہم سمجھتا تھا اور لاہور و پشاور کا راستہ محفوظ رکھنے کے لئے جو تدا میر اس نے اختیار کی تھیں وہی اس کی جنگی اور انتظامی قابلیت کا نہایت عمدہ ثبوت ہیں۔

قلعہ رہتاس
(پنجاب)

عین اس مقام پر جہاں دریائے جہلم کشمیر کے جنوبی پہاڑوں سے نکل کر پنجاب کے میدانوں میں داخل ہوتا ہے، اور جس کے متصل قصبہ جہلم آباد ہے، کشمیر و کابل سے ہندوستان آنے کے راستے مل گئے ہیں۔ جنگی ضروریات کے اعتبار سے ملک پنجاب کا سب سے اہم ہی مقام ہے اور یہیں راجہ پورس نے سکندر (مقدونی) کو دریا عبور کرنے سے روکا تھا۔ اگرچہ ہمیں اس بارے میں بہت کم حالات معلوم ہیں۔ لیکن پہلے راجہ یا بعد کے اسلامی سلاطین کبھی اس "ناکے" کو کافی مستحکم نہیں بنا سکے جس کا ایک سبب یہاں کی نیم وحشی آبادی کی شور و شستی اور علاقے کی کم آبادی کو سمجھنا چاہئے۔ متقل سلاطین کے عہد میں، جو کشمیر و کابل پر بھی حکمراں تھے، یا آج کل جب کہ ہندوستان کی مغربی سرحد کو ہستان سلیمان قرار دی گئی ہے، اور کشمیر بھی انگریزوں کے زیر اثر ہے، مذکورہ بالا مقام کی جنگی اہمیت باقی نہیں رہی۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، مغلوں کے تسلط سے قبل ہندوستان کی وفاعی ضروریات بالکل دوسری تھیں اور جہاں تک تاریخی شواہد محفوظ ہیں، بلین کے بعد شیر شاہ و دوسرا بادشاہ ہے جس نے ہندوستان کے جنگی مسائل کو نہایت عمدہ طریق پر سمجھا اور ملکی حفاظت کی بہترین تدابیر اختیار کیں چنانچہ اسی مقام پر دریائے جہلم کے پار اس نے ایک نہایت وسیع و مستحکم قلعہ بنایا جس کی فصیلیں دس گرجوڑے آٹھ کی بندرہ سو گرجوڑے تک بلند تھیں، قلعے کا محیط یا دور ڈھائی میل اور اس میں آٹھ برج اور بارہ عالی شان ونگین دروازے تھے مقامی آبادی کی شورش و عدالت کی وجہ سے مزدوروں کو غالباً دور دور سے لانا پڑا جس کی بدولت خرچ کی میزان اور بھی زیادہ ہو گئی تھی اس جنگی حصار کو

سلا گزے ٹیر، جلد اکیس صفحہ ۳۲۲۔ اس کتاب میں مصادر تعمیر کا تخمینہ چالیس لاکھ روپے دسکرا رائج الوقت،

باب

شیر شاہ نے اپنے بہادر کے عزیز قلعے کے نام پر "پرتاس نو" مہوم کیا تھا اور پس اس کا سب سے لائق پرمالار ہیست خاں "ہالیون اعظم" کے پر معنی خطاب کے ساتھ متعین تھا۔

ہیست خاں کے ماتحت (لشکر شاہی کو مستثنیٰ کر کے) سب سے بڑی فوج اسی سردی افواج نے قلعے اور گرد و نواح کی چھاؤنیوں میں رہتی تھی اور اس میں تیس ہزار چیدہ جنگی ہوا شامل تھے۔ اس کے عقب میں سپہ سالار حمید خاں نے موجودہ سیالکوٹ سے کانگری کے ضلع تک پہاڑی قلعوں کا ایک جال تیار کر دیا تھا اور کسی پہاڑی رئیس یا قبیلے کی مجال نہ تھی کہ سرکاری مطالبات ادا کرنے سے انکار کر سکے، جنوب میں ملتان اور وپالپور پنجاب کے قدیم جنگی مرکز تھے اور یہاں ہر قسم کی فوری ضروریات کے لئے شیر شاہ نے بہت کچھ ساز و سامان اور فاضل روپیہ جمع کر دیا تھا۔ گجرات کو وہ اپنی سلطنت میں شامل نہیں کر سکا لیکن راجپوتانہ اور مالوے کے تمام مشہور قلعے اس کے قبضے میں تھے اور اس جنوبی سرحد کا سب سے بڑا جنگی مرکز اس نے چتوڑ اور ماتنڈو کو بنا دیا تھا۔

دو آب اور شرقی ممالک پر کسی بیرونی دشمن کے حملے کا اندیشہ نہ تھا۔ لیکن مردم شناس بادشاہ کو ملکی نظم و نسق کے واسطے بھی اکثر عہدہ دار نہایت لائق و عظم ملے تھے جنہوں نے چند ہی سال میں احکام شاہی کے مطابق مزدور و زمینوں کی پیمائش اور تشخیص، مالگزاری کا دشوار کام مکمل کو پہنچا دیا اور شمالی ہند کے تمام صوبوں میں بندوبست کے یکساں اصول اور ضوابط مروج ہو گئے۔ وضع رہے کہ اس قسم کی باقاعدہ پیمائشیں بعض خطی اور تعلق بادشاہوں کے زمانے میں بھی کی گئی تھیں لیکن ان کا دائرہ محدود تھا اور اسی طرح کو "لامرکزیت" کے زمانے میں مالگزاری اور بندوبست کے آئین و قوانین میں بہت سی اصلاحات اور ترقیاں عمل میں آئی تھیں بایں ہمہ شیر شاہ شمالی ہندوستان کا پہلا بادشاہ ہے جس نے بہت وسیع اور ہمگیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶) کیا ہے تاریخ داؤدی میں اس کتبے کے حوالے سے جو صدر دروازے پر کندہ تھا کل مصارف "آٹھ کروڑ پانچ لاکھ دام" لکھے ہیں (البتہ جلد چہارم حاشیہ صفحہ ۲۱۹) جس کے شیر شاہی یا قدیم سنگے میں تقریباً سو اکیس لاکھ روپے ہوئے اور یہ اس زمانہ ارزانی میں جب کہ روپے کی قیمت خرید کہیں زیادہ تھی بہت بڑی رقم ہے۔

پیمانے پر اپنی سلطنت کے ایک ایک گاؤں کی پمائش کرائی اور اسی لیے تاریخ شیرشاہی کا یہ بیان کہ ”اس سے پہلے زمین کی پمائش کا یہ طریقہ رائج نہ تھا“ بے بنیاد نہیں ہے۔ اسی طرح مالگزار کی واسطے صوبے کی ”سرکاروں“ میں اوپر سیرکار کی ”پرگنوں“ میں تقسیم اور مالگزار کی مخصوص عامل، خزانچی، شہنشاہ، کارکن وغیرہ عہدہ داروں کا تقرر دراصل اکثر عہد شیرشاہی کی وہ اصلاحات میں جنہیں ابو الفضل کی تحریروں سے مغالطہ کھا کر اس زمانے کے تاریخ نویسوں نے اکبر بادشاہ سے منسوب کر دیا ہے۔

شیرشاہ کی ان اقتصادی اصلاحات خصوصاً اصلاح سکہ، نیز محکمہ عدالت اور ڈاک کی تنظیم کے متعلق ہیں آئندہ ابواب میں پھر کچھ لکھنے کا موقع ملے گا۔ ان حالات کو اجمالی طور پر یہاں بیان کرنے سے صرف یہ تاریخی نتیجہ نکالنا منظور ہے کہ شیرشاہ کا ہمایوں پر غلبہ ہندی مسلمانوں کی محض ایک ہنگامی کامیابی نہ تھا بلکہ درحقیقت اس کا عہد حکومت شمالی ہندوستان میں ایک بہت بڑے سیاسی انقلاب اور اس شہرہ آفاق سلطنت کا افتتاح کرتا ہے جو آئندہ مغل بادشاہوں سے انتساب اور مزید رونق و ترقی حاصل کرنے والی تھی، لیکن عہد اکبری کی شان و شوکت یا دربار جہانگیری کے جاہ و احتشام کے دلکش قصوں کو پڑھتے وقت ہمیں یہ نکتہ نہ بھولنا چاہئے کہ بارہ ہمایوں بآل ہمد اوصاف و قابلیت تیرہ چودہ برس کے عرصے میں سلطنت کے اندر وہ استقلال اور نظم و نسق نہ پیدا کر سکے جو ہسرام کے ایک افغان سپاہی زادے نے پانچ سال کے اندر پیدا کر دیا تھا۔ اور نیز یہ کہ نوجوان اکبر کی آئندہ شہرت و کامیابی کی ایک بڑی وجہ

عام نتائج

علا صاحب تاریخ شیرشاہی نے اپنے مدوح کے حالات کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ ”اس نے تھوڑے ہی عرصے میں ملک پر تسلط بھی حاصل کیا اور اسی فرصت قلیل میں راستوں کی حفاظت، سپاہ و رعایا کی خوشحالی اور سلطنت کے نظم و نسق کے مفصل آئین ہتیا کر گیا“ اس جامع تعریف کی تائیدیں اور ڈٹا ماس کا خلاصہ تحقیقات پیش کرنا فائدے سے خالی نہ ہو گا جو شیرشاہ کے اوصاف حکمرانی کا ہمایوں سے مقابلہ کر کے اور قابل ترجیح قرار دے کر لکھتے ہیں کہ ”جس طرح شیرشاہی سکوں کی کثرت اس کی سلطنت کے استقلال و وسعت کا ثبوت ہے اسی طرح ان کے مختلف اور بعید مقامات میں ہاتھ آنے سے جو معلومات اخذ ہوتے ہیں اس کی بنا پر ہم و ثوق کے ساتھ

باب

یہی ہے کہ وہ دور لاہر کرنیت کے لودھیوں کے بعد نہیں آیا بلکہ عہد تجدید شہنشاہی کے شیر شاہی سلاطین کا وارث ہوا۔

لیکن شیر شاہ کے انتقال (۱۵۵۵ء) اور شاہ ایران کی فوجی مدد سے ہمایوں کے دوبارہ کابل پر مسلط ہونے کے بعد بھی کئی سال تک مغلوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی جرات نہیں ہوئی جہاں اب شیر شاہ کا بیٹا جلال خاں اپنے بڑے بھائی کو کچھ مصالحت سے اور کچھ زبردستی ہٹا کر سلطان سلیم شاہ (یا اسلام شاہ) کے لقب سے بادشاہ ہو گیا تھا۔ اسے انتظامی قابلیت اور مستعدی اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی اور کم سے کم ان آئین و ضوابط کو جو شیر شاہ نافذ کر گیا تھا جاری رکھنے کی لیاقت رکھتا تھا۔ گور سے رہتاس تو تک ایک بڑی شاہ راہ شیر شاہ کے عہد میں صاف اور آباد کرائی گئی تھی اور اس کے ہر دوسرے میل پر بادشاہ موصوف نے پختہ سرائیں بنوا دی تھیں جن میں ہر مذہب و ملت کے محتاج مسافروں کی سرکار کی جانب سے ہمانی کی جاتی تھی۔ سلیم شاہ نے نہ صرف ان کی مرمت کی اور دیگر مصارف بحال رکھتے بلکہ حکم دیا کہ ہر دوسراؤں کے بیچ میں ایک ایک سرائی کی طرف سے اور تعمیر کرا دی جائے۔ غور کیجئے تو یہ فیاضی ”شاہانہ اسراف“ میں داخل تھی اور دیگر واقعات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکپن معمولی حالت میں گزارنے اور باپ کی سپاہیانہ تربیت پانے کے باوجود سلیم شاہ ان عیوب سے خالی نہ تھا جو موروٹی بادشاہوں کی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں، ممالک عالم کی ہر ایک تاریخ اور اخبار حاضرہ برابر فرسایا دکر رہے ہیں کہ بادشاہوں کو بلکہ ہر شخص کو ایسی مطلق العنانی جس میں خالق کائنات یا کم سے کم نبی نوع کے مجاہد کا خوف باقی نہ رہے، ہمیشہ خود پرستی اور ظلم و شقاوت کے راستے پر ڈال دیتی ہے اور بعض اوقات ایسے ایسے افعال کا ارتکاب کراتی ہے جو بالکل مجنونانہ نظر آتے ہیں۔ پس سلیم شاہ کے دیگر متکبرانہ احکام کے ضمن میں جب ہم یہ پڑھتے ہیں تو کچھ حیرت نہیں ہوتی کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸) کہہ سکتے ہیں کہ شیر شاہ کا اپنی رعایا پر تسلط و اثر بھی غیر معمولی نکس کو پہنچ گیا تھا۔

(دراذیل صفحہ ۲۰۴)۔

مختار التواریخ صفحہ ۳۸۴۔

ہر ولایت (یا سرکار) کے مستقر پر جسے کے دن تمام شاہی عہدہ دار اور امرا جمع ہوتے تھے اور ایک بلند شامیانے میں کرسی پر سلطان سلیم شاہ کی جوتی رکھ کر اس کے روبرو سر جھکاتے تھے اور وہ اب تمام ہر کد ام بجائیگا و متقین می نشستند۔ دو برس می آمد و آں حکن نامہ (یعنی مجموعہ قوانین شاہی) را کہ بمقدار ہشتاد و بند کاغذ بود و کمابیش مکتوب مفصل می خواند و ہر مسئلہ کہ اشکال می داشت جمیع شقوق و انواع در اں می یافتند و بہ عمل در می آوردند.....

سلیم شاہ کی روز افزوں رعونت اور عیش پسندی کی بعض اور شالیں بھی محفوظ ہیں اور گوبادشاہ کی ان بد عنوانیوں کا عام لوگوں پر اول اول زیادہ اثر نہیں پڑا، تاہم درباری امرا بیزار ہونے لگے اور جب ایک بغاوت میں سرحدی پنجاب کے نامی سپہ سالار ہعبیت خاں نے بھی شرکت کی تو چند روز کے لئے سلیم شاہ کی حکومت کی خیر نظر نہ آتی تھی لیکن کچھ اس کی جتنی مستعدی اور زیادہ تر باغی امیروں کی باہمی نا اتفاقی کی وجہ سے یہ خطرہ دفع ہو گیا اور دو شکستیں کھا کر اہل سازش کی قوت ٹوٹ گئی مگر ان واقعات نے ایک طرف تو سرحد کے سب سے اہم مقام کے دفاعی انتظامات میں خلل ڈالا اور ادھر بادشاہ کے غرور و خود داری میں ترقی ہو گئی۔ اس نے بعض بڑے بڑے عہدوں پر اونے درجے کے لوگوں کو مقرر کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے دربار میں نئی نئی سازشیں، فرقہ بندیوں اور نا اتفاقیوں پیدا ہونے لگیں حتیٰ کہ ۹۶۱ھ میں سلیم شاہ کا انتقال ہوتے ہی افغانی قوت کا جسے شیر شاہ نے اس محنت و قابلیت سے متحد کیا تھا،

امرا کی شورش
و نا اتفاقی

علاء الدین ۳۸۵ھ مولف کتاب لکھتے ہیں کہ یہ رسم بچپن میں بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا، سلیم شاہ کے آخری زمانے تک جاری رہی۔ اسی سال سلطان محمود شاہ گجرات اور نظام الملک شاہ احمد نگر دکن کا انتقال ہوا تھا چنانچہ میر نعمت اللہ (رشتوئی) کا ایک قطعہ تاریخ مشہور ہے جس کا آخری شعر یہ ہے کہ :-

زمین تاریخ فوت ایں سہ خسرو چہ پی پرسی "ذوال خسرواں" بودا

یہ لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ ابوالفضل نے جا بجا سخت مذمتوں کے بعد آخر میں شیر شاہ اور سلیم شاہ کی سب سے بڑی داویہ دی ہے کہ "اتحتی ایں پدر و پسر در انتظام اسباب روزگار سلیقہ موافق داشتند۔ حیف کہ در حرام نکی و کافر نعتی زندگانی خود را پدر و دکر و دند۔ اگر ایں دو کس از طائران عقبہ علیہ... (یعنی ہمایوں) بودہ خدمت بازگاہ مطعی بہ پدر مغرض می شد و اہتمام سر ہما

شیرازہ بکھر گیا اور جا بجا سلطنت و خود مختاری کے مدعی خروج کرنے لگے۔ ان کی یہ باہمی کشاکش جاری ہی تھی کہ ہمایوں جو ایسے موقع کی تاک میں تھا، کابل سے بڑھا اور معمولی جنگ کے بعد قلعہ رہتاس پر قابض ہو گیا (۹۶۲ھ)۔ سرحد پنجاب کی سب سے بڑی چھاؤنی ہاتھ آگئی تو لاہور لینے میں کوئی مزاحمت نہ پیش آئی اور یہاں چند روز ٹھہر کر اس نے شجاع تک ملک پنجاب پر دوبارہ مغلوں کا تسلط قائم کر لیا۔



(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱) یہ پسرانِ مزدی بو.....!!

عل فرشتہ کا بیان ہے کہ اسلم شاہ کے بعد جب افغانوں میں نزاع و خانہ جنگی چلی ہوئی تو دہلی اور آگرے کے بعض لوگوں نے ہمایوں کو عرض کیا کہ ہندوستان پر فوج کشی کا اس سے بہتر وقت نہ ملے گا پھر بھی وہ آخر تک حملہ کرنے میں متردد رہا کیونکہ ہندی افغانوں کی کثیر فوجوں کے مقابلے میں وہ کابل میں چند روزہ ہزار سوار سے زیادہ ہیما نہ کر سکتا تھا۔

باب

سلطنت مغلیہ کا استقلال

پہلی فصل - فتوحات ممالک

پنجاب کے لینے میں مغلوں کو اس لئے آسانی ہوئی کہ وہاں کا افغانی صوبہ دار احمد خاں جو شیر شاہی خاندان سے تھا، اسلیم شاہ کے بعد خانہ جنگی میں حصہ لینے آگئے کی طرف چلا آیا اور اپنی تمام فوجی قوت کے ساتھ سلطنت کے دوسرے حریفوں سے مصروف جنگ تھا۔ واضح رہے کہ تخت کا اصلی وارث اسلیم شاہ کا بیٹا فیروز تھا لیکن اس کے ماموں مبارز خاں نے اسے قتل کر کے سلطنت غصب کر لی اور بغواۓ برعکس ہند نام زنگی، کافر، سلطان محمد عاقل کے لقب سے اب دوسرے حریفوں کے ساتھ بہار و دو آب کے علاقوں میں کشمکش کر رہا تھا۔ مگر وہاں اسے پوری طرح کامیابی نہ ہوئی تھی کہ پائے تخت آگئے پر ایک نئے حریف نے قبضہ کر لیا جسے احمد خاں نے پنجاب سے آکر شکست دی اور خود سکندر شاہ کے لقب سے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ ۹۶۲ھ

افغانی فوجوں نے صرف دہلی پور کی چھاؤنی کے قریب مغلوں کی کچھ مزاحمت کی تھی لیکن جب احمد خاں یعنی خاندان سئور کے نئے بادشاہ (سکندر شاہ) کو مغلوں کے پنجاب پر

(۱) پنجاب

تسلط کی اطلاع ملی تو بلا تاخیر خود نہ آسکا اور صرف تیس ہزار سوار کے ساتھ دوسرے افغان سرداروں کو اس نے روانہ کیا کہ مغلوں کو پنجاب سے نکال دیں یا کم سے کم آگے بڑھنے سے روک لیں۔ اس فوج کو ہالیوں کے مشہور سردار بہرام یا سیرام خان نے جالندھر کے علاقے میں پراگندہ کروایا اور مغلوں کو اتنی فرصت مل گئی کہ انھوں نے دریائے ستلج کے شمال و جنوب میں دہلی سے پنجاب آنے کے راستے پر جا بجا قلعہ بندی کر لی اور آخر جب سکندر پوری فوج لے کر ادھر بڑھا تو اسے اتنے دن تک روکے رکھا کہ ہالیوں لاہور سے اپنی تمام سپاہ لے کر آگیا اور سرہند کے قریب ایک بڑی لڑائی میں سکندر کو شکست دینی پڑی۔

سکندر دہلی کی جانب پٹنہ کے بجائے ہالیہ کے پہاڑوں کی طرف نکل گیا اور انھی پہاڑی راستوں سے مانکوٹ پہنچ کر عرصے تک شمالی پنجاب میں مغل حکام کو دق کرتا رہا حتیٰ کہ جلوس اکبری کے دوسرے سال خود بادشاہ نے اس پر فوج کشی کی اور غورہ بالا قلعہ میں

ان لڑائیوں کے حالات ہم عصر تاریخوں میں تفصیل سے درج ہیں۔ لیکن بعض ایسے ضروری جزئیات چھوٹ گئے ہیں یا ان میں اختلاف رہ گیا ہے کہ فریقین کے جارحانہ اور مدافعانہ ارادوں کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔ اور سرہند پر سکندر کی شکست کی ظاہری وجہ بھی کافی وضاحت سے نہیں بتائی گئیں کیونکہ یہ مسئلہ ہے کہ ان کی انٹی ہزار فوج مغلوں کی کابل اور پنجاب سے تازہ فراہم کی ہوئی فوج سے تعداد میں زیادہ تھی اور قریب قریب وہ تمام توپ و تفنگ اور جی سار و سامان اس کے قبضے میں تھا جسے شیر شاہ اور سلیم شاہ نے اسی دن کے لیے پنجاب میں فراہم کیا تھا اور جس کی بدولت خود اس نے پہلے اپنے خاندانی حریفوں کو مغلوب کیا اور پھر جنگ سرہند کے بعد بھی مانکوٹ میں قلعہ بند ہو کر صدمہ تک مغلوں کا مقابلہ کرتا رہا۔

مانکوٹ کے قریب کشمیر و پنجاب کے فاصل کو ہستان کے دامن میں مضبوط قلعہ سلیم شاہ نے تعمیر کیا تھا اور اس میں اسی سلسلہ استحکامات میں شامل تھا جسے رگمہروں کی تاویب اور سرحد کی حفاظت کے لئے شیر شاہ نے رہنما بنوئے سے کاگرتے کی مدد و کمک تیار کیا تھا۔ اور چار چھوٹے چھوٹے پہاڑی قلعوں کو کمال سلیقہ کے ساتھ ایک حصار میں شامل کر کے اس قلعہ کو اس قدر محفوظ کر دیا گیا تھا کہ بعض اوقات سلیم شاہ مانکوٹ کو لاہور کے بجائے پنجاب کا صدر مقام بنانے کا خیال ظاہر کرتا تھا اور اکبر نامہ جلد اول صفحہ ۳۶۶ جلد دوم صفحہ ۵۰ و ۵۱ وغیرہ

باب

(۲) دہلی و آگرہ

اسے گھیر لیا۔ پھر چھ مہینے کے محاصرے کے بعد اس شرط پر کہ اسے صحیح سلامت بنگال جانے دیا جائے، سکندر نے پنجاب میں افغانوں کا یہ آخری جنگی مرکز مغلوں کے حوالے کر دیا۔
لیکن یہ کچھ عرصے بعد کے واقعات ہیں۔ ورنہ شروع میں جنگ تھرہند اور سکندر کی پہاڑوں میں پسپائی سے نقطہ فائدہ ہوا کہ دہلی، آگرہ اور نواح کے اضلاع پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور گواس کامیابی سے ہندوستان میں خاندان تیموری کے دن پھرنے کی فال نکلتی تھی لیکن خود پہاڑوں بادشاہ کے گزشتہ مصائب کی پوری تلافی ابھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے بالافلانے سے اتفاق یہ کر لیا کہ وفات پائی (ربیع الاول ۹۶۳ھ) اور اس کا بڑا بیٹا جلال الدین اکبر وارث تخت و تاج ہوا۔

✓
اکبر کی تخت نشینی

یہ پندرہواں جو پہاڑوں کی سخت پریشاں حالی کے زمانے میں اہر کوٹ (سندھ) میں پیدا ہوا تھا (رجب ۹۴۹ھ مطابق نومبر ۱۵۴۲ء) ہندوستان کے ان محروکوں میں باپ کے ساتھ، اور اس کی وفات کے وقت سکندر سے لڑنے شمالی پنجاب کی طرف بھیجا گیا تھا۔ وہیں اسے کلانور ضلع گرداسپور کے مقام پر منسل سرداروں نے پہاڑوں کا جانشین تسلیم کیا اور سہ سالار سیرام خاں نے اتالیق و کلیل سلطنت کی حیثیت سے انتظامات کی باگ اپنے ہاتھ میں لی (ربیع الثانی ۹۶۳ھ مطابق فروری ۱۵۵۶ء) کیونکہ خود اکبر کی عمر قمری حساب سے ابھی پورے چودہ برس کی بھی نہ تھی بلکہ

✓
جنگ پانی پت

اس اثنا میں سکندر کو پنجاب کے میدانی اضلاع سے مغلوں نے دفع کر دیا تھا اور کچھ عرصے بعد کثرت بارش کی وجہ سے بھی بادشاہی فوجیں جنوب میں جالندھر چلی آئی تھیں۔ وہیں اطلاع ملی کہ وراثت شیر شاہی کے اصلی مدعی عادل شاہ نے خانہ جنگی سے فرصت پائی اور اس کا وزیر، سیمو، باجاء افغان باغیوں کو شکست دینے کے بعد اپنی پوری قوت سے مغلوں کے مقابلے کے لئے بڑھا اور مختلف اضلاع کے

علی جموں کی شکل و شمائل کی تنحیک میں ابو الفضل نے اپنی فلسفیانہ انشا پر دازی کا پورا زور صرف کر دیا ہے (اکبر نامہ صفحہ ۳۳۴) اور یہ صحیح ہے کہ وہ ریواڑی (نواح دہلی) کا ایک بد صورت اور ذات کا دھوسہ رنگ تھا اسلیم شاہ نے قدیم افغانی سرداروں کا زور توڑ کر جب نئے لوگوں کو بڑے بڑے عہدے دیے جیسا کہ ہم پہلی فصل میں بیان کر چکے ہیں، تو انہی میں شکر شاہی کا یہ بقال بھی پہلے

مغل سرداروں کو ہٹاتا ہوا دہلی پہنچ گیا جہاں ماکھ شہر ترو دی بیگ کی تختی میں گرد و فوج کی اکثر مغل فوجوں نے جمع ہو کر اس سے شکست کھائی اور ہندوستان خاص "کایہ ٹکڑا جس میں آگرہ اور دہلی جیسے مشہور شہر واقع ہیں ایک مرتبہ پھر مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔
شکست خوردہ مغل سردار دریا سے تلک ہٹ آئے اور اس ناکامی اور نیریشہ کی کثرت فوج کی خبروں نے خود اکبری لشکر میں انتشار پیدا کر دیا۔ یہ خبریں کچھ غلط نہ تھیں لیکن اول تو ہیو میں ذاتی بہادری کے سوا سپہ سالاری کی اتنی قابلیت نہ تھی کہ بسرام خاں، خان زماں خاں، اسکندر خاں (اوزبک) جیسے جہاندیدہ فن حرب کے ماہروں کا مقابلہ کر سکتا دوسرے معلوم ہوتا ہے گزشتہ کامیابی کے غرور نے بھی اس کا دماغ بگاڑ دیا اور اس نے "راجہ کبرماجیت" کا لقب اختیار کر کے بعض ایسی حرکتیں کیں کہ ہمراہی افغان اس کی طرف سے بدگمان ہو گئے کہ اگر مغلوں کے مقابلے میں ہیو کو فتح ہوئی تو کیا عجب ہے کہ وہ عادل شاہ کی برائے نام اطاعت سے بھی بخوف ہو جائے کیونکہ اسی ہم کے روانہ ہوتے وقت یہ بادشاہ مشرقی علاقوں کی نگہداشت کے لئے چنار کے قلعے میں ٹھہر گیا تھا اور مغربی علاقوں کے تمام ملکی اور فوجی انتظامات اس نے اپنے ڈھوسہ وزیر کے حوالے کر دیے تھے۔
پس ہم عصر مورخ کا یہ فقرہ محض لطیفہ نہیں بلکہ صحیح حالات کا پتہ دیتا ہے کہ "افغانان بسکہ از تحکمت او (یعنی ہیو) بجا آمدہ بودند زوال اور از خدای خواستند و بزبان حال و مقال نعرہ الانقلا ب و لو علینا (!) می خواندند"۔

نیو جنگ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴) بازار کا تختہ (یا منتظم) اور پھر بادشاہ کا مصاحب خاص بن گیا۔ نعل شناسی، عام انتظامی قابلیت اور نیز دلیری کے علاوہ اس کے رُموخ و ترقی مدارج کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہوئی کہ بے حد مالدار تھا اور خاندان شیر شاہی کی خاندان جنگی کے زمانے میں عادل شاہ کے تمام ملکی اور مالی انتظامات اس کے قبضہ میں آ گئے تھے۔ (اکبر نامہ - نیز ملاحظہ ہو منتخب التواریخ صفحہ ۳۸۹)

علا اس کی مختلف تاریخوں میں بجا بجا مثالیں ملتی ہیں (منتخب التواریخ صفحہ ۴۳۰، جلد دوم صفحہ ۳ وغیرہ) نیز دیکھو اکبر نامہ جلد دوم صفحات ۳۰ و ۳۱ - طبقات اکبری وغیرہ (علا منتخب التواریخ - جلد دوم صفحہ ۱۵)

ہیمو نے پہلی ہی نادانی تو یہ کی کہ اپنا توپ خانہ آہنی کم جمعیت کے ساتھ پانی پت بھیج دیا کہ مغلوں کے ہراول نے تیزی سے ایک منزل آگے بڑھ کر اس پر قبضہ کر لیا اور افغانی فوج اس کی کارگزارانہ سے محروم ہو گئی۔ ادھر جب ہیمو (غالباً یہ خبر سن کر) جلد سے جلد پانی پت کے میدان میں پہنچا تو ازبک تیرانداز بازوؤں پر اس طرح آگرے جس طرح ایک بیلک چاروں طرف سے بھڑپ کر لپٹ جاتی ہیں۔ تیراندازی میں انھیں کمال حاصل تھا اور مل کر اتنی جلد اور صحیح تیر چلاتے تھے کہ دشمن کی پورے صفوں کا قدم بڑھانا دشوار ہو جاتا تھا۔ پانی پت کی اس (دوسری) جنگ میں بھی انھی ازبکوں کی حیرت انگیز اور قیامت خیز تیراندازی کی بدولت نہ صرف دشمن کا خوفناک حملہ رک گیا بلکہ ہیمو کے جنگی ہاتھی زخمی ہو کر قابو سے باہر ہو گئے اور انھوں نے خود اپنی فوج کی صفوں میں ہل چل ڈال دی۔ سپاہی پہلے ہی سے مذہب تھے ہیمو کے زخم کھا کر بیہوش ہوتے ہی بھاگ نکلے اور اس ”بکر ماجیت ثانی“ کا سارا ترک و احتشام چند گھنٹے کے اندر خاک میں مل گیا۔ (محرم ۹۶۲ھ)

اس لڑائی کا فوری نتیجہ تو یہ تھا کہ مغلوں کا پھر دہلی اور آگرے پر قبضہ ہو گیا۔ لیکن چند سال کے تجربے نے بتا دیا کہ درحقیقت ہیمو کی یہی ہزیمت شمالی ہند میں ہندی افغانوں کے خاتمہ اقتدار کی مراد تھی جس کے بعد پھر ان علاقوں میں وہ کبھی مغلوں کے مقابل کوئی بڑی فوج فراہم و متحد نہ کر سکے تین ہی سال کے اندر اندازان کی قوت پھر ممالک مشرقی میں سمٹ آئی اور او دھ و جونپور تک دونوں دو آبوں پر مغلوں کا تسلط ہو گیا۔

۱۔ ہیمو گرفتار ہو کر اور افغان سپہ سالار شادی خاں میدان جنگ میں مارا گیا۔ ہیمو کی بیوی تمام مال و خزانہ ہاتھیوں پر لاد کر بھاگی تھی لیکن راستے میں جا بجا گنواروں نے لوٹا اور کچھ حصہ تعاقب کرنے والے مغلوں کے ہاتھ پڑا باقی زیادہ تر او دھ و جھنگلوں میں برباد ہو گیا۔ (منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۱۱)

۲۔ اسی جنگ پانی پت کے کچھ عرصے بعد ہیمو کا آقا محمد عادل بھی جو خانہ جنگی کے خوف سے خود چناریں مقیم تھا بنگلے کے افغانوں کے ساتھ جنگ کرتے میں مارا گیا۔ اس کے حالات میں ہم عصر مورخوں نے سوائے اس کے اور کوئی قابل تحسین و یادگار بات نہیں لکھی کہ وہ فن موسیقی میں یگانہ و یگانہ مانا جاتا تھا اور تانپیسین اور بہادر جیسے بے نظیر استاد اس کی شاگردی کے معترف تھے۔ (منتخب التواریخ ۳۳)

اندرونی
فسادات

جلد اول پندیر شہراب دیو اس (مالومہ) کی ریاست میں داخل ہے اور اس کے کھنڈر اور نیز بعض قدیم صنعتوں کے بچے کچھ کارخانے سازنگ پور کے گزشتہ تمدن کی یادگار ہیں، جو گزشتہ ۲۲ صغہ ۹۹) م۔ عام فارسی تاریخوں کے علاوہ خاص باز بہادر کے حالات کے لیے دیکھو آثار لامرد (جلد اول صفحات ۳۸ تا ۳۹)۔

اب اکبر اپنے اتالیق کے ذاتی اقتدار سے بھی غالباً رشک کرنے لگا تھا اور اسی لیے جب اس کی اتالیقا ہتھ آگئے اور اتالیق کے بعض رشتہ داروں نے بیرام خاں کی شکایتیں کیں تو نوجوان اکبر علانیہ بیرام خاں سے ناراض ہو گیا اور پھر اس نے ہر چند اشکالت و معذرت کی مگر بادشاہ رضامند نہ ہوا۔ آخر بیرام خاں کو نظر آگیا کہ اب دربار اکبری میں اس کا وہ رسوخ و اقتدار کسی طرح قائم نہیں رہ سکتا جو سالہا سال کی رفاقت و جانبازی کا ثمرہ تھا۔ اس کی وفاداری بادشاہ سے علانیہ بغاوت کی بھی اجازت نہ دیتی تھی لہذا اول اول اس نے مالوے یا بنگالے پر بطور خود فوج کشی کرنے کا منصوبہ سوچا کہ ان میں سے کسی کو فتح کر کے آزادانہ حکومت کی بنیاد ڈالے۔ لیکن جب اس کا محبوب ہوناسن کر بہت سے ماتحت سردار برگشتہ ہو گئے اور ان ارادوں میں کاسیابی کی امید نہ رہی تو اس کی سپاہیانہ غیرت نے زوال قوت و ذلت پر ہجرت کو ترجیح دی اور وہ تھاج کے ارادے سے گجرات کی جانب روانہ ہو چکا تھا کہ پھر بادشاہ کی بدگمانی اور بعض سپاہی مطالبات نے اسے اندیشہ مند کر دیا اور جب اکبر کی طرف سے بیرام خاں کا قدیم دشمن ملا پیر محمد تعاقب میں بھیجا گیا تو اسے گجرات کا سفر بھی مخدوش نظر آیا اور وہ راجپوتانے سے جنوبی پنجاب کے علاقے میں چلا آیا جہاں جاہ جاس کے آوردہ حکمران تھے۔ برے وقت میں ان لوگوں نے احسان فراموشی کی اور اودھ جالندھر کے قریب بادشاہی فوجوں نے نگہ کر اس کی رہی سہی جمعیت پر آگندہ کر دی۔ ان مصائب نے آخر کار خود دار بیرام خاں کا سر خم کر دیا اور گواکبر نے اس کی درخواست پر اسے معافی دے دی تھی لیکن وہ ہندوستان میں پٹھان اور بادشاہ کی اجازت سے پھر نہ ارادہ حج گجرات روانہ ہو گیا۔

بیرام خاں سے وزارت و وکالت کے ماہی مراتب واپس لینے کے بعد یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ وہ اپنے بعض معتمد رفیقوں کو بادشاہ کے حوالے کر دے (ملاحظہ ہو فرمان اکبری) منقول در اکبر نامہ جلد دوم صفحہ ۱۰۶

۱۵۳۶ء واقعات کو سب سے بہتر و مستند طریق پر ملا عبدالقادر نے تحریر کیا ہے۔ (جلد دوم صفحات ۱۴۳ تا ۱۴۶) اور تمام ہدایات اور جزئیات کو بغور پڑھنے کے بعد راقم المحروف کے نزدیک ابوالفضل وغیرہ مؤرخین کا جاہ جابیرام خاں کو ابتدا سے تک حرامی اور فتنہ پرداز کا مجرم بنانا ثابت نہیں

یاد
میرام خاں
شاہ کی

میرام خاں شہر پٹن (گجرات) تک پہنچا تھا کہ بعض افغانوں نے ذاتی کاوش کی بنا پر اسے دھوکے سے قتل کر دیا (۹۶۸ھ) لیکن نوجوان بادشاہ کے وہ مشیر بھی جو میرام کی سفروں اور مصائب کا باعث ہوئے اور جنہوں نے چند روز اس انقلاب سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا، زیادہ عرصے تک سرسبز نہ رہ سکے اور آئندہ دو سال میں شمس الدین اکبر، ادھم خاں اور ماہم انگہ تینوں کا باہمی عداوت اور قتل و غلات نے خاتمہ کر دیا (۹۶۸ھ) اور اکبر نے جس کی عمر اب بیس سال سے تجاوز کر چکی تھی صبح معنی میں زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ بایں ہمہ معلوم ہوتا ہے کہ میرام خاں اور ادھم خاں کیساتھ جو کچھ معاملہ گزرا تھا وہ بھی عہد ہالیوں کے بعض سرداروں کو نوجوان اکبر سے مرعوب کرنے کے لیے کافی نہ تھا اور وہ درحقیقت اس کے شہنشاہانہ مزاج کو اچھی طرح سمجھ نہ سکے تھے جس کی وجہ محض اکبر کی نوعمری اور ناخواندگی نہ تھی بلکہ یہ کہ وہ طبعاً فیاض اور حلیم تھا۔ دوسرے ہالیوں کی گزشتہ ناکامی اور شکستہ حالی کے قصے ابھی تک تازہ تھے اور وہ سردار جو دوبارہ اس کے ساتھ ہندوستان آئے اس بات کو نہ بھولے تھے کہ انہی کی محنت و جان نثاری کے طفیل ہندوستان کی چھٹی چوٹی سلطنت خاندان تیموریہ کے ہاتھ آئی ہے۔ غرض یہ اور دیگر اسباب ایسے جمع ہو گئے کہ اکبر کو ابتدا میں قدیم سرداروں پر اپنا رعب قائم کرنے میں بہت دشواریاں پیش آئیں حالانکہ اپنی فطری رواداری اور نرمی کے باوجود وہ شاہانہ امتیاز اور مطلق الغالی کا دلدادہ تھا جس کے اسباب و علل پر ہم آئندہ گفتگو کریں گے۔ یہاں صرف اس تصادم کی اصلی وجہ بیان کرنی مقصود ہیں جو نئے بادشاہ اور اس کے امراء میں ہونا گزیر تھا اور جس کا آخری اور سب سے خطرناک ظہور ازبکوں کے فساد میں ہوا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸) نہیں ہوتا۔ بے شبہ اول اول عہدہ آئینی کو جو ہاتھوں کی طرف سے اسے ملا تھا وہ محض اکبر کے حکم سے چھوڑنے میں تامل کر رہا تھا اور غالباً یہ چاہتا تھا کہ کہ سے کم ہندوستان سے نصرت ہونے تک اسے معزول نہ سمجھا جائے لیکن جب اکبر نے یہ رعایت جائز نہ رکھی تو اس وقت غصے میں آئے چنباہ اگر اس قسم کی گروہ بندی کرنی چاہی کہ ممکن ہو تو بادشاہ کو بزور اپنی "وکالت" تسلیم کرادی جائے اور ہمارے خیال میں اپنے تربیت داد و ستز سال کے لڑکے کے مقابلے میں اس کی یہ کوشش بھی جہنمات کے نفل سے پیشتر موصوم کی جاسکتی ہے۔

یہ منچلے سپاہی اگرچہ نسلاً مغلوں کے ہم نسل تھے لیکن اپنے مشہور سردار شیبانی خاں کے زمانے سے بالکل ملحدہ قوم سمجھے جانے لگے تھے اور تیموری خاندان کے بادشاہوں کو انھیں کے پیہم مخلوں نے اور ادا اللہ سے مار کر نکال دیا تھا۔ لیکن اس قومی دشمنی کے باوجود کچھ عرصے بعد ان کے بعض گروہ تیموریوں کی افواج میں بھرتی ہونے لگے تھے۔ دراصل اس زمانے میں جنگ و جدال سپاہی پیشہ لوگوں کا معمولی مشغلہ تھا اور مختلف بادشاہوں یا قوموں کی لڑائیاں قریب قریب اسی دلچسپی سے دیکھی جاتی تھیں جیسے آج کل ہاکی یا فٹ بال کے بعض مقابلے۔ لہذا ان جنگی معرکوں میں اگرچہ فریقین وقت کے وقت ایک دوسرے کے قتل کرنے میں کمی نہ کرتے تھے، لیکن لڑائی کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد ان کی دشمنی ابھی غائب ہو جاتی تھی اور بارہا ایک فوج کے بعض گروہ پہلے سردار کی رفاقت چھوڑ کر اس کے حریف کی ملازمت اختیار کر لیتے تھے۔

العقیدہ مغلوں کے ہندوستان میں آنے کے وقت بہت سے ازبک سپاہی بھی شمشیر آزمائی کے شوق میں بابر و ہمایوں کے ہمراہ ہو گئے۔ اور حق یہ ہے کہ اس دوسری آمد کے موقع پر مغلوں کی کامیابی زیادہ تر اسی قوم کی سعی و جانفشانی کا نتیجہ تھی اور نہ صرف جنگ پانی پت کے وقت بلکہ دو آب و جونیوریں ابھی ازبک سرداروں نے سوری افغانوں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا چنانچہ زیر نظر سن میں مشرقی صوبوں میں اکثر سرحدی چھاؤنیوں پر اسی قوم کے سپہ سالار متعین اور بہادر کے افغان رئیسوں سے مصروف جنگ و جدال تھے اور جیسا کہ ہم اوپر پڑھ چکے ہیں مالوے کو بھی دوبارہ عبداللہ خاں ازبک ہی کی تلوار نے باز بہادر سے خالی کرایا تھا۔

ازبکوں سے اکبر کی ناراضی کا آغاز اسی عبداللہ خاں کی بعض "ناسزا دواؤں" کی وجہ سے ہوا۔ اس کا قصور تو یہ تھا کہ مال غنیمت میں جو ہاتھی ملے تھے وہ سب کے سب حضور میں روانہ نہیں کئے، لیکن اکبر نے باز پرس کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ بھی کچھ بوزوں نہیں نظر آتا کہ (موجودہ جھانسی کے قریب انرو کے جنگلوں میں ہاتھی کا شکار کھیلتے کھیلتے وہ ایک بہ یک مالوے میں داخل ہو گیا اور عبداللہ خاں کو غالباً اس کی طفلانہ حرکت دیکھ کر ایسی وحشت ہوئی کہ وہ بادشاہ کی ملازمت ہی کو خیر باد کہہ کے گجرات چل دیا۔ یہ خبر سن کر اکبر نے پہلے چند سرداروں کو بھیجا تھا کہ اُسے

باب

سمجھا بھجا کر واپس لے آئیں مگر جب نہ مانا تو فوج لے کر اس کا تعاقب کیا اور اس نے
اقتان و خیزاں حدود گجرات میں پہنچ کر اپنی جان بچائی ہو
اس واقعے نے ادھر تو ازبک سرداروں کو جن کی شجاعت و تند خوئی مشہور تھی
ناراض کیا اور ادھر ملک میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ بادشاہ نے منلوں کے قدیم دشمن
ازبکوں کے استیصال کا ارادہ کر لیا ہے۔ مغل حکام پہلے ہی ان سے رشک و حسد اور
بادشاہ کی رفاقت میں جن افغانوں کی انھوں نے جابہ با مغلوب و شکوب کیا تھا وہ
ان کی طرف سے کینہ رکھتے تھے۔ غرض ان تمام اسباب نے ل کر بادشاہ کو ان سے اور
انھیں بادشاہ سے بدگمان کر دیا اور وہ آخر میں طانیہ منحرف ہو گئے (۱۹۶۶ء)

جونپور کا نامور صوبہ دار علی قلی خاں سیستانی (الحالب بہ خان زبانی خاں)
باغی ازبکوں کا سرگروہ تھا اور لڑائی شروع ہونے کے بعد بھی اس نے کئی بار صلح و مباحثات
کی کوشش کی اور بادشاہ نے کئی بار باغیوں کا قصور معاف کر دیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ
بادشاہ خود اپنے رفیق امر کی بد عنوانیوں کا کافی تدارک نہ کر سکا اور کچھ ان کی زیادتی اور
کچھ ازبکوں کے غرور شجاعت کے باعث یہ لڑائیاں تھوڑے تھوڑے وقفے سے تن سال
ملک ہوتی رہیں حتیٰ کہ لڑے کے قریب ایک جنگ میں باغیوں کے لشکر کثیر کو شکست
نصیب ہوئی اور ملی قلی خاں مارا گیا۔ دو ایک سرداروں کے سوا جنھوں نے بھاگ کر
جان بچائی باقی جو گرفتار ہو گئے تھے انھیں بادشاہ نے جونپور پہنچ کر قتل کر دیا (۱۹۶۶ء)
اس لڑائی میں اگرچہ بادشاہ کی بہت کم فوج جنگ میں حصہ لے سکی تھی لیکن
یہ پڑھ کر کہ اس میں دو ہزار صرف جنگی ہاتھی تھے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اب اکبر کی جنگی
قوت کس قدر ترقی کر گئی تھی۔ ازبکوں کی کال شکست کے دو آب و جونپور کی طرف سے
بھی بادشاہ کو مطمئن کر دیا اور اب وہاں کا صوبہ دار خان خانان منعم خاں بنگالے کے

۱
(۲) راجپوتانہ

۱۰ مثال کے لئے دیکھو مہر الملک احمد ٹوڈرل کے زبردستی ازبکوں کے ساتھ جنگ کرنے کا واقعہ (منتخب)
جلد دوم صفحہ ۲۷۲ اکبر نامہ جلد دوم صفحہ ۲۶۰ وغیرہ وغیرہ اسی طرح آصف خاں کو جس نے ان لڑائیوں
میں باغستانی اور ملک حلای کا حق ادا کیا تھا امرائے اکبری کی نکتہ چینی نے اس قدر پریشان کیا کہ وہ بادشاہ
کا ساتھ چھوڑ کر خان زبانی خاں سے جا ملا اور کچھ مدت تک طانیہ باغی رہا جو

افغان بادشاہ کو "شہنشاہ ہند" کی اطاعت قبول کرنے کی دعوت دے رہا تھا پنجاب کے
اقطاع میں بھی میرزا عبدالعظیم کی لاہور سے سپاہی کے بعد محمد نظم دوست کی بدولت کسی
فساد و خلل کا اندیشہ نہ رہا تھا لہذا اکبر نے اپنی کشور کشایا نہ توجہ را چوتما نے پرمبذول کی
جس کی بعض ریاستوں نے اس کی اطاعت قبول نہیں کی تھی لیکن دو ایک قلعے
فتح کرنے کے بعد وہ رنختنبور پر پیش قدمی کا ارادہ کر رہا تھا کہ مالوے میں بعض باغی
امیروں نے مانڈو پر قبضہ کر لیا اور اکبر کو جدید فتوحات چھوڑ کر مالوے میں آنا پڑا۔ باغی
امیروں نے گجرات بھاگ کر جان بچائی اور اس صوبے کی از سر نو تنظیم و تسبیح کر کے
اکبر نے میواڑ پر حملہ کیا جس کا پائے تخت چٹوڑ مالوے کے قریب اور نیز را چوتما نے میں
سب سے مستحکم و ممتاز قلعہ تھا۔

طرحہ

میتواڑ

اکبر کے ساتھ اس موقع پر کوئی بڑی فوج نہ تھی لیکن را چوتوں نے کھلے میدان
میں مقابلہ نہیں کیا بلکہ گرد و نواح کا تمام علاقہ ویران و پامال کر کے چٹوڑ میں کئی سال
کا آذوقہ فراہم کر لیا۔ اور تا مقدور مدافعت کے تمام جنگی ساز و سامان ہتیا کرنے کے
بعد خود راتا اووے پور کی پہاڑیوں میں ہٹ گیا، مگر مغلوں نے محض محاصرے پر اکتفا نہ کی
بلکہ صد ہا تجارت و سنگتراش کی مدد سے بلند و مضبوط دیواریں (سا باط) بنا کے انھیں بہت جلد
قلعے کی دیواروں تک بڑھالیا اور پھر ان کی پناہ لے کر دو برجوں کے نیچے سرنگیں کھودیں
اور ان میں باروت بھر کے ایک برج اڑا دیا۔ را چوت سپاہی جو اپنے سردار کے اتفاقہ

عالم میرزا عبدالعظیم اکبر کا دوست ملا چھوٹا بھائی تھا اور اسے بالکل چھین میں ہالیوں نے ہندوستان
آئے وقت کابل کی حکومت پر نامزد کر دیا تھا۔ لیکن ۹۹۳ھ میں (جب کہ اس کی عمر چودہ پندرہ سال
کی تھی) بعض خانگی فسادات میں اس کا پائے تخت چھین گیا۔ اور اسے پنجاب کی طرف فرار ہونا پڑا۔ پھر اکبر کو
ازبکوں کی لڑائیوں میں مصروف دیکھ کر اس نے دغا بازی سے لاہور پر قبضہ کر لینا چاہا مگر اسی قلعے کا محاصرہ
جاری ہی تھا کہ اکبر کے ادھر آنے کی خبر ملی اور میرزا عبدالعظیم کابل کی طرف ہٹ گیا جہاں اتفاقاً پھر میدان
حریفوں سے خالی ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مقامی آزادی کے باوجود اکبر کی اطاعت کا دم بھڑتا رہا۔ ۹۹۳ھ
میں جب اس نے وفات پائی تو صوبہ کابل کا باقاعدہ سلطنت ہندوستان سے الحاق کر لیا گیا اور پھر
محمد شاہی زمانے تک اس ملک پر مغل بادشاہوں کے صوبہ دار حکومت کرتے رہے۔

مارے جانے سے پہلے ہی شکستہ دل ہو چکے تھے اب حملہ آوروں کو قلعے میں گھسنے سے نہ روک سکے اور یہ مستحکم قلعہ چند مہینے کے محاصرے اور جدوجہد کے بعد فتح ہو گیا اور رمضان

(۹۴۵ھ)
۱۵۶۶ء

ریاست میواڑ کو ایک سرکار قرار دے کر یہاں منسل مال مقرر کر دیئے گئے تھے لیکن سخت بے سروسامانی کے باوجود میواڑ کے رانا اور اس کے ولیعہدوں کو عکومی کا حاکم قبول کرنا گوارا نہ تھا اور وہ آئندہ تقریباً نصف صدی تک منسل صوبیداروں سے اس قسم کی جنگ کرتے رہے جسے فن حرب کی اصطلاح میں ”جنگ قزاقانہ“ کہتے ہیں ان لڑائیوں میں فریقین کے بعض سرداروں کے کارنامے شجاعت و جانبازی کی ولولہ انگیز داستانیں ہیں لیکن اس جگہ انھیں بیان کرنے کا محل نہیں اور نہ ان لڑائیوں کا ہندوستان کے عام سیاسی حالات پر کوئی اثر پڑا کیونکہ درحقیقت یہ ایک چھوٹے گروہ کی اپنے سے کہیں بڑی قوت کے مقابلے میں آزادی کا قیام رکھنے کے لیے ایسا نہ جدوجہد تھی جس کا نتیجہ ناکامی ہوا اور آخر کار جہانگیر کے عہد میں رانا اہرننگھ نے سلاطین مغلیہ کی اطاعت و باج گزاری قبول کر لی اور ان بادشاہوں نے بھی اس کے ساتھ بڑی عزت کا سلوک فرمایا رکھا اور (۱۰۲۳ھ) ۱۶۱۲ء

رختنبور

خود اکبر کو فتح چٹوڑ کے بعد راجپوتانے کے باقی حصے مطیع کرنے میں زیادہ زحمت پیش نہ آئی۔ سال آئندہ (۹۷۱ھ) رختنبور کا مضبوط قلعہ بادشاہی توپوں کی جوہڑی پر چڑھا دی گئی تھیں سیلاب نہ لاسکا اور اس کے راجہ نے چند گولوں کے محلات پر پڑتے ہی مجبوراً اطاعت قبول کر لی اور اسی دن سے کہنا چاہئے کہ اس جدید آلہ حرب کے سامنے قلعہ رختنبور کی پہلی شہرت اور وقعت بھی

۱۔ راجپوت مقتولین کی تعداد و فرتہ نے دس ہزار بتائی ہے (صفحہ ۲۵) لیکن انھیں کھانا کھاتے تھے یہاں تیس ہزار آدمی مارے گئے ”وہب“ بیکار کشتہ شدن آں بود کہ در زمان پیش کہ سلطان علاء الدین وارش ماہ و ہفت روز (چٹوڑ) گرفتہ بود (چوں رعایا یہ جنگ نمی پروختند از قتل امین ماندہ بودند۔ و دریں ولایت سیزہ و پرخاش بتقدیم رسانیدند۔ بعد از ظہور بتا شیر استیلا و غلبہ معذرت ایں گروہ فائدہ مند نیامد۔ حکم قتل عام شد و جمیع کثیر و بندهم افتادند اکبر نامہ جلد دوم صفحہ ۲۲۳)

قصہ پارینہ ہو گئی پوریاست امیر دیا جے پور) کا راجہ پہلے ہی مغلوں کا غاشیہ اطاعت
کندے پر رکھ چکا تھا۔ جو دھپور و بریکا نیر نے بھی اس کی پیروی کی اور سن ۱۵۸۹ء
تک راجپوتانے کی تمام ریاستیں مثل شہنشاہ کی باج گزار بن گئیں اور اب قدرتی طور پر
اسے ملک گجرات کے معاملے میں دخل دینے کا موقع ملا۔

(د) گجرات

یہاں کے بادشاہ سلطان بہادر شاہ کی ہمایوں سے شکستوں کا حال پہلے پہری
نظر سے گزر چکا ہے۔ گجرات کے مغل حکام کی نالائقی اور پھر ہمایوں کی شیر شاہ سے
آویزش کی بدولت اس نے اپنی سلطنت پر دوبارہ قبضہ پایا تھا لیکن تھوڑے ہی
دن میں اس کے پرگیزہ حلیفوں نے دھوکے سے اسے مار ڈالا (۱۵۹۲ء) اور کچھ
عرصے انتشار کے بعد سلطان مظفر شاہ ثانی کا پوتا محمود (مثالث) حکومت کا وارث ہوا۔
اس بادشاہ نے سترہ اٹھارہ برس تک کمال قابلیت سے بادشاہی کی اور مفید انتظامات
کی ضمن میں بندرگاہ سورت کا "شاہ قلعہ" بھی اسی کے عہد میں تعمیر ہوا اور مغربی

علا اسی زمانے میں سلطان بہادر کی اجازت سے پرگیزوں نے دیو دویب (میں تھارتی کوٹھی بنائی تھی
اور اسی پہاڑے وہاں جنگی استحکامات تعمیر کر رہے تھے۔ اور دراصل تجارت سے زیادہ بحری قزاقی
ان کا مقصد و مشغلہ تھا) سلطان بہادر شاہ کو فریب سے قتل کرنے کے متعلق فرنگی مورخوں نے طرح
طرح کی تاویلیں کی ہیں لیکن غنیمت ہے کہ اس واقعے سے وہ بھی انکار نہ کر سکے کہ سلطان بھون
دوستانہ حیثیت سے ملنے آیا تھا اور پرگیزوں کے ہاتھ سے مارا گیا (دیر روایت تمام معاصر فارسی
تاریخوں میں مذکور ہے)۔ مہمدیہ تحقیقات کے لیے ملاحظہ ہو (الغنی ص ۴۵)۔ اسفورڈ ہسٹری صفحہ ۱۲۰
پر پرگیزوں نے اس بددلتی تبدلتی بندرگاہ کو دو مرتبہ یکایک حملہ کر کے آگ لگا دی تھی اور انہی
کی قزاقانہ غارتگری کے انداز کے لیے یہ وسیع و مستحکم قلعہ بنایا اور جدید ترین آلات حرب و حرب سے
آراستہ کیا گیا تھا چنانچہ قطعہ تاریخ بنائیں بھی اس غرض کی صراحت کی گئی ہے۔

مسند اسکندر لود برودے یا جوج فرنگت - کندہ ازغیب و دروہرلب ایں بحر جائے
ایں محاذ زغیب از بہر تارشش بجوش - سد بود بر سینہ و جان فرنگی ایں بنائے۔
تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۲۲۰ - نیز ملاحظہ ہو گزشتہ جلد ص ۱۵۴

سوا مل ہند پر گیزوں کی بحری قزاقی سے ایک حد تک محفوظ ہو گئے ۴
لیکن اس بادشاہ کے لاولد فوت ہونے سے (۹۶۱ء) ملک میں پھر ابتری
پھیل گئی اور جاجا امرا اپنی جاگیروں میں خود مختار ہو گئے۔ اس خرابی کو دفع کرنے کے لیے
اعتماد خاں نامی ایک امیر نے پہلے خاندان شاہی کے ایک لڑکے رضی الملک
(احمد شاہ) کو اور جب وہ دشمن ہو گیا تو ایک اور جمہول النسب لڑکے کو 'منظفر شاہ' (ثالث)
کے لقب سے بادشاہ بنایا (۹۶۱ء) بائیس ہزار اندرونی فتنہ و فسادین کوئی کمی نہ ہوئی
اور گجراتی امرا اسی طرح باہمی فرقہ بندی اور لڑائیوں میں مصروف رہے اور اسی میں
دربار اکبری کے چند مفروہ سردار (میرزا محمد حسین، مسعود حسین وغیرہ) بھی گجرات آکر ان کے
شریک حال ہو گئے۔ آخر جب اعتماد خاں کو اندرونی امن و امان اور ذاتی اقتدار قائم کرنے
کی کوئی امید نہ رہی اور تازہ وارد 'میرزایاں' بھی بعض مقامات پر قبضہ کر کے قابو نہ لے سکے
تو اس نے اکبر کو گجرات آنے کی دعوت دی اور جب یہ بادشاہ ناگور سے ملن (گجرات)
پہنچا تو اپنے کئی رفیقوں کے ساتھ اطاعت قبول کر لی (۹۶۲ء) اس کا نام ہنہا بادشاہ
منظفر شاہ بھی امراء اکبری میں داخل کر لیا گیا تھا اور منعجم خاں کے بنگالے جاتے وقت
اس کے ہمراہ تھا۔ وہیں خان موصوف کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی لیکن پھر بادشاہ نے
بدگمان ہو کر اسے نظر بند کر لیا اور اس نظر بندی سے بھاگ کر وہ پہلے میں ہوا اور گجرات پہنچا
اور اس کی بادشاہی کے دعوے تازے ہو گئے۔ مگر ظاہر ہے کہ سلطنت مغلیہ کی فوجی قوت
کے سامنے اب اہل گجرات کی کچھ حقیقت نہ رہی تھی اور مظفر شاہ کا فتنہ و فساد بھی دو سال
کے بعد فرو ہو گیا۔ اور آخر کار جب اس نے گرفتار ہو کر (سلطنت) خودکشی کر لی تو پھر گجرات
میں سلطنت مغلیہ کا کوئی حریف یا مدعی باقی نہیں رہا ۵

(۱۶) بنگالہ

فتح گجرات کے بعد اگر اکبر کو تمام مالک ہند کی سیادت و شہنشاہی کا دعویٰ ہوا
تو یہ کچھ تعجب کی بات نہ تھی اور اسی بنا پر جو پور کے مغل صوبہ دار منعجم خاں نے بنگالے

۱۔ اس عہد کے گجراتیوں کی ابو الفضل نے ان الفاظ میں شبی اڑائی ہے کہ 'ہر اس و فریب و نادوستی'
با قدرے آراستگی و سادگی و فروتنی سجون ساختہ 'گجراتی' تمام کردہ اندوازاں میاں اعتماد خاں
را سر آمد آں کردہ گردانیدہ اند!' ۱

کے بادشاہ سے دو ایک مرتبہ اکبر کی سیادت تسلیم کرنے اور خطبہ و سکہ جاری کرنے کی سلسلہ جنبانی بھی کی تھی لیکن اس مصالحت کو شش کیں کامیابی نہیں ہوئی اور داؤد خاں بن سلیمان کے بنگالے میں تخت نشین ہونے کے بعد (۹۸۱ھ) بظاہر اس کا امکان بھی جاتا رہا۔ کیونکہ سچ یہ ہے کہ ان مشرقی صوبوں میں اجملی تمام افغانوں کی جنگی قوت ایسی اچھی حالت میں تھی کہ اگر منعم خاں جیسا دور اندیش و منتظم صوبہ دار جو تپور میں اور اندرونی نفاق کی بلا افغان سرداروں میں موجود نہ ہو تو خود ان کا ہمد ہمایوں کی طرح کسی آئندہ وقت میں مغلوں کے لئے خطرناک حریف بن جانا محال نہ تھا اور ”کر رانی“ خاندان کے نئے افغان بادشاہوں کے برسر اقتدار ہونے سے اس امکان کو مزید تقویت پہنچ گئی تھی۔

بنگالے کے افغان
بادشاہ

اس سلسلے میں مختصر طور پر یہ بیان کر دینا چاہئے کہ جب اسلم شاہ نے وفات پائی اور اس کے صغیر بن بیٹے کو مار کر عادل تخت نشین ہوا تو بنگالے کے افغان صوبہ دار محمد خاں سور نے ایسے ظالم غاصب کی بادشاہی تسلیم نہ کی اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ پھر وہ شاید جو تپور کو فتح کر کے اوڈھ کے آگے تک بڑھا آیا تھا کہ کالپی کے قریب عادل اور اس کے وزیر بھیمو نے اسے شکست دی اور وہ اسی لڑائی میں مارا گیا۔ (۹۶۱ھ) ۶۱۵۵۲

بایں ہمہ اس کا بیٹا (خضر خاں) بہادر شاہ وراثت بادشاہی کا مدعی تھا اور جس وقت ہیمو مغلوں سے مقابلہ کرنے آگئے اور دہلی کی طرف بڑھا تو اسی بہادر شاہ کی روک تھام کے لئے عادل چٹار کے قلعے میں ٹھہر گیا تھا اور آخر اسی کے ساتھ لڑائی میں زخمی ہو کر مارا گیا۔ (۹۶۲ھ) ۶۱۵۵۲

کر رانی خاندان

بہادر شاہ اور اس کی اولاد سات آٹھ برس تک حکومت کرتی رہی اور اس کے بعد افغانوں کا ایک دوسرا خاندان برسر اقتدار ہوا جن کے سین جٹوں مشکوک ہیں۔

علی خانی فرشتہ نے شان بنگالہ کے بیان میں (جلد دوم مقالہ ہفتم) اس خاندان کے پہلے بادشاہ تاج خاں (کر رانی) کا ذکر بھی نہیں کیا اور الفنسٹن وغیرہ انگریزی تاریخ نویسوں نے بھی اسی کی سبزی کی مثال کہ معاصر تاریخوں میں اس کے حالات موجود ہیں۔ (اکبر نامہ جلد دوم ۳۲۵ وغیرہ ملاحظہ ہو ریاض السلاطین صفحہ ۱۵۲)

باب

پھر حال اسی خاندان کا دوسرا بادشاہ سلیمان خاں کرانی تھا جس کے عہد حکومت میں بنگالے کو تازہ قوت حاصل ہوئی اسی کی نسبت ابو الفضل کی ہمعصر شہادت محفوظ ہے کہ استقلالِ غریب بہم رساند۔ افغانان بے سر ہمہ گرد او فراہم آمدند و خسروینہ جمع کرو و فیل فراواں بدست آورد۔ اسی اندرونی انتظام و استحکام خاص کر اڑیسہ اور کوچ بہار کے علاقے از سر نو فتح کرنے کی مصروفیت کے باعث مغلوں کے ساتھ اس نے ابتدا سے دوستانہ مراسم قائم رکھے تھے اور اسی لئے منہج خاں کو امید ہو گئی تھی کہ شاید وہ بغیر لڑے بھڑے اکبر کی سیادت باضابطہ تسلیم کر لے گا لیکن اول تو محض سلیمان کی سیاسی شاطری تھی کہ وہ مغلوں سے بگاڑ کر نانہ چاہتا دوسرے جب اس نے وفات پائی اور اس کا بیٹا داؤد تخت نشین ہوا (۱۵۵۳ء) تو سپاہ و دولت کے غرور نے اسے اتنی مصلحت بھی نہ برتنے دی اور معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کے ساتھ جنگ کی چھیڑ اسی کے طرف سے ہوئی۔

مغلوں سے لڑائی اور شکست

مغلوں سے الجھنے کے وقت بنگالے کی افغانی سلطنت کی مالی اور جنگی قوت کا صاحب ریاض السلاطین (صفحہ ۱۵۵) کے اس قول سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ”چوں داؤد خاں بر سریر حکومت بنگالہ تنگن شد بواسطہ شرب مدام و افزونی شان و کثرت کچل ہزار ہوا خوش اپہ و سر ہزار و سر صد زنجیل و یک لک و چہل ہزار پیادہ از قسم چچی و برق انداز و بان انداز و کماندار و بست ہزار توپ و بسیار نوازہ و کشتی ہائے جنگی و دیگر آلات و ادوات حرب حواشی مالک محمد اکبر بادشاہ راجست رسانید“ اور ایسے غنیمت کو ابو الفضل کا بد معاشانِ فتنہ شعار کے حیر لقب سے یاد کرنا بالکل ناروا تعصب ہے لیکن اس میں

علاوہ تاریخ جسے ایشیاٹک سوسائٹی نے اپنے اہتمام سے چھاپ کر شایع کیا ہے، سید غلام حسین سلیم (زید پوری) نے کسی انگریز حاکم کی فرمائش سے پندرہ جلدوں میں تالیف کی تھی اور اس میں مؤلف نے بنگالے کے کچھ جزائی اور کچھ عہد ہندو کے تاریخی واقعات کے بعد، محمد بن بختیار خلجی کی فتح سے نواب سراج الدولہ کے آخر عہد تک بنگالے کی اسلامی حکومت کے حالات جمع کئے ہیں۔ اگرچہ اس کتاب میں گزشتہ واقعات کے متعلق بہت کم کوئی ایسی بات ملتی ہے جو قطعاتِ اکبری، فرغۃ وغیرہ مشہور تاریخیوں میں نہ ہوتا ہم مؤلف نے کافی تحقیقات اور سلیقے سے منتشر معلومات کو ایک جگہ فراہم کر دیا ہے۔

کوئی شبہ نہیں کہ مغلوں سے لڑتے وقت افغانوں کو عرصے تک مستقل و متحد رکھنے کے لیے جس غیر معمولی قابلیت کی ضرورت تھی، داؤد خاں اس سے متصف نہ تھا اور جنگ شروع ہونے کے بعد جب اس کے سپہ سالار لودی خاں نے منعم خاں سے صلح کرنی چاہی تو داؤد نے بدگمانی اور نادانی سے لودی خاں کو دھوکا دے کر گرفتار کر لیا اور بعض مصاحبوں کی اغوا سے قتل کر ڈالا جسے ابو الفضل جابجا تائید الہی سے تعبیر کرتا ہے کہ ایسے دشمن سخت تک بہ ہزار تدبیر و درساختن اوزمیاں دشوار بود بہ استقام مخالفان برداشتہ آمدند اس واقعے نے ادھر تو افغانوں کے ایک گروہ کو علانیہ داؤد سے منحرف کر دیا اور ادھر سون و گنگا کے سنگم پر جب خود اس نے منعم خاں کا مقابلہ کیا تو سخت شکست کھائی اور ہٹ کر پٹنہ میں قلعہ بند ہو گیا (۹۱۵ھ) اسی محاصرے کے دوران میں اکبر بھی پٹنہ آیا تھا اور داؤد خاں فرار ہوا تو ہاتھیوں کے لالچ میں خود بھی تعاقب میں شریک تھا۔ ورنہ پھر شاہ عالم ثانی کے زمانے تک کسی مغل بادشاہ کو بنگالے پر خود فوج کشی کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی اور مغل صوبہ داروں ہی نے آسام تک اقطاع بنگالہ کو فتح کیا اور پونے دو صدی تک وہاں کامیابی اور امن و انتظام کے ساتھ حکومت کرتے رہے جو بجائے خود سلاطین مغلیہ کے اقبال و استقلال کا نہایت عمدہ ثبوت ہے۔

بایں ہمہ داؤد کی مذکورہ بالا نہایت نے افغانوں کی جنگی قوت کا خاتمہ نہیں کر دیا تھا اور گواہ اول داؤد نے منعم خاں سے اس شرط پر کہ اسے اڑیسہ کا باج گزار بادشاہ تسلیم کر لیا جائے گا صلح کرنی اور بنگالے کے دیگر اقطاع کے دعوے سے دست بردار ہو گیا تھا۔ لیکن جب منعم خاں نے ۹۱۵ھ میں وفات پائی تو اس نے پھر سر اٹھایا اور نئے ناظم یا صوبہ دار خان جہاں (حسین قلی خاں رکمان) کے پیچھے پیچھے بنگالہ و بہار کے اکثر جنوبی اضلاع پر قابض ہو گیا۔ افغانوں کی بہت بڑی فوج جس کے بعض سردار شجاعت و سپہ گری میں یگانہ روزگار تھے اس نے جمع کر لی تھی اور انھوں نے جاننا بازی دکھانے میں بھی کمی نہیں کی مگر تقدیر نے خان جہاں کا ساتھ دیا اور اس قیامت خیز جنگ میں

بھگت پور

جو موجودہ بھاگلپور کے قریب ہوئی تھی مغلوں کو فتح کامل نصیب ہوئی اور داؤد خاں گرفتار ہو کر مارا گیا (ربیع الثانی ۱۰۹۱ھ)

اس دوسری ہزیمت اور داؤد کے قتل سے بقول صاحب ریاض السلاطین شدہ تخت شاہی زشایاں تھی پڑ بنگالہ شد ختم نام نہی! "تاہم افغان سردار بہت عرصے تک بہار و اڑیسہ کے دشوار گزار مقامات میں قراقرانہ جنگ کرتے رہے اور جب اکبری عہد کے قانون مالگزاری کا ان ممالک میں نفاذ ہوا اور خود مغل جاگیرداروں میں شورش برپا ہوئی تو حکومت کی اس پریشانی سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اور ان کے ایک سرغنہ عثمان خاں نے اتنی قوت بہم پہنچائی کہ پچیس چھپیس برس تک مغل حکام کے قابو میں نہ آیا۔ آخر جہانگیر کے عہد میں جب نواب اسلام خاں بنگالے کا صوبہ دار مقرر ہوا اور بادشاہ کے اس فتنے کے استیصال کلی کی تاکید کی تو شجاعت خاں کی سرکردگی میں پھر ایک مہم روانہ کی گئی۔ مغلوں کے ساتھ ہندی افغانوں کی آخری بڑی لڑائی کا خاتمہ اسی سپہ سالار کے ہاتھ پر ہوا اور اس کی حیرت انگیز شجاعت ذائقہ کی گویا قضا و قدر کی طرف سے یہ جزائی کہ عثمان خاں جو میدان سے ہٹنے کا کام نہ لیتا تھا کسی نامعلوم شخص کی گولی سے زخم کھا کے مارا گیا اور باقی افغان سرداروں نے بھی مایوس و مضطرب ہو کر اطاعت قبول کر لی (۱۰۹۱ھ)

اس طرح شمالی ہند کے ملکوں میں اگرچہ سب سے زیادہ تاخیر و تشویش بنگالے کی فتح میں پیش آئی اور بہار و اڑیسہ کو ملا کر یہی سب سے وسیع و زرخیز ملک بھی تھا تاہم فتح کشمیر کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ گو اس گل ریز و میوہ خیز ملک میں عرصے سے آریسل

ملا بنگال کے افغانوں کی لڑائیوں کے دلولہ انگیز حالات اس عہد کی فارسی کتابوں میں تفصیل سے ملتے ہیں۔ صاحب ریاض السلاطین اور استوار طے اپنی انگریزی تاریخ بنگال میں انھیں کسی قدر مختصر لیکن مسلسل بیان کیا ہے۔ شجاعت خاں کی مذکورہ بالا جنگ کے لیے جس میں یہ سردار دشمن کے قتل و کشت کے سامنے سے نہیں ہٹا اور اپنی حیرت انگیز بہادری کے حیلے میں ہر قسم زان کے خطاب سے فخر ہوا تھا) دیکھو اقبال نامہ جہانگیری صفحات ۶۱ تا ۶۲۔ ریاض السلاطین ۱۰۶ تا ۱۰۸ نیز آثار الکرام جلد دوم

کے لوگ آباد ہو گئے تھے اور اس لئے وہ صحیح معنی میں "کشور ہند" کا حصہ تھا پھر بھی ہندوستان کی کوئی اسلامی سلطنت مغلوں سے پہلے اس پر تسلط حاصل نہ کر سکی جس کی سب سے بڑی وجہ راستے کی دشواریاں تھیں۔

وختار اسلامی حکومت

لیکن کشمیر میں فتح نہ ہونے کے باوجود آٹھویں صدی ہجری کے شروع ہی میں مذہب اسلام شائع اور یہاں کاراجہ رجن (۲۱۰ھ تا ۳۱۰ھ) بطور خود ایک درویش کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا اسلامی لقب سلطان صدر الدین رکھا اور خاندان کے بہت سے لوگوں کو مسلمان کر لیا تھا مگر وہ مراٹھوں کی بیوہ رانی نے پہلے راجہ کے بھائی اودن دیو کو بلا کر شادی کر لی اور وہ دس بارہ برس تک حکومت کرتا اور خانہ جنگی میں الجھتا رہا حتیٰ کہ ایک مسلمان امیر "شاہ میرزا" نے تمام حریفوں کو دفع کر دیا اور مستقل طور پر اسلامی بادشاہی کی بنیاد ڈالی (۳۳۳ھ تا ۳۳۷ھ) اگرچہ وہ خود بھی نکو در کا پوتہ اور ہندوستان کے قدیم پاندورا جاؤں کی اولاد میں ہونے کا مدعی تھا۔

شاہ میرزا نے جو کشمیری زبان میں شبنمو کے عسوف سے مشہور ہے سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کیا تھا اور اس کی تخت نشینی سے آئندہ دو صدی تک اس ملک میں خود مختار مسلمان بادشاہ فرما رہے تھے۔ جن میں سلطان سکندر (ببت شکن) (۳۹۰ھ تا ۴۱۰ھ) اپنے مذہبی تعصب اور سلطان زین العابدین (۳۹۰ھ تا ۴۱۰ھ) کے تعصبی اور نیک نفسی میں مشہور ہیں۔ سلطان سکندر کے زمانے میں ہندوؤں پر بڑی سختیاں ہوئیں اور بہت سے برہمن خوف جان و مال کی وجہ سے مسلمان ہو گئے۔ اسی کے ساتھ بیرونی ممالک سے بے شمار مسلمان علماء اور درویش کشمیر میں آکر آباد ہوئے اور اسلامی علوم و تمدن کو بڑی رونق حاصل ہوئی۔ لیکن سلطان زین العابدین کے طویل عہد سلطنت میں سکندر کے ان بیجا مظالم کی تلافی ہوئی اور اہل کشمیر کو نہ صرف

عزت و منعت مستحق بن گئے بلکہ ان کے حالات میں سکندر ببت شکن کو نمایاں جگہ دی ہے (اوکس ہسٹری ص ۱۲۷) اس واقعے کا ذکر نہیں کرتے حالانکہ وہ نہ صرف بعد کی فارسی اور نیز اردو تاریخوں میں بلکہ آئین اکبری (جلد اول صفحہ ۵۸۳) اور اس کے انگریزی ترجمے (جلد دوم صفحہ ۳۸۶) اور نیز اچیمیریل گزٹیر (جلد ہفتم صفحہ ۹۲) میں موجود ہے۔ لکن یہاں اس راجہ کے نام کا صحیح تلفظ "نوجن" بتایا ہے جسے غلطی سے "نوجن" بنایا گیا ہے۔

کامل مذہبی آزادی ملی بلکہ جزئیہ موقوف اور گادگشی بھی اسی مسلمان بادشاہ نے اپنی مملکت میں ممنوع قرار دی اکثر ہندو خاندان جو بے ولی سے مسلمان ہو گئے تھے، دوبارہ اپنی ملت میں جا ملے اور اسی طرح جو مندر سکندر نے جبراً ترلوائے تھے وہ از سر نو تعمیر ہوئے اور سکرت زبان اور ہندو علم کا اس عہد میں احیا ہوا۔ اور زین العابدین کے حکم سے جو خود بھی سسکرت کا عظیم متعبد و سسکرت کتابوں کا عربی فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

مغلیہ فتوحات

سلطان زین العابدین اور دوسرے مسلمان بادشاہوں کی انتظامی اصلاحات عمدہ آئین و قوانین اور نئے شہر و عمارات کی تعمیر و رعایا پروری کے بہت سے واقعات کشمیر کی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ اس کتاب میں ان کے تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں اور یہاں مختصر طور پر اسی قدر لکھنا کافی ہو گا کہ دسویں صدی ہجری کے آغاز ہی میں امرائے کشمیر کے باہمی حسد و نفاق کی وجہ سے یہ سلطنت اتنی کمزور بھی جانے لگی تھی کہ بابر نے تھوڑی سی فوج بھیج کر اس کی فتح کا ارادہ کیا اور گوانے کا سیانی نہ ہوئی لیکن شکستہ میں بابر کا خالہ زاد بھائی میرزا حیدر (دوغلات) صرف چار ہزار سواروں سے کشمیر کے حریفان ملکی کو شکست دے کر ملک پر قابض ہو گیا جس کا حال اجمالاً ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ میرزا نے اپنی حکومت کے زمانے میں خطبہ و سکہ ہالیوں بادشاہی کے نام کا جاری کیا تھا اور اسی بنا پر گو میرزا حیدر کے بعد پھر کشمیر پر وہاں کے امرا قابض ہو گئے اور غلوں کو عرصے تک ادھر توجہ کرنے کی ہمت نہیں ملی تاہم غالباً اکبر سے پہلے سے اپنا ملک سمجھتا تھا۔ چنانچہ جب پہلی فوج کشی کے وقت اس کے کچھ سالاروں نے باج گزاری کا اقرار اور کچھ علاقہ لے کر اہل کشمیر سے صلح کر لی تو بادشاہ نے اس معاہدے کو منظور نہیں کیا اور دوبارہ فوج روانہ کی۔ کشمیر کے لوگ راجپوتی نسل اور کوہستانی باشندے ہونے کے باوجود شجاعت و سپہ گری میں کوئی امتیاز نہیں رکھتے دوسرے انھیں باہمی تنازعات نے مشترکہ

علا کشمیر کی قدیم تاریخ "راج ترنگنی" کی بھی اسی عہد میں تکمیل ہوئی، مذکورہ بالا حالات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو آئین اکبری جلد اول "میر کا کشمیر" تاریخ فرشتہ جلد دوم مقالہ دوم۔ خلاصہ تواریخ کشمیر وغیرہ۔
آئین اکبری، صفحہ ۸۴، مگر جہاں جہاں کشمیریوں کا زور چلتا تھا وہ اپنے ہی بادشاہ (نازک شاہ) کے نام کا خطبہ پڑھواتے تھے جو

دشمن کے مقابلے میں بھی متحد نہ ہونے دیا اور یہ خوبصورت ملک برہ آسانی فتح ہو کر سلطنت مغلیہ کا
جزو بن گیا پھر ۹۹۵ھ

دوسری فصل - ملکی آئین

الحاق کشمیر کے قریبی زمانے میں افواج اکبری نے کوہستان سلیمان کے جنگ جہانوں کی
سرکوبی کو اور بہت سے نقصان و مصائب برداشت کرنے کے باوجود میدان فی اور کھیلے ہوئے
قطعات پر بادشاہی تسلط قائم کر دیا۔ اگرچہ یہاں کے آزاد قبائل صحیح معنی میں نہ پہلے کبھی
مغلوب و محکوم ہوئے تھے اور نہ آج تک کسی کے محکوم ہیں پھر

سندھ کی تسخیر میں دو تین سال صرف ہوئے اور اسی زمانے ۱۵۹۲ھ میں گجرات
و کشمیر کی خطرناک بناؤ توں کو بادشاہی امرائے فرو کیا پھر قندھار کو جس پر سلطنت ایران
کا قبضہ تھا، خود وہاں کے امرائے صدر حکومت کی بے توجہی اور باہمی خانہ جنگی سے عاجز آ کر اکبر کے
حوالے کر دیا ۱۵۹۵ھ اور اس قبضے سے مغلوں کے صوبہ کابل کے استحفاظ و استحکام کو
بالواسطہ بہت تقویت پہنچی پھر

مالوہ اور مالک شرقی کی تسخیر کے دوران میں گوند وائے یاد مرط ہند کے غیر آباد قطع کو
مغلوں کی سیادت تسلیم کرنی پڑی اور اکبر کے آخری مہدیں و کن کی اسلامی ریاستوں سے بھی
شد و مد کے ساتھ لڑائی چھڑ گئی تھی اور مغلیں کے علاوہ برار و احمد نگر کے علاقے سلطنت مغلیہ
کے صوبے بن گئے تھے۔ لیکن ان دکنی لڑائیوں کے حالات کسی قدر تفصیل و تسلسل کے ساتھ
ہم آئندہ باب میں ایک جگہ بیان کر دیں گے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی
اندرونی حالت پر جسے عہد اکبری میں نمایاں استقلال حاصل ہوا ایک اجمالی نظر ڈال جائیں پھر
ان حالات کو جن میں نظم و نسق کے آئین و ضوابط، لوگوں کا تمدن، رسوم و معاشرت
مشاغل و خیالات، علوم و فنون سب کچھ داخل ہے، معلوم کرنے کے لیے شمار ذرائع موجود ہیں۔
متعدد عام تواریخ کے علاوہ جن میں سب سے بہتر و مستند طبقات اکبری مانی گئی ہے،

دو سنہ قندھار و کن

ذرائع معلوم

علاوہ لاجواب تاریخ جس کی خوبیوں کو قدیم و جدید علما بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں، اکبر کے ہر و عمر پر بخشی خواجہ
نظام الدین احمد (بن خواجہ مقیم ہروی) نے تالیف کی تھی اور لفظ "نظامی" اس کا مادہ تاج ہے
اگرچہ مؤلف آئندہ ایک دو سال کے حالات بھی جب تک زندہ رہا تسلط اس میں اضافہ کرتا رہا۔

باب

زیر نظر عہد کے اسلامی علماء اور مذہبی اور ادبی خیالات و مسائل کے متعلق منتخب التواریخ کی آخری دو جلدیں وچھپ معلومات کا خزانہ ہیں اور ملکی آئین و قوانین سے کاری محکمے عہدہ داروں کے فرائض و اختیارات ملک کی انتظامی تقسیم و مختلف اقطار اور بلاد کے جغرافیہ حالات، مالگزاری، پیداوار فنون و مصنوعات، مٹاشی مالیات، جنگی ساز و سامان، امرا اور اہل دربار خاص کر بادشاہ کے مشاغل و سوانح و غیرہ موضوع پر ابوالفضل کی شہر کتابیں آئین اکبری و اکبر نامہ معلومات کا ایسا ذخیرہ ہیں کہ گو ان میں بعض اعداد و حالات نہیں ملتے پھر بھی انھیں سامنے رکھ کر عہد اکبری کے آئین و تمدن پر ضخیم سے ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم اس تاریخ میں محدود گنجائش اور پائیدار تحریر کی بنا پر اس دسویں صدی ہجری کے ہندوستانی تمدن کے صرف نمایاں خدوخال پیش کر سکیں گے۔ اور بالواسطہ ناظرین کو اس دھوکے میں پڑنے سے بھی بچائیں گے جو اس بارے میں بعض انگریزی تاریخوں کے مطالعے سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ انگریزی تاریخیں اس عہد کے حالات کو اس طرح بیان کرتی ہیں کہ گو بالملکی نظم و نسق کے یہ آئین و ضوابط، علوم و فنون اور تمدن کی ترقی محض اکبر بادشاہ کے ذاتی اوصاف کی وجہ سے ایک بے یک ہندوستان میں رونما ہو گئی تھی۔ اور اس سے پہلے نہ یہاں کے لوگوں میں کوئی علم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۲) تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۹، آثار الامرا جلد اول صفحہ ۶۶۰ ایٹ جلد پنجم صفحہ ۱۷۷ وغیرہ وغیرہ)

۱۔ یہ مشہور تاریخ تاج عبدالقادر بن ملوک شاہ بدافنی (متوفی ۸۵۰ھ) کی تالیف ہے۔ تاج صاحب کے مختلف علوم و السنہ میں متبحر و اکثر معاصرین و متاخرین نے تسلیم کیا ہے تاریخی واقعات نہایت خوش اسلوبی اور صراحت سے بیان کرتے ہیں۔ بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے جس بات کو بدعت یا الحاد سمجھ لیں پھر اس کے دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ اکبر کے دربار میں قاری کی خدمت پر مامور تھے اور قنات کے علاقے میں بادشاہ کی طرف سے جاگیر بھی رکھتے تھے۔ اخیر زمانے میں دربار میں جانا چھوڑ دیا تھا ان کی تاریخ خود ان کی اور اکبر کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

۲۔ اس کتاب سے کام لیتے وقت ہم نے اس کے مشہور انگریزی ترجمے سے بہ اعتبار مقابلہ کیا ہے جسے بلوچمن نے بڑی محنت اور اہتمام سے شروع کیا اور حیرت نے مکین کو پہنچایا ہے

اور تہذیب و تمدن تعانہ سلطنت میں نظم و نسق! اس میں شک نہیں کہ سلطنت مغلیہ سے قبل کی تہذیب و تاریخ کو قدامت نے دھندلا کر دیا ہے اور اس کے تحریری ماخذ جو زمانے کی دست و پز سے بچ گئے ہیں وہ تعداد میں کم اور عام طالب علم کی دسترس سے کسی قدر باہر ہیں لیکن اول تو جدید اصول و قواعد کے مطابق اہل علم کی تحقیقات موجودہ مواد سے بہت کچھ کام لے سکتی اور مذکورہ بالا غلطی کو باسانی دور کر سکتی ہے دوسرے انسانی تاریخ کا یہ عام کلیہ بھولنا نہ چاہئے کہ بڑی بڑی قوموں اور ملکوں کے تمدن میں تغیر ہمیشہ تدریجی ہوا کرتا ہے اور اسی کے ساتھ نظم و نسق کے آئین بدلتے ہیں۔ کسی قوم کے نظام سلطنت میں یکایک انقلاب پیدا تو کیا جاسکتا ہے اور اکثر ممالک میں مختلف اسباب سے ایسا ہوا بھی ہے لیکن نئے آئین و قوانین اگر لوگوں کے موجودہ حالات و طبائع کے مناسب نہ ہوں تو بہت جلد بیکار ہو جاتے ہیں اور علما ان کا منہوم و منشاہی وہ باقی نہیں رہتا جو انھیں زبردستی رائج کرنے والوں نے قرار دیا تھا۔

ان عام نظریات سے قطع نظر ہمارے پاس اس امر کی صریح شہادتیں موجود ہیں کہ نو وامل نظم و نسق کے ان آئین کو جو عہد اکبری سے منسوب کئے جاتے ہیں اپنے ملک سے لے کر نہیں آئے تھے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ خود اقبالند اکبر فن سیاسیات و ملک داری کی واقفیت میں اپنے باپ دادا پر کوئی فوقیت نہ رکھتا تھا یہ صحیح ہے کہ شمالی ہند میں گزشتہ دو صدی کی لامرکزیت اور طوائف الملوکی نے ملکی آئین کی یکسانی معدوم کر دی تھی اور ہر صوبے میں مقامی اور ہنگامی ضروریات کے باعث نظم و نسق کے طرز مختلف ہو گئے تھے۔ لیکن غور سے دیکھئے تو انہی نئی ضروریات نے ہندوستان کے ارباب حل و عقد کو اصول ملک داری کے جزئیات سے اور نیز مقامی خصوصیت سے مزید مقامی واقفیت کا موقع دیا جو قدیم سلطنت و ملی کی مرکزی حکومت کو حاصل نہ ہوا تھا اور اس کے بعد اگر کسی بات کی کمی رہ گئی تھی تو وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا قابل مدبر میدان عمل میں آئے جو اس تمام معلومات کو پیش نظر رکھ کر از سر نو نظم و نسق کے اصول میں اصلاح و یکسانی پیدا کر دے۔ اور یہ لکھنا ضروری نہیں کہ اس خدمت کو انجام دینے کے لیے گویا سب سے مقدم کام ممالک ہند کی سیاسی شیرازہ بندی اور مرکزی حکومت کا احیا تھا۔

خاص طور پر قابل لحاظ یہ بات ہے کہ درہنہ شاہی ہند کی اس تجدید کا اول اعزاز منسوب

مرکزیت کی تجدید

سوچنے سے بھی اہل ہند کے دل و دماغ عاری نہ تھے۔ بے شبہہ بابر کی آمد نے یہاں کے حکومت پریشہ طبقہ، خاص کر ہندی افغانوں میں جن کے ہاتھ سے مغل حکومت چھین رہے تھے، ایک قسم کا قومی ہیجان پیدا کر دیا اور بعد میں ہمایوں کی فتوحات مالوہ و گجرات و بنگالہ نے تمام شمالی ہند کو ایک مرکزی حکومت کے ماتحت لانے کی عملی مثال بھی ان کے پیش نظر کر دی۔

بایں ہمہ اگر تاریخ شیر شاہی کے منقولہ روایات و اقوال جن کا ہم پچھلے باب میں حوالہ دے چکے ہیں، صحیح ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ عالی حوصلہ شیر شاہ بابر و ہمایوں کا مقلد نہ تھا بلکہ اس کے تصور میں عہد یمن و علاء الدین کے نقشے کھینچے ہوئے تھے کیونکہ اس نے ہندوستان پر تسلط حاصل کرنے کے ساتھ ہی مالگزار، محاصل تجارت، عدالت، ڈاک، احتظار، راہ اندرونی امن اور بیرونی دشمنوں سے مدافعت کے وہ مفصل آئین بنائے اور نافذ کیئے جو پہلی تاریخ اور حالات حاضرہ سے بہت وسیع واقفیت اور عرصے تک غور و فکر ہی کا نتیجہ ہو سکتے ہیں اور جن کا نقشہ تیار کرنے میں گو وہ اکبر و جہانگیر کا استاد تھا لیکن بابر و ہمایوں کا شاگرد نہ تھا۔ اور اکثر اسی کا نظم و نسق دیکھے اور سیکھے ہوئے ہندوستانی لوگ تھے جنہوں نے عہد اکبری میں اسی نقش اول کے مطابق آئین سلطنت کو بنایا اور ملک میں رائج کیا۔

اس طرح ایک اعتبار سے یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ ہمایوں کا یہی افغان حریف شیر شاہ ہندوستان کے اس دور شہنشاہی کا بانی تھا جس کے نمونے پر سلطنت مغلیہ قائم ہوئی، اگر اسی کے ساتھ ہمیں سلاطین تیموری کی ان امتیازی خصوصیات کو سراہا موش نہ کرنا چاہیے جنہیں مغل ہندوستان میں لائے تھے، واضح رہے کہ یہاں کے قدیم باشندوں میں بادشاہ پرستی کا جذبہ غالباً مدت دراز سے متوارث تھا۔ مطلق العنان بادشاہی کا طریقہ بھی اس زمانے میں دنیا کے قریب قریب ہر ملک میں تروج اور گویا بہترین طرز حکومت سمجھا جاتا تھا اور جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں ہندوستان میں مسلمانوں کی ابتدائی متحرک شاہی میں ہی اس مطلق العنان طرز حکومت کے عناصر موجود تھے چنانچہ سلطنت دہلی کے بعض فرمانروا مطلق العنانی کا بدترین نمونہ سمجھے جانے کے لائق ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ایسے بادشاہ دیگر اسباب اور ذاتی اوصاف سے اقتدار حاصل کر لینے کے بعد اپنی جابرانہ خود رائی کا اظہار کرتے تھے اور ان کے ہمعصر طبقہ اعلیٰ کے مسلمان کبھی خوف و عبوری اور کبھی دنیاوی طمع سے ان کی اطاعت قبول کر لیتے تھے ورنہ معمولی غلام یا سرداروں کا

اپنی آنکھوں کے سامنے رتبہ بادشاہی تک پہنچنا دیکھ کر ان کے دلوں میں بادشاہ کی عظمت و پرش کا وہ جذبہ پیدا نہ ہو سکتا تھا جو بعد کے مغل امرا میں ہمیں نظر آتا ہے۔
مطلق العنان طرز حکومت کے اسباب تلاش کرنے مشکل نہیں ہیں چنگیز خانیوں کے ممالک اسلامیہ میں تہلکہ بپا کرنے کے زمانے ہی میں "کفار مغول" کی نسلی خصوصیات ظاہر ہو گئی تھیں اور ان کی خونخواری اور قساوت قلبی کی طرح ان کی "آقا پرستی" بھی ضرب المثل سمجھی جانے لگی تھی۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد مغلوں کی عادات و اطوار میں نہایت عمدہ انقلاب ہوا۔ لیکن یہ انقلاب ایسا نہ تھا کہ ان کو اسلام کے ابتدائی طرز حکومت کی طرف راجع کر دیتا۔ وجہ یہ تھی کہ مغلوں نے ایسی حالت میں اسلام قبول کیا تھا جب کہ وہ صاحب حکومت تھے۔ علاوہ اس کے اس زمانے میں خود مسلمان حکمران قوموں میں مطلق العنان بادشاہی مدت سے پیدا ہو چکی تھی۔ اس لئے مغلوں کا اس طریقہ حکومت کو اختیار کرنا کوئی عجیب بات نہ تھی۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ابتدائے مغلوں کی لڑائیاں زیادہ تر مسلمانوں کے ساتھ ہوئی تھیں اور اسلام لانے کے بعد بھی وہ وسط ایشیا کی اسلامی حکومتوں سے جدوجہد کرتے رہے پس غیر مسلموں سے مذہبی لڑائی کا تجربہ ان کو نہ ہوا اور نہ ان میں وہ جذبہ تھا جو مجاہدین میں ہوتا تھا۔ اس لئے جب بابر نے رانا سنگا پر فتح پا کر (جنگ کا نوہ ۱۵۱۹ء) غازی کا لقب اختیار کیا یا اس لڑائی کو "جہاد فی سبیل اللہ" مشہور کرنا چاہا تو سمجھنا چاہئے کہ اس کا یہ فعل اس کے اصلی میلان طبع کے چنداں موافق نہ تھا۔

مغلوں کی نسلی خصوصیات ان کی مطلق العنانی اور بے تعصبی کو اجمالی طور پر سمجھنے اور پھر ان کے ہر بادشاہ کے ذاتی سوانح اور تاریخی واقعات پر نظر ڈالنے سے ہم ہندوستان کے سلاطین تیموری کی خصوصیات کا بھی صحیح اندازہ کرنے میں غلط فہمیوں سے بچ سکتے ہیں۔ ان باتوں کے ذہن میں رکھنے کے بعد ہندوستان کا سب سے پہلا

ما مشافہ ملاحظہ ہو لطائف ناصری، تقریظ، حالات، مغل مغول "نیز رادرفی، جلد دوم" کے حاشی وغیرہ۔
مگر بابر تو اپنے محل کہے جانے سے بھی برا ماننا تھا۔

مغل شہنشاہ بھی ایک معمولی انسان کی طرح ہمارے تصور کے سامنے آجاتا ہے جس کی ذاتی صفات انھی موروثی اثرات ابتدائی تعلیم و تربیت اور گرد و پیش کے حوادث و واقعات کے قدرتی اسباب کا نتیجہ ہیں جو ہر شخص کی زندگی پر کم و بیش اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ سپاہیانہ شجاعت و جانبازی رفیقوں کی قدر دانی اور ان سے محبت و فیاضی کا بڑا ذوق مغلوب دشمنوں کے ساتھ عنف و کرم شوق جنگ و کشور کشائی اور اپنے مرتبے اور خاندان کا پاس و غرور وہ شاہانہ جذبات ہیں جو اکبر کو اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملے تھے علاوہ اس کے اور سلطنت کو سمجھنے اور سیاسی معاملات کو سرانجام دینے کی اس میں عمدہ قابلیت موجود تھی اور اگر طفولیت میں کوئی کتابی تعلیم نہ ملنے یا زیادہ تر جنگ و سفر میں رہنے کی وجہ سے وہ جوانی میں محض ایک زود اعتماد سیدھا سادہ مسلمان سپاہی بن گیا تو اسی کے ساتھ انھی اسباب نے اس کو عیش پرستی اور تن آسانی کے اس گڑھے میں گرنے سے بچا لیا جو اکثر نوجوان ہندوؤں کی ہلاکت کا باعث ہوا ہے مگر اس جگہ خاص طور پر جو بات جتنی منظور ہے وہ یہ ہے کہ انھی مذکورہ بالا موروثی اثرات اور شوق حکومت نے اکبر کی ذاتی کم علمی اور سپاہیانہ سادگی سے مل کر وہ مذہبی بے تعصبی پیدا کی تھی جس کی تعریف بعض مورخوں نے بہت کی ہے۔

ہندوؤں سے
تعلقات

در اصل قوم نمل کی جس آقا پرستی کا ہم اوپر حوالہ دے چکے ہیں اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ مغل بادشاہ اپنی رعایا یا ماتحتوں سے کامل اطاعت کی توقع رکھتے تھے اور بادشاہ کی ذات سے وابستگی اور جان بخشی ان کی سرکاریں درجہ قبولیت پاتی تھی۔ اور بادشاہ کی تعظیم و تکریم وہ شے تھی جس میں ہندوستان کے ہندو باشندے مغلوں سے بھی دو قدم آگے تھے۔ باہر و ہمالیوں کو اس بات کے سمجھنے کا پورا موقع نہیں ملا لیکن اکبر کو ہرام خاں کی مسزولی کے زمانے سے راجپوتانے کے رئیسوں سے سابقہ پڑا اور جب بہار مل مہاراجا امیر (جے پور) کی راجکٹواری بادشاہ کے محل میں آکر بادشاہ بیگم بی (۱۵۶۹ء) اور مہاراجا کا فرزند جنگواننداس راجپوتوں کی ایک فوج کے ساتھ اکبر کے امرا میں شامل ہو گیا تو نوجوان بادشاہ کو اس قوم کی سہ گری، بہادری اور سب سے زیادہ اس آقا پرستی کے تماشے دیکھنے کا بار بار اتفاق ہوا جو تمام مطلق العنان بادشاہوں کی نظر میں قابل قدر ہوتی ہے چنانچہ اکبر اور اس کے جانشین اپنے راجپوت سپاہیوں کے دل سے قدر دان ہو گئے اور ان دونوں (راجپوت و مغل) سپاہی پیشہ قوموں میں درحقیقت کچھ اس قسم کی طبعی مناسبت تھی کہ مذہبی اختلاف کے باوجود

وہ بہت جلد ایک دوسرے کے ایسے رفیق بن گئے کہ شاید دنیا کی کسی اور غیر قوموں میں اتنی ایک جہتی کی مثال نہ ملے گی۔

راجپوتوں سے ان تعلقات کا آغاز ہوتے ہی بادشاہ نے جزیرہ اور وہ محصول جو ہندو جاتریوں سے وصول کیا جاتا تھا، منسوخ کر دیا (۱۵۶۳ء) جس کی سلطان زین العابدین کشمیر میں نظریہ قائم کر چکا تھا۔ اس نفل نے قدرتی طور پر ہندوؤں کو حکومت کا ممنوں اور مغلوں کی خدمت گزاری پرائل کیا اور ادھر اتفاق سے اول ہی اول جو ہندو سردار اکبر کی ملازمت میں داخل ہوئے ان میں راجہ بھگوانداس (یا بھگونت داس) اور اس کا بیٹا جیٹیا راجہ مان سنگھ اور ٹوڈرمل اپنی انتظامی قابلیت کے اعتبار سے بھی کسی مثل سردار سے کم تر نہ تھے وہ سلطنت کے بڑے سے بڑے عہدوں پر فائز کئے گئے اور اتنا رسوخ پانے کے بعد ان کے بہت سے متوسلین بھی اعلیٰ خدمات و مناصب تک پہنچے چنانچہ اکبری کے وقت میں ۱۵۴۴ء بڑے عہدہ داروں میں سے ۱۵ ہندو تھے۔

یہ تمام شناسی لازماً بحرقضاۃ و طماو کے خواہ وہ کسی کام پر لگا دیئے جائیں، ایک فوجی عہدہ دار کی حیثیت رکھتے تھے اور اس لئے ان کے مختلف مدارج کا اندازہ فوج کی اس

عام فارسی تواریخ میں جا بجا ان ہندو امراء کے حالات درج ہیں جنہیں صاحب آثار الامراء نے سلیتے سے جمع کر دیا ہے (نیز دیکھو ٹومین کا نوٹ، ترجمہ آئین جلد اول ۵۲۸) مذکورہ بالا سرداروں میں سے جے پور کے راجہ بھگوانداس (متوفی ۱۵۶۳ء) اور مان سنگھ (متوفی ۱۵۶۳ء) پنجہزاری منصبدار کے درجے تک ترقی کر گئے تھے جو سب سے ممتاز اراکین سلطنت اور شہنشاہوں کا منصب تھا، ٹوڈرمل ذات کا کھتری اور ان دونوں کے برخلاف اپنے مذہبی عقائد اور بت پرستی کا سختی سے پابند تھا، اور اسی لئے ابوالفضل اور ملا عبدالقادر (منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۸۱) دونوں کا نشانہ اعتراض ہوا اور ابوالفضل کا بھوس کے ساتھ ذاتی شیک بھی رکھتا تھا، یہ قول مشہور ہے کہ ٹوڈرمل در راستی و درستی و مردانگی و معاملہ شناسی و سرپرستی ہندوستان لگاؤ رکھتا رہا۔ اگر تعصب پرستاری و تقلید و سنتی و کینہ توہمی نہ داشتے و برگشتہ خود نمندہ از معنوی بزرگاں ہوتے (اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۵۶۹) آثار الامراء میں بھی عالمگیری کی روایت سے اکبر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ٹوڈرمل در امور مالی و ملکی شعور مند و ذہین رسا دار و۔ اما استغنا و خود پسندی او خوش نمی آید۔ (تاریخ جلد دوم) ۱۲۷ منصب چارہزاری تک ترقی کی اور ۱۵۸۹ء میں دفاتر پائی، لیکن ٹوڈرمل کی شہرت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ

جمیعت سے ہوتا تھا جو رسمی طور پر ان کے ماتحت سمجھی جاتی تھی مثلاً سب سے چھوٹا عہدہ دار ”ڈومہ باشی“ یا دس سپاہی کا سردار کہلاتا تھا اور اسی طرح بیس بیس ”سوسو“ ہزار، دو ہزار، غرض اول اول پانچ ہزار اور بعد میں بیس ہزار تک ہر تعداد سپاہ کے سردار نامزد ہوتے اور منصبدار کہلاتے تھے۔ سپاہ کی جو تعداد منصب میں ظاہر ہوتی ہے، کچھ ضروری نہ تھا کہ واقع میں منصبدار کے ماتحت ٹھیک اتنی ہی تعداد موجود ہو بلکہ اس تعداد کی تخصیص کا منشا صرف یہ تھا کہ اس عہدہ دار کی حیثیت اور درجہ نیز اس منصب کے مناسب حال تنخواہ مقرر ہو جائے۔ اسی کے ساتھ اسے لازمی طور پر فوج کی ایک مقررہ جمیعت کو فراہم اور احکام شاہی کی بجا آوری کے لئے مستعد رکھنا پڑتا تھا اور خزانہ شاہی سے منصبدار کو جو تنخواہ ملتی تھی اسی میں اس کے تمام مصارف اپ واطح وغیرہ شامل ہوتے تھے جن کی تعداد سرکار سے مقرر اور معائنہ کی جاتی تھی۔ اور آئین اکبری کے نقشوں کو سامنے رکھ کر بلوچ میں صاحب نے حساب لگایا ہے کہ بیس ہزاری منصبدار کو جو بیس ہزار روپے ماہانہ سرکار سے ملتا تھا اس میں سے تقریباً بیس ہزار اسے اپنی فوجی ضروریات میں دینا پڑتا تھا۔ اور اس طرح اس کی ذاتی تنخواہ دس ہزار روپے ماہانہ سے کچھ زیادہ رہ جاتی تھی پتہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۸) (عبدالحمید) آصف خاں اور مظفر خاں کی طرح ”الیات“ کا ماہر سمجھا جاتا تھا اور ایک عرصے تک وزیر مال رہا۔ اگرچہ اس کے عہد وزارت میں محکمے کے لوگ یا رعایا خوش نہیں رہی لیکن وہ سالہ ”بندوبست“ کے قواعد و ضوابط اسی کی وزارت میں نافذ ہوئے اور اس لیے ”دستورال“ بعض اوقات اسی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

(یہاں یہ بیان کرنا مناسب ہے کہ صاحب مائثر الامرانے ٹوڈرل کو ”لاہوری“ لکھا ہے (جلد دوم ص ۱۲۳) لیکن یہ شاید کتب کی غلطی ہے کیونکہ حال کی تحقیقات سے اس کی پیدائش لاہور (او دھ) کی ثابت ہوئی، جو آئین ترجمہ آئین صفحہ ۶۲۰)

۱۔ ترجمہ آئین صفحہ ۲۴۱۔ اسی طرح فاضل تبرہم نے نوٹنے کے طور پر ترین منصبوں کا حساب پیش کیا ہے۔

(۱) بیس ہزاری (مشاہرہ جو خزانہ شاہی سے ملتا تھا) ماہانہ بیس ہزار روپیہ تنخواہ

بعد اوائے مصارف فوجی =

۱۰۶۳۷ روپے

(۲) ایک ہزاری (مشاہرہ جو خزانہ شاہی سے ملتا تھا) ماہانہ آٹھ ہزار دو سو تنخواہ

چار صدی یا اس سے زیادہ کے منصبدار طبقہ امرا میں داخل اور خان کے لقب سے ملقب ہوتے تھے مخصوص امراء کبار کو خان خانان کا لقب مل جاتا تھا۔ میرزا سرکاری طور پر صرف شاہی خاندان کے معزز افراد استعمال کر سکتے تھے اور انھیں بہ لحاظ منصب مختلف امتیازات و اختیارات دیے جاتے تھے جن کی تفصیل یہاں موجب طوالت ہوگی۔ لیکن خاص طور پر یاد رکھنے کی یہ بات ہے کہ معمولی پٹواری، منشی، محرر، سپاہ و سوار یا ان سے بھی ادنیٰ کام کرنے والوں کے سوا (اور ان کی تعداد ظاہر ہے کہ بہت کثیر تھی) ہر بادشاہی عہدہ دار کوئی نہ کوئی منصب رکھتا تھا اور بادشاہ محض اپنی رائے اور پسند سے جو کام مناسب جانتا وہ اسے تفویض کر دیتا تھا۔ طبقہ علی کے منصب دار عموماً صوبے یا اضلاع کی حکومتوں پر مقرر کئے جاتے اور چھوٹے چھوٹے علاقے یا پرگنہ بھی اکثر انھیں بطریق جاگیر دے دیے جاتے تھے کہ اس کا انتظام رکھیں اور مالگزاری وصول کریں۔ اس میں انھیں عام ملی قوانین کی پابندی کرنی پڑتی تھی یعنی گواہی مقررہ فوجی جمعیت کی تنخواہیں اور مصارف غالباً وہ اسی مالگزاری سے وصول کر لیتے تھے مگر یہ لازمی نہ تھا کہ یہ پرگنہ ان کی ذاتی یا موروثی جاگیر ہوں یا وہ مالگزاری کو جس طرح چاہیں وصول و خرچ کریں۔ بلکہ درحقیقت وہ شاہی لازم کی حیثیت رکھتے تھے اور خود انھیں تنخواہ خزانے سے نقد دی جاتی تھی ۴

طای عہدے -
صوبہ دار

انتظامی عہدہ داروں میں سب سے اول صوبے کا حاکم ہے جسے عہد اکبری میں سپہ سالار کا لقب دیا گیا تھا مگر یہ (غالباً ابو الفضل کی فنیانہ) جدت قبول عام نہ پاکی اور چھوٹے دن بعد اسے "ناظم" "نواب" "صوبہ دار" ہی کہنے لگے "نواب" جس کی معنی میں عجیب وسعت پیدا ہو گئی ہے نائب کی جمع ہے صوبہ دار پر "نواب" کا صیغہ واحد میں استعمال کرنا بالکل موزوں تھا کیونکہ یہ عہدہ دار واقعی اپنے مقام پر بادشاہ کی بجائے کام کرتا تھا اور صوبے کے اندرونی معاملات میں اسے نہایت وسیع اختیار دے دیے جاتے تھے۔ لیکن یہ تاریخی بات خاص طور پر جاننے کے لائق ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے پہلے دور یا سلطنت دہلی کے زمانے میں صوبہ دار کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹) بعد اوائے مصارف فوجی - ۳۰۱۵ روپے

(۳) ایک صدی یا نو باغی (مشاہیر و معزز شاہی سے متعلقہ ماہان سات سو) تنخواہ

بعد اوائے مصارف فوجی - ۳۱۳ روپے

باب

عدالتی مقدمات میں بہت کم اور انتظامی جنگی نیز مالی معاملات میں بہت زیادہ دخل ہوتا تھا۔ شیر شاہ نے مالگزاری کے جو قواعد و ضوابط نافذ کیے ان سے قدرتی طور پر صوبہ داروں کے مالی اختیارات محدود ہو گئے اور یہی صورت مغلوں کے زمانے میں رہی جس سے نظم و نسق میں ایک قسم کی یکسانی کے علاوہ رعایا کا ایک حد تک براہ راست بادشاہ سے تعلق پیدا ہو گیا۔ مگر اسی کے ساتھ اکبر کے زمانے میں قاضیوں اور مفتیوں کی جو ناقداری ہوئی اس نے منحل صوبہ داروں کا عدالتی تنازعات میں دخل بہت بڑھا دیا اور چونکہ اسلامی فقہ کے سوا اور کوئی مجموعہ قوانین ملک میں موجود نہ تھا اور یہ صوبہ دار اسلامی فقہ سے واقف نہ ہوتے تھے اس لیے اکثر اپنی عقل و رائے سے مقدموں کا فیصلہ کرتے تھے اور اس طریقے میں دو بڑی خرابیاں یہ تھیں کہ اول تو لوگوں کے سامنے جرائم کی نوعیت اور ان کے باہمی فرق کا کوئی قابل اطمینان معیار باقی نہیں رہتا تھا اور دوسرے یہ کہ حاکم کی ذات سے لوگ بہت خائف و مرعوب رہنے لگتے تھے جس سے اس کی مطلق العنانی کو اور تقویت پہنچتی تھی۔

ل
فوجدار

صوبہ دار کے علاوہ مختلف اضلاع یا چند پرگنوں کے انتظام کے واسطے ”فوجدار“ بھی بادشاہ کی جانب سے مقرر ہوتے تھے جنہیں آج کل کی اصطلاح میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کہنا غلط نہ ہوگا۔ صوبہ داروں کی طرح ان کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ یہ سرکش زمینداروں یا دیہاتی گروہوں سے جبراً قانون کی پابندی کرائیں مگر حق یہ ہے کہ اس زمانے کے منفصل قواعد و ضوابط کے مقابلے میں ان عہدہ داروں کے فرائض و مدارج کو آئین اکبری میں ایسے طریقے سے بیان کیا ہے کہ بہت سی ضروری جزئیات کے متعلق ہم کوئی یقینی بات نہیں کہہ سکتے۔^۱ مقدمات کا فیصلہ قدیم رواج کے موافق گاؤں کی پنچائیتیں کرتی تھیں اور شہر و قلعہات نیز چھاؤنیوں میں سرکاری عدالتیں قائم کی جاتی تھیں جن میں قاضی تحقیقات کرتا اور فیصلہ سنا تا تھا اور غالباً یہ عہد اکبری کا قانون ہے کہ ان فیصلوں کا نفاذ ایک دوسرے عہدہ دار ”میرہل“ سے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ہندوؤں کی اندرونی نزاعات میں پنڈتوں کی رائے کو فیصلہ

۱۔ ان انتظامی اور نیز مالی عہدہ داروں کے متعلق دیکھو آئین اکبری صفحات ۲۸۰ تا ۲۸۹۔ انگریزی ترجمہ

(از جبرٹ) جلد دوم صفحات ۳۷ تا ۵۵

۲۔ آئین اکبری صفحہ ۲۸۳

ل
عدالت کو تو الی

مانی جاتی تھی۔ اور ان صدر عدالتوں کے علاوہ دیوانی اور مال کے اکثر مقدمات کا منصف اور عامل یا عمل گزار (یعنی کلکٹر فیصلہ کرتے تھے جن کا مرافعہ قاضی کی عدالت میں ہو سکتا تھا) اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ بعض جرائم (جیسے چوری، جلا سازی، استحصال بالبحر، کے انداد کے لئے کو تو ال شہر کو تفتیش کے علاوہ سزا کا بھی کسی قدر اختیار تھا لیکن اس کی اصلی خدمت شہر میں حاصل تجارت کی وصولی مجرمین کی کفایت و سزا دہانی اور عام امن و انظام قائم رکھنا ہی سمجھی چاہئے اور وہیات میں یہی کام تھا نہ دار انجام دیتے تھے اور ان کی عام نگرانی عاتقوں کے ذمے تھی۔ واضح رہے کہ ان عہدہ داروں کی ماتحت جمعیت (یا پولس فورس) کی حیثیت ایک بقاعدہ فوج کی سی ہوتی تھی اور ابو الفضل نے جس ”سیاہ زمیندار“ کی کل تعداد چوبیس لاکھ سے بھی کچھ زیادہ بتائی ہے وہ اسی قسم کے بے قاعدہ اور نیم مسلح پیادہ سوار ہوتے تھے جنہیں بوقت ضرورت فراہم کر کے اس زمانے کی اصطلاح میں ”جنگی پولس“ یا ”شذرارہ“ کا کام لیا جاسکتا تھا۔

✓
فوج باقاعدہ

باقاعدہ فوج کی جو ہر وقت فوجی چھاونیوں میں رہتی تھی، صحیح تعداد کسی مورخ نے نہیں لکھی اور غالباً وہ مستقل طور پر کبھی معین نہیں کی گئی۔ لیکن منصبداروں کی جدول پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً ایک لاکھ سوار ان کے ماتحت تھے جنہیں خزانہ شاہی سے تنخواہ ملتی تھی اور خاص بادشاہ کے ماتحت بارہ ہزار بندو قبی اور تیرا اندازہ شمشیر باز پیادوں کی تعداد کثیر کے علاوہ چند ہزار اسی سواروں کی بھی ایک فوج لازم تھی جو منصبدار (یا فوجی سردار) نہ تھے مگر پانچ پانچ گھوڑے رکھتے اور نہایت مغز سپاہی سمجھے جاتے تھے چنانچہ ان میں سے اکثر پانچ سو روپے ہینہ تنخواہ پاتے تھے۔

✓
ایسی بندوق
دو تپ

اکبر کو ہاتھیوں کا اور اپنے باپ دادا کی طرح جدید تاشی اسلحہ کا نہایت شوق تھا، اور شاہی فیل خانے میں پانچ ہزار سے زیادہ ہاتھی جمع ہو گئے تھے۔ توپوں اور بندوقوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکتی لیکن آئین اکبری میں لکھا ہے کہ صاف کرنے پچھلانے اور طرح طرح کی توپ و بندوق ڈھالنے کے حالات پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بیچکی صنعت جسے شمالی ہند میں بابر نے

۱۔ آئین اکبری صفحہ ۷۵، ۷۶

۲۔ آئین اکبری میں صرف صوبہ بنگالہ کے حالات میں لکھا ہے کہ مقامی فوج کے پاس چار ہزار و سوساٹھ توپیں تھیں (صفحہ ۳۹۳) اور اس سے ہم کثرت توپ کا قیاس کر سکتے ہیں۔

رواج دیا تھا عہد اکبری میں حیرت انگیز تر ترقی کر گئی تھی اور بڑی بڑی توپوں سے جنھیں کھینچنے کے لیے کئی کئی ہاتھی اور ہزاروں بیل لگائے جاتے تھے سات من وزن تک کا گولہ چلایا جاسکتا تھا۔
یہ اطلاع بظاہر ناقابل یقین نظر آتی ہے کیونکہ آج کل بھی درآں مالیکہ دور گولہ پھینکنے اور آتش باری میں توپوں کو بہت ترقی دی گئی ہے۔ بہت کم بڑی توپیں ایسی ہوں گی جو اتنے وزن کا گولہ پھینک سکیں۔ اسی طرح یہ ایجا بھی جسے ابو الفضل "کاراگاہی کشور خدیو" کا نتیجہ بتاتا ہے قابل حیرت ہے کہ عہد اکبری کی نئی بندوقیں بے قیلہ آتش "صرف گولہ اگراٹنے سے چل جاتی تھیں۔ مگر تعجب ہے کہ مختلف قسم کی اصلاح یافتہ بندوقوں کے ذکر میں ابو الفضل "دو نالی بندوق کے متعلق کچھ نہیں لکھتا حالانکہ ہم نقسین کے ساتھ معلوم ہے کہ جنگ چوسہ (۱۵۴۰ء) کے وقت ہی ہمایوں بادشاہ کے پاس ایسی بندوق موجود تھی۔

ہماری مذکورہ بالا معلومات زیادہ تر آئین اکبری سے ماخوذ ہے اور گجیدہ ضرویات تلخی کے اعتبار سے یہ کتاب انتظامی اور فوجی محکموں کے حالات بیان کرنے میں کسی قدر ناکافی نظر آتی ہے تاہم اس نے عہد اکبری کے مالی انتظامات کو جس تفصیل و اہتمام کے ساتھ تحریر کیا ہے اس کی مثال فارسی زبان کی اور کسی تاریخی کتاب میں نہیں ملتی۔ ان آئین کے متعلق یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ وہ شیر شاہی آئین کا نقش ثانی تھے اور ہر چند اس کے حاشیہ نشینوں میں

✓ مالیات۔
شیر شاہی آئین

۱۔ آئین اکبری، صفحہ ۱۲۴۔ اصل کتاب میں بارہ من لکھا ہے لیکن اکبری سن، مسٹر مورلینڈ کی تازہ ترین تحقیقات کے بموجب آج کل کے (۱۵۶۰ء پونڈ ۷) ۲۵ سیر کے قریب وزن رکھتا تھا (انڈیا ایٹ دی ڈیٹھ اوٹ اکبر" صفحہ ۵۳) جس کے حساب سے ابو الفضل کے "دوازدہ من" ہمارے سات سات کے برابر ہوں گے۔
۲۔ دسویں صدی ہجری میں یورپ میں بھی اس قسم کی بندوقیں بننے لگی تھیں جن میں سنگ چقاق کے گھوڑے لگائے جاتے تھے کہ بندوق چلانے میں آگ دکھانے کی ضرورت نہ پڑے۔ لیکن ان کا عام رواج نہیں ہوا تھا (انسائی کلو جلد دوم صفحہ ۵۹۰) اور اس قسم کی کوئی شہادت یا قرینہ ہمارے سامنے موجود نہیں کہ ہم اس ایجا کو ہندوستان میں اہل یورپ کا آور وہ خیال کریں۔

۳۔ یہ صاحب تذکرۃ الواقات "ہستہ چوہ کی روایت ہے جو ہمایوں کا "آفتابچی" اور غلوت و جلوت میں اس کے پاس رہتا تھا۔ وہ نہایت معتبر راوی مانا جاتا ہے اور اس کی کتاب میں ہمایوں کی ذاتی سوانح اور حالات کی بہت سی جزئیات محفوظ ہیں (دیکھو ترجمہ ایٹ جلد پنجم صفحات ۱۳۷ و ۱۴۲)۔

کوئی ابو الغفل جیسا منشی نہ تھا کہ آئین اکبری سے پہلے "آئین شیر شاہی" یا دو گار چوڑا جاتا یا اس عہد اجمالی طور پر ہم کو اتنا معلوم ہے کہ سب سے اول اسی افغان بادشاہ نے شمالی ہند کے تمام دیہات کی یکساں اصول پر پائش اور تخفیف کرائی یعنی ہر مزدور زمین کی حیثیت و پیداوار کے مطابق اس پر مالیہ لگایا جو زیادہ سے زیادہ کل پیداوار کا ایک چوتھائی ہوتا تھا۔ اس انتظام کے لیے معمولی پٹواری، کارکن، قانون گو اور مال کے ملاوہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی نے چند "پرگنوں" کو ملا کر ایک "سرکار" کے تحت کر دیا تاکہ سرکار کے اعلیٰ عہدہ دار سر مشرے مالگذاہری کے چھوٹے ملازمین پر نگرانی رکھ سکیں اور ان کے مقامی اختلافات یا اغلاط کا بادشاہ یا صوبہ دار کی بجائے قریب کے قریب ایک مالی عہدہ دار فیصلہ کر دیا کرتے ہوں۔

اکبری اختلافات

عہد شیر شاہ کے پرگنوں اور سرکاروں کی صحیح تعداد اور کل مالگذاہری ہمیں معلوم نہیں اور اس کے بند و بست کے عملی نتائج میں سے صرف یہ دلچسپ اطلاع محفوظ رہ گئی ہے کہ اس کی سلطنت میں ایک لاکھ تیرہ ہزار دیہات تھے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں نظر آتا کہ عہد اکبری میں انہی اصول و قواعد کو اختیار کر کے رفتہ رفتہ زیادہ واضح اور مفصل بنالیا گیا تھا اور ان کے نفاذ کے عملی نتائج آئین اکبری جلد اول کے تیسرے دفتر میں کافی شرح و بسط کے ساتھ ابو الغفل نے قلم بند کر دیئے ہیں۔

اس تمام معلومات کا ضروری خلاصہ یہ ہے کہ صرف شمالی ہند کے ان بارہ صوبوں میں جن کے نام اور مقام پچھلے نقشے میں ہم پڑھ چکے ہیں ایک سو پانچ سرکاری یا اضلاع تھے اور ہر سرکار کو بالادست پچیس پچیس پرگنوں یا محالات میں تقسیم کر دیا جاتا تھا جن کے لئے آج کل تحصیل یا تعلقے کی اصطلاح رائج ہو گئی ہے۔ مگر عہد اکبری کی سرکاری اس زمانے کے (انگریزی) اضلاع سے رقبے میں بڑی اور پر گنے آج کل کی تحصیلوں سے چھوٹے ہوتے تھے اور مذکورہ بالا بارہ صوبوں یا ایک سو پانچ سرکاروں میں ایسے پرگنوں کی کل تعداد دو ہزار سات سو تیس تھی۔

اول اول عہد اکبری میں عبدالمجید آصف خاں وزیر نے نو زدہ سالہ

عہدہ دار

بند و بست کے قواعد تیار کیے تھے لیکن اس میں بہت سی خامیاں تھیں اور صیغہ مالگزاری کی اصلی اصلاح منظرِ خال (ترتبی) نے کی جو ۱۹۰۳ء میں خطابِ حتمی الملکی سے سرفراز ہوا۔
 وزیرِ اعلیٰ اور چار دیگر ہندوستان بیدارِ کشن تقویٰ نے ۱۹۰۳ء میں یہ خدمت راجہ ٹوڈر مل اور خواجہ شاہ منصور وزیر کے سپرد ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں انہوں نے اس
 ۱۵ سالہ بند و بست کی تکمیل کر دی جو وقتی ترتیم اور اصلاح کے بعد اصولاً آج تک ہندوستان
 میں نافذ ہے ۴

اس بند و بست میں ہر کھیت کی باقاعدہ پیمائش کے بعد اس کی اوسط پیداوار کے مطابق
 ایک حیثیت قرار دے کر سرکاری مالگزاری معین کی جاتی تھی۔ لیکن قانون گوہر فصل کی حالت کا
 معائنہ کر کے ”خسر و گرد آوری“ علیحدہ مرتب کرتا تھا اور ”تیک چ“ کی تصدیق کے بعد
 اسی فصلی اطلاع کے مطابق کاشتکاروں سے مالیہ وصول کیا جاتا تھا۔ یہ ”تیک چ“ جسے آج کل کی
 اصطلاح میں تحصیلدار سمجھنا چاہئے، نیا (ترکی) نام ہے اور پہلے کی تاریخوں میں نظر نہیں آتا
 بہت ممکن ہے کہ عامل یا عمل گزار (کلکٹر) کی امداد کے لیے عہد اکبری میں یہ نیا عہدہ
 بڑھایا گیا ہو مگر ابوالفضل نے اس کی کوئی صراحت نہیں کی اور شبہ ہوتا ہے کہ کہیں اسی نے محض اپنی
 نشانہ جدت سے کسی پرانے عہدے کا نام بدل کر یہ نئی اصطلاح بنیادی ہو یا بہر حال
 ہر سرکاری شخص و وصول مالگزاری کا اصلی ذمہ دار عامل یا عمل گزار ہوتا تھا اور جیسا کہ اشارۃً
 ہم اوپر لکھ چکے ہیں اسے بعض انتظامی اختیارات بھی دے دیئے جاتے تھے اور خزانے کا علیحدہ
 دفتر بھی اس کی نگرانی میں رہتا تھا ۵

مل مالگزاری

اس ۱۵ سالہ بند و بست کے بعد سرکاری طور پر شمالی ہند (اور کابل) کے بارہ صوبوں کی
 کل مالگزاری کوئی پونے چار ارب دام یا نو کروڑ روپے سے کچھ زیادہ قرار پائی تھی اور زراعت
 و آبادی کی ترقی، نظم و نسق کی اصلاح اور خوبی نیز وکن کی فتوحات سے اس میں بتدریج اضافہ
 ہوتا گیا تھا جس کے متعلق محل میں بڑی موٹگافیاں کی گئی ہیں اور امید ہے اس بارے میں
 آگے چل کر ہمیں بھی کچھ لکھنے کا موقع ملے گا۔ لیکن سب سے مقدم اور ضروری بات یہ ہے کہ
 ہم اس زمانے کے روپے کی اصلی قیمت کا صحیح اندازہ کریں تاکہ یہ بھی معلوم ہو جس اے کے

باب

شکلا اور اسکی قیمت خرید

عام فراغت
و مودگی

اس وقت کا ایک کروڑ لاکھ ہارے کہتے کرور کے مساوی ہوتا تھا!

یوں تو اکبر کے عہد میں بائیس سو تیس قسم کی اشرفیاں اور چاندی اور تانبے کے متعدد دیسے رائج کئے گئے تھے جن پر دھبے اشعار اور طرح طرح کے نقش و نگار کندہ کئے جاتے تھے اور مجموعی طور پر یہ صنعت نمایاں ترقی کر گئی تھی۔ لیکن سکے کی اصلاح کا اصلی بانی شہیر شاہ افغان ہے جس نے دور لامرکزیت کی بے شمار خرابیوں کو دور کر کے تمام شمالی ہندوستان میں معدنی قیمت کے مناسب چاندی اور تانبے کے سکے کی قیمت مقرر کی اور وہ ”روپیہ“ اور ”دھم“ یا ”پیسہ“ رائج کیا جن کے نام کو اکبر کی زبردستی بھی لوگوں سے ترک نہ کر سکی۔ چنانچہ اکبر کا جلالہ یعنی روپیہ اور اس کی ذریات (درب = اٹھتی چرن = چوٹی، پانڈو = ۱/۲ روپیہ، اٹھٹ = دو ٹوٹی وغیرہ) کے اب کوئی نام بھی نہیں جانتا مگر شہیر شاہ کا ”روپیہ“ تاحال سلامت ہے۔ یہ روپیہ موجودہ روپے ہی کے برابر ساڑھے گیارہ ماشے کا ہوتا تھا اور اس زمانے میں چاندی اور تانبے کی قیمت کا باہمی تناسب بھی (ایک تولہ چاندی = ۲۵۶ تولہ تانبا) قریب قریب وہی تھا جو آج کل ہے چنانچہ گو اس وقت روپے کے چالیس دھم یا پیسے ملتے تھے مگر وہ پیسہ موجودہ پیسے سے وزن میں کچھ زیادہ ہوتا تھا۔ البتہ چاندی کی افراط کی وجہ سے آج کل سونے کے مقابلے میں اس کی قیمت سو لموں صدی بیسوی کی نسبت تقریباً ایک تہائی رہ گئی ہے۔

بائیں ہمہ جب ہم پڑھتے ہیں کہ اس وقت میں فی روپیہ تقریباً دو سو گھنوں تین تین سو اور چھ پنڈرہ بیس سیر ترکاری پنڈرہ سیر عمدہ گوشت گو سفند، آٹھ سیر گھی، من بھسہ دودھ، ۶ سیر مہری، سیر قند سفید اور قریب قریب اسی ارزانی کی مناسبت سے کابل و کشمیر کے خشک و تر میوے مل جاتے تھے تو پھر مورلینڈ کا یہ قول بھی صحیح نہیں نظر آتا کہ سو لموں صدی بیسوی کے اخیر کا ایک روپیہ ۱۹۱۲ء کے سات روپے کے مساوی ہوتا تھا۔ کم سے کم اب ۱۹۲۱ء میں تو

ملا آئین اکبری کے علاوہ سکے اور اس کی قیمت وغیرہ کا صحیح اندازہ کر سنے میں ہم نے ڈیور ڈیٹا سس کی قابل تحسین تحقیقات سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے (دیکھئے صفحات ۲۰۴ تا ۲۱۰) اور مورلینڈ کی مٹازہ کتاب ”انڈیا ایٹ دی ڈیٹھ اوٹ اکبر“ بھی پیش نظر ہے۔

علا ”انڈیا... اوٹ اکبر“ صفحہ ۵۶۔ مورلینڈ صاحب کا یہ کہنا کہ ہندوستان میں اس وقت سفید شکر یا بوزے کے سوا آج کل کا سا سفند نہ ہوتا تھا ایسی طفلانہ واقفیت کا ثبوت ہے جو شاید صرف انگریز ”محققین“ کی

(انگریزی) روپے کی قوت خرید اکبری روپے کا ایک تیرھواں حصہ رہ گئی ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ اکبری کو کروڑ روپے مالگزاری آج کل کے حساب سے تقریباً سو ارب روپیہ یعنی اس زمانے کے تمام انگریزی علاقہ ہند کی (ذری) مالگزاری سے کم از کم تین گنی تھی حالانکہ یہ انگریزی علاقہ اکبری کے دو اڑوہ صوبوں سے رقبے اور آبادی میں کہیں زیادہ ہے اور مزدور زمین کا رقبہ بھی پہلے کی نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ لیکن یہ ملک جو پہلے دولتندی میں ضرب المثل تھا اب افلاس و محتاجی میں شہرہ آفاق ہے چنانچہ یہاں والوں کی محنت کا روپیہ نہیں رہنے کی بدولت اس وقت عام کسان بھی اتنے خوشحال تھے کہ شہر شاہ نے سرکاری مالگزاری کی شرح اپسیدوار کا ایک ربع اور اکبری وزیرالے زیادہ سے زیادہ ایک ثلث قرار دی تھی اور آج کل اس شرح کی تین چوتھائی رقم بھی سرکار وصول نہیں کر سکتی بلکہ جو کچھ وصول کرتی اس کی نسبت بھی شکایت ہوتی ہے کہ اس نے کسانوں کو نہایت نادار کر دیا ہے۔

تیسری فصل - مذاہب اور علوم

اکبری حکومت کا بیشتر زمانہ سولہویں صدی عیسوی میں گزرا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کو آباد ہونے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ اور مسلمانوں اور ہندوؤں کی باہمی بود و باش سے ایک دوسرے کے مذہبی خیالات و رسم و رواج پر بھی کسی قدر اثر پہنچا تھا ہندوؤں میں برہمنی تعلیم کے اس جوش و خروش میں اب فرق آچلا تھا جو راجہ ہرش کے عہد حکومت میں تھا کہ کیر اور نالنگ کے ماننے والے اب جن باتوں کی تعلیم ملک میں پھیلاتے تھے وہ اسلامی عقائد کے کسی قدر شباب تھیں۔ اسلامی اثر کے پھیلنے میں کسی قدر آسانی اس وجہ سے بھی ہوتی رہی کہ ہندو مذہب اپنے اہل مدارج میں ایک قسم کا ذہنی فلسفہ تھا جو ہر خاص و عام کی ضروریات کو ایک ہی طریقہ پر اس طرح آسانی سے رفع نہیں کر سکتا تھا جیسے کہ ایک

دبقیہ حاشیہ صفحہ ۷۶، تحریر یہی میں نظر آئے گی۔ غریب یورپ کو تو لفظ ”شوگر“ بھی اہل مشرق سے بولنا سکھایا ہے مگر مورینڈ صاحب کو یقیناً اس بات کا گمان بھی نہ ہوگا کہ نصف صدی پہلے سک شمالی ہندوستان میں جو قند و مہری عام طور پر بنائی جاتی تھی وہ شیرینی اور خالص ہونے کے اعتبار سے آج کل کی دلائی قند (شوگر) سے کہیں بہتر و اعلیٰ ہوتی تھی۔ مذکورہ بالا تاریخ اجناس کے لئے دیکھو آئین اکبری صفحہ ۶۰ وغیرہ۔
۷۱ یہ فصل صفحہ ۱۲۱ ایک مولوی عنایت اللہ صاحب سابق ناظم دارالترجمہ نے تحریر فرمائی ہے۔

تبلیغی مذہب کر سکتا ہے۔ اسلام کی مثل وہ غیر مذہب والوں کی دعوت نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے ضرور تھا کہ اسلامی حقایق کی اشاعت میں مسلمان و اخطوں کی کوششیں سرسبز ہوتی رہیں۔ اور علاوہ ایسے لوگوں کے جو دائرہ اسلام میں آچکے تھے ہندوؤں کے بعض گروہوں کے معتقدات پر بھی اسلام کا اثر پہنچے۔ مگر اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے عقائد پر بھی ہندوؤں کے اخلاق و رسم و رواج کا اثر اس طرح نظر آیا کہ جہاں کہیں داعیان اسلام کی تعلیم نو مسلموں میں کسی وجہ سے ناتمام رہی وہاں قدیم مذہب کے آثار کسی قدر باقی رہ گئے اور چونکہ مسلمان خواہ باہر کے ہوں خواہ اسی ملک کے نو مسلم ہوں سب ایک جگہ ملے جلتے رہتے تھے اس لئے جمیئت مجموعی ہی نظر آیا کہ مسلمانوں کے عقائد پر بھی ہندو مذہب ایک حد تک اپنا اثر کر رہا ہے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ جہاں کہیں مسلمانوں نے ہندوؤں کے علوم و مذاہب سے علمی واقفیت پیدا کرنی چاہی وہاں ان کے فلسفہ مذہب کی ایسی باتیں جو اسلامی عقائد سے مشابہت رکھتی تھیں قدرتی نگاہ سے دیکھی گئیں۔ بہر کیف یہ ضروری بات ہے کہ جب ایک عرصے تک ایک ہی ملک میں دو مختلف مذاہب کے لوگ دوستی و آشتی کے تعلقات رکھ کر بود و باش رکھیں تو ان کے مذہبی خیالات میں ایک قسم کی آمیزش نظر آنے لگے گا۔

لیکن علاوہ اس غلط طمطحات کے جو ہندو مسلمانوں کے تعلقات نے اس ملک میں پیدا کر رکھی تھی ان ملکوں میں جو بہت عرصے سے خصوصیت کے ساتھ اسلامی تھے خود مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ اسلام اپنے وطن سے جس سادہ اور نورانی شکل میں توحید و اعمال حسنہ کی تعلیم دینے نکلا تھا گواس کی تعلیم میں نہ کبھی فرق آیا ہے اور نہ آئے گا لیکن جب اسلامی فتوحات نے مسلمانوں کو ایشیا کے شایستہ ترین ملکوں میں آباد کر دیا تو ان کو دین کی اشاعت کے لیے بہت سے ایسے پرانے مذہبوں کی چھان بین کا موقع ملا جو ایک زمانے سے علوم عقلیہ بالخصوص فلسفہ یونان سے متاثر چلے آتے تھے۔ پانچویں مسلمانوں کو بھی ان علوم کی طرف توجہ ہوئی۔ اس سے قبل کسی قدر اصولی اختلافات پر چند مشہور فرقے مثلاً شیعہ۔ خارجی۔ سنی۔ مسلمانوں میں قائم ہو چکے تھے اور فردعی اختلافات نے ان میں سے ہر ایک کو خاص خاص فرقوں و جماعتوں میں منقسم کر دیا تھا لیکن جب یونان کے فلسفہ کا رواج مسلمانوں میں ہوا تو اختلافات بڑھ کر فرقوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو گیا۔ اور جن اہل تصوف کے عقائد میں فلسفہ کا دخل تھا ان میں اختلافات نے اپنا رنگ جمایا۔ مسئلہ وحدت وجود کے پردے میں شاعروں اور آزاد خیال لوگوں نے

ایسے خیالات ظاہر کیے جو طحانہ سمجھے گئے۔ ایک زمانہ آیا کہ ہمدویت کی تحریک نے زور پکڑا اور پرانی پیشین گوئیوں کے اعتقاد پر کسی نے خفیہ اور کسی نے علانیہ ہمدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔ چونکہ ان پرانے اسلامی ملکوں سے ہندوستان میں مسلمانوں کی ہمیشہ آمد و رفت رہتی تھی۔ اس لئے جو مختلف فرقے اور عقائد وہاں پیدا ہوئے وہی یہاں بھی پیدا ہو گئے۔

اکبر کا زمانہ جب آیا تو مسئلہ وحدت وجود کے ماننے والے اس ملک میں بکثرت موجود تھے ہمدویت کی تحریک نے بھی ملک میں ہل چل ڈال رکھی تھی۔ سلیم شاہ سوری کے زمانے میں ہمدویت کے زبردست حامی شیخ علانی کا دور دورہ رہ چکا تھا۔ یہ سید محمد جونپوری کے خلفاء میں سے تھے۔ سید محمد جونپوری اپنی علمی قابلیت ذاتی اوصاف اور فصاحت بیان کی وجہ سے قابل ذکر ہیں۔ ہزاروں آدمی ان کے گرویدہ ہو گئے۔ ہمدویت کی تحریک سے ان کا مطلب صرف یہ تھا کہ دین کے بارے میں جو اختلافات اور فاسد خیالات پیدا ہو گئے ہیں ان کی کسی طرح اصلاح کی جائے۔ شیخ علانی نے اس خدمت کے انجام دینے میں ایسی سختی کی کہ سنی علماء ان کے دشمن ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلیم شاہ سوری نے ۹۵۵ھ میں شیخ علانی کو قتل کر دیا۔

خلاصہ یہ کہ دور اکبری جس وقت شروع ہوا ہے تو اس ملک میں مختلف اسلامی وغیر اسلامی فرقوں کے معرکے گرم تھے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ بادشاہ وقت کو ہر ایک فرقے کے عقائد کی تحقیق و تفتیش کا شوق فطری طور سے تھا جس نے بعض مورخوں کی نظروں میں مذہبی اعتبار سے اس ملک میں ایک طوفان بے تمیزی برپا کر دیا۔

اکبر کی تخت نشینی پر سلطنت کا کل انتظام اس کے آئینہ بیروں کے سپرد تھا۔ جب یہ عز و دل ہوا تو پھر انہی اہل دربار کا اقتدار بڑھا جنہوں نے سلیم شاہ سوری کے زمانے میں شیخ علانی کو ہمدویت کے الزام میں قتل کرایا تھا اب پھر ہمدوی فرقے کے لوگوں پر سختیاں شروع ہوئیں۔ اور انہی سختیوں کا شکار اب ایک ایسا شخص ہوا جس کی اولاد کو آئندہ اکبر کے دربار سے بہت قریب کا تعلق ہونے والا ہے۔ یہ مشہور صاحب علم فضل شیخ مبارک بن خضر تھا۔ شمالی راجپوتانہ کے شہر ناگور میں پیدا ہوا تھا۔ اور کچھ عرصے سے دار الحکومت آگرہ میں سکونت پذیر تھا۔ علمائے دربار کو اس کی طرف سے ہمدویت کا شبہ ہوا۔ بادشاہ سے شکایت کی گئی اور شیخ مبارک جان کے خوف سے آگرہ سے فرار ہوا۔ تلک دستی و مصیبت میں

جستلا ہو کر برسوں خانہ بر باد رہا۔ آخر کار بادشاہ کے ایک عزیز کی سفارش سے یہ بدگمانی رفع ہوئی اور اس کے دو فرزند ابوالفیض فیضی اور ابوالفضل آئندہ اکبر کے دربار کے نامی گرامی شاعر اور ندیم ہوئے۔

ابوالفیض فیضی شاعری میں یکتائے روزگار مانا گیا۔ اس کے قصائد غزلیں اورثنوی نعل و من فارسی کی بہترین نظموں میں شمار ہوتیں۔ قرآن مجید کی بے نقط تفسیر سواطع الالہام اس کی حیرت انگیز یادگار ہے۔ فیضی کے علم و فضل کی شہرت نے بیس اکیس برس ہی کی عمر میں اسے اکبر کے دربار تک پہنچا دیا (۹۶۶ھ)۔ اس کا چھوٹا بھائی ابوالفضل علّامی بھی علم و فضل میں بڑا تربہ رکھتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اپنے حسن لیاقت و کارگزاری سے اکبر کا مشیر خاص بن گیا اور عمدہ وزارت پر سرفراز ہوا (۹۷۵ھ)۔ جو مورخ اکبر کو لاندہب اور اسلام سے قطعاً منحرف سمجھتے ہیں ان کے خیال میں اس بادشاہ کے مذہب میں جس قدر خرابیاں پیدا ہوئیں وہ خاص کر ان ہی دو بھائیوں یعنی فرزند ان شیخ مبارک کی وجہ سے ہوئیں مگر یہاں یہ دیکھنا ہے کہ اکبر کے مذہبی خیالات کی نسبت جو اکبر کی تاریخ کا ایک اہم مضمون ہے معاصرین نے کیا رائے زنی کی ہے۔

ہندوستان کے شاہان نعل و منی المذہب تھے۔ اکبر بھی ان میں سے تھا۔ پس ان کی رعایا میں سنیوں کے جس قدر گروہ تھے وہ بادشاہ وقت کو اپنے ہی طریقے کا پابند دیکھنا پسند کرتے تھے۔ چونکہ مسلمانوں میں سلطنت ہیشہ دین کے مطابق ہونی چاہئے اس لئے مشیران دولت میں علمائے دین کا موجود ہونا ضروریات سے تھا اور چونکہ اسلامی شریعت

۱۵۹۶ء فیضی نے ۱۶۰۲ء میں وفات پائی۔ ابوالفضل شہزادہ سلیم کے اشارے سے ۱۶۰۲ء میں قتل کر دیا گیا۔ ابوالفضل کے قتل کا قصہ یہ ہے کہ خاندیس اور احمد ننگ کی فتوحات کے بعد اکبر اس کو دکن میں چھوڑ آیا تھا تاکہ وہاں کی انتظامی مشکلات کا تصفیہ کرے۔ شہزادہ سلیم کو ایک عرصے سے خیال ہو گیا تھا کہ ابوالفضل کے کہنے سننے سے باپ اس سے ناراض رہتا ہے۔ اب جس وقت وہ دکن سے واپس آئے گا تو میری اور کتیس کرے گا۔ چنانچہ جس وقت ابوالفضل دکن سے تھوڑی سی جمیت کے ساتھ آگرے واپس آنے لگا تو شہزادہ سلیم نے بندھیل کھنڈ کے ایک رئیس بیریگہ کو لکھا کہ ابوالفضل کا راستے میں کام تمام کر دے۔ چنانچہ اس رئیس نے ابوالفضل کو اسی سفر میں قتل کر دیا۔

بادشاہ سے بالاتر ہے اس لئے بادشاہ کو قابو میں رکھنا یہ علم اپنا فرض سمجھتے تھے تاکہ سلطنت کی کشتی دین کے مطابق ان کے فتوؤں سے چلائی جائے۔ وہ اپنے طریقے سے بادشاہ کا سر متجاوز کرنا ہرگز گوارہ کر سکتے تھے۔ اکبر کی طبیعت میں شروع ہی سے مذہب کے متعلق کسی نہ کسی بات کی تلاش و جستجو ضرور رہتی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ابتدا میں اس کی مذہبی تعلیم یا تو بالکل ہی نہیں ہوئی تھی یا اگر ہوئی تھی تو وہ ایسے طرز کی نہ تھی کہ آئندہ کسی وقت میں غیروں کے عقائد میں کر اس کی طبیعت متاثر نہ ہوتی۔ اسی عدم تعلیم یا تعلیم کی خاص نوعیت یا طبیعت کے ایک خاص رنگ نے جو پیدائشی تھا اس میں تحقیق مذہب کا شوق ایسا بڑھایا کہ وہ اپنی حد سے گزر گیا۔ اور حالت یہ ہوئی کہ نہ صرف مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے عقائد کی چھان بین میں مصروف ہوا بلکہ غیر مسلموں کے عقائد کی طرف بھی متوجہ ہوا اور ان میں بہت سی خوبیاں مان کر ان پر عمل کرنے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ جو رعایا بادشاہ وقت کو شروع میں اپنا ہم مذہب سمجھتی تھی وہ اس سے بدگمان ہونے لگی۔ اپنوں سے تغافل اور غیروں پر لطف ہی شکایت کے لئے کچھ کم نہ تھا۔ چہ جائیکہ غیروں کے مذاہب سے ان کی باتوں کا انتخاب و انتقاط کر کے ان پر یقین ظاہر کرنا اور اپنے علماء کے اثر و قابو سے باہر ہو کر ان کو انھیں دکھانی۔ غرض کہ اس طبقے کو کچھ زمانے کے بعد اکبر کے اقوال و افعال میں وہ چیزیں نظر آئے لگیں جو ان کے اعتقاد کے مطابق اس کو نہایت مسلمانانہ سے بے دین اور اسلام سے برگشتہ بلکہ اس کا دشمن ثابت کرنے کے لئے کافی تھیں۔ اس قسم کی شکایتوں اور اعتراضوں کے جمع اور آشکار کرنے والے اکبر کے دربار کے مشہور قاری و مؤرخ ملا عبد القادر بدایونی صاحب منتخب التواریخ ہیں یا یہ سمجھئے کہ اس ملک کے مورخوں میں وہی ایک خاص ذریعہ ہیں جس سے اکبر کے کفر و الحاد کی باتیں اکبر کے مرنے کے بعد دنیا پر ظاہر ہوئیں۔ ملا صاحب نے اکبر کے مذہبی خیالات کی نیرنگی و بے ثباتی اور ان کے اسباب کو نہایت شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور جو لوگ اکبر کے خیالات میں ان تبدیلیوں کا باعث ہوئے تھے ان کو کبھی کاذب و طامع کبھی ملحد و کافر کبھی بے دین و بدبخت کے جلوں سے یاد کیا ہے۔ اکبر کے آئین و قوانین نقل کر کے بتایا ہے کہ کس طرح یہ چیزیں اسلام کی توہین اور مسلمانوں کی ذلت اور نقصان جان و مال کا باعث ہوئیں۔ مگر شہنشاہ کی کل رعایا ایسی ہی راسخ العقیدہ نہ تھی۔ کثرت سے غیر مسلم قومیں اور ایسے مسلمان بھی موجود تھے جو یکساں مذاق رکھتے تھے اور مطلق العنان بادشاہوں کی خاص ضروریات کو محسوس کر کے مذہبی رواداری کو جائز سمجھتے تھے

ان لوگوں نے مذاہب غیر کے متعلق اکبر کے طرز خیال و عمل کو شاہانہ خصال کا ایک زیور سمجھا اور ایک ایسے بادشاہ کی عزت ان کے دل سے کم نہیں ہوئی جو اپنی تمام رعایا کے مروجہ مذہبوں میں کوئی نہ کوئی خوبی دیکھ کر سب کی عزت کرتا ہے اور سب کے ساتھ رواداری کا مسلک رکھتا نظر آتا ہے۔ اس طبقے کے خیالات کا ظاہر ابیدار کرنے والا اکبر کے دربار کا مشہور زندیم شیخ ابوالفضل صاحب اکبرنامہ و آئین اکبری ہے جس نے اکبر کی حمایت و تائید میں اپنی پوری لیاقت صرف کی ہے۔ اگر خیال خود دین و شریعت کی آڑ لے کر ملا عبد القادر نے اکبر پر اپنا ترکش خالی کیا ہے تو حکیمانہ شنائش کے رنگ میں ابوالفضل نے اکبر کو آسمان پر چڑھایا ہے۔ ممکن ہے کہ دونوں نے زیادتی کی ہو اور حقیقت حال کچھ اور ہی ہو۔

اکبر کا عہد حکومت ۹۷۳ھ میں شروع ہوا اور تقریباً پچاس برس رہا۔ شروع زمانے میں یعنی ۹۸۳ھ سے پہلے اکبر کے عقائد پر ان مسلمانوں کو کسی اعتراض کا موقع نہیں ملا جو اپنے ہم مذہب بادشاہ پر صورت اختلاف اعتراض کرنے کا اپنی دانست میں حق رکھتے تھے۔ البتہ ۹۸۳ھ سے ۹۸۶ھ کی مدت میں اکبر کے مذہبی خیالات نے وہ وہ رنگ پلٹے جس سے اس کی سنی رعایا نے بالعموم سمجھ لیا کہ بادشاہ اس کے طریقے کا قطعی مٹانے والا پیدا ہوا ہے۔ یہاں تک یہی حالت نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اکبر کے انتقال تک جو زمانہ تقریباً دس برس کا گزرا اس میں اس کے مذہبی خیالات کا کچھ حال نہیں کھلتا۔ کیونکہ جو مورخ علانیہ یاد پر وہ اس کے حالات قلب بند کر رہے تھے انھوں نے اپنی کتابیں اسی زمانے میں ختم کر دی تھیں اور ان کتابوں کے علاوہ پھر کوئی ذریعہ معلومات پیدا نہ ہوا۔

۱۔ یورپ کے چند پادریوں نے جو مغربی ساحل ہند پر اس وقت موجود تھے اکبر کے حالات میں کتابیں لکھی ہیں۔ اس مضمون سے ان لوگوں کو دلچسپی کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ شروع میں اکبر کو عیسائی مذہب میں شامل کر لینے کا پورا یقین رکھتے تھے۔ مگر اخیر میں ان کو بالوسی ہوئی۔ گو وہ خود سمجھتے ہیں کہ اکبر نے دربار عام میں اسلام باضابطہ طور پر ترک کیا۔ مگر یہ خیال ان کی روح کی تسکین کے لیے کافی نہ تھا۔ حال کے انگریزی مورخوں نے ان پادریوں کے بیانات کی تائید کہیں ملا عبد القادر کے بیان سے کی ہے اور کہیں ملا عبد القادر کے بیان کی تائید ان پادریوں کے کلام سے کی ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ملا عبد القادر صاحب نے جس زور قلم سے اکبر کے کفر کو بیان کیا ہے وہ عیسائی پادریوں کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ اس لیے اکبر کی زندگی کے اس پہلو کو دکھانے میں

۹۸۳ھ سے پہلے بادشاہ کو فتوحات عظیمہ پے در پے حاصل ہوئی تھیں۔ دائرہ مملکت روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ مراد کے موافق کام بر آتے تھے۔ اطمینان خاطر حاصل تھا سمجھتا تھا کہ اب جہاں میں کوئی مخالف باقی نہیں ہے۔ اکثر اوقات خدا اور رسول کے ذکر میں بسر کرتا۔ تصوف کے مسائل حکمی و فقہی پر بحثیں سنتا۔ راتوں کو عبادت الہی میں مصروف رہتا۔ خدا کی نعمتوں کے شکر میں بطریق نیاز مندی روز صبح کو ایک چوڑی سی سل پر بیٹھ کر مراقبہ کرتا۔ منعم حقیقی کی تعظیم نے اس کے دل میں جگہ پکڑ لی تھی۔ تھوڑا عرصہ ہوا تھا کہ پٹنہ کی جہم سے کامیاب واپس آ کر قصر شاہی کے باغ میں جہاں پہلے شیخ عبداللہ نیازی کا حجرہ تھا ایک عالیشان عمارت تیار کرائی تھی۔ اور اس کا نام عبادت خانہ رکھا تھا۔ غرض اس عبادت سے یہ تھی کہ عقائد اسلامیہ اور سبیل حکمیہ پر بحث کرنے کے لیے منتخب لوگ جمع ہوا کریں اور بادشاہ کی موجودگی میں بلا خوف و خطر گفتگو کریں پڑ

اس عمارت یعنی عبادت خانے میں وقتاً فوقتاً جو شخصیں اہل علم و فضل کی رہیں وہ اگر کے شوق تحقیق یا جنون تحقیق پر اچھی روشنی ڈالتی ہیں۔ ہر جمعے کی نماز کے بعد یہاں بادشاہ ایک مجلس کرتا جس میں مشائخ و علماء و سادات و چند منتخب امرا کے سوا کوئی دوسرا طلب نہ ہوتا کچھ عرصے کے بعد یہ مجلس شب جمعہ کو ہونے لگی۔ کل مکان بڑے اہتمام سے آراستہ کیا جاتا۔ بادشاہ کے شوق کا یہ حال تھا کہ تمام تمام رات مجلس میں بیٹھتا۔ شروع میں اہل مجلس جہاں جگہ پاتے تھے وہاں بیٹھ جاتے تھے۔ مگر آگے چل کر مقام نشست و تقدیم و تاخیر پر جھگڑاے کھڑے ہو گئے۔ بادشاہ نے اس قصے کو رفع کرنے کے لیے مشائخ و علماء و سادات و امرا کی نشست کے لئے عبادت خانے میں ایک ایک سمت علیحدہ مخصوص کر دی جس وقت مجلس میں سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر آ جاتے تو بادشاہ ان کی صفوں میں باری باری پھرتا اور ہر ایک جماعت سے باتیں اور مقاصد کی تحقیق کرتا پڑ

کچھ دنوں یہی حالت رہی۔ مگر پھر کسی قدر ایسے اثر بادشاہ کی طبیعت پر پڑنے لگے جو علماء کے نزدیک سنی عقائد کے مطابق نہ تھے۔ ۹۸۳ھ ہی میں گیلان سے حکیم ابو الفتح جو مذہب میں ایک آزاد خیال سادہ آدمی تھا بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنی لیاقت کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۲) ہمارے لئے لا صاحب ہی کی کتاب کافی ہے۔ اور کسی ذریعہ معلومات سے مدد لینے کی ضرورت نہیں۔

زور سے مقررین میں شامل ہوا اس کے کچھ عرصے بعد ملا محمد تیرہوی ایران سے آیا شیعہ تھلا اپنے عقیدے کے مطابق خلفائے ثلاثہ پر طعن کرتا۔ اور بادشاہ کو اپنے طریقے پر لانا چاہتا۔ اس نے بھی دربار میں رسوخ پایا۔ اسی زمانے میں بنگالی سے چند عیسائی بادشاہ کے پاس آئے جن سے بادشاہ نے عیسوی مذہب کی باتیں دریافت کیں لیکن یہ عیسائی پادری پیشہ نہ تھے اس لئے بادشاہ کے سوالات کا خاطر خواہ جواب نہ دے سکے پھر بھی جو عقائد انھوں نے بیان کئے ان میں سے بادشاہ نے جن کو اپنی عقل کے مطابق سمجھا پسند کیا۔ یہ عیسویوں میں شریف آملی ملکوں ملکوں پھر تا پھر تارنا مالوہ پہنچا یہاں ویسالی پور میں بادشاہ کا شکر پڑا تھا بہت سے ایرانی امرا عمر کاب تھے۔ شریف ان ایرانیوں میں پہنچا اور ظاہر کیا کہ میں دسویں صدی کا مجدد ہوں یعنی اسلام میں ایک ہزار برس گزرنے کی وجہ سے جس قدر خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کی اصلاح کے لئے ظاہر ہوا ہوں۔ اس کی خبر بادشاہ تک پہنچی۔ فوراً شریف طلب کیا گیا اور بادشاہ اس کی باتوں کو سن کر ایسا خوش ہوا کہ اس کو بھی اعیان دولت میں جگہ مل گئی۔ علمائے اہل سنت و جماعت میں سے عبادت خانے کی مجلسوں کے دو بڑے زبردست رکن مولنا عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی تھے مولنا عبداللہ سلیم شاہ کے وقت سے مرجع خاص و عام تھے۔ اکبر کے باپ ہمایوں نے ان کو مخدوم الملک اور شیخ الاسلام کا خطاب دیا تھا۔ اسلامی سلطنتوں میں شیخ الاسلام کے رتبے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کسی بادشاہ کا صاحب تخت و تاج ہونا نہ ہونا اسی کے فتوے پر منحصر ہوتا تھا۔ مولنا عبدالنبی بھی اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ ان کو اکبر نے ۹۷۲ھ میں صدر الصدوری کا عہدہ دیا تھا۔ صدر الصدور کے اختیارات اکبر کے زمانے میں بھی ایک عرصے تک نہایت وسیع رہے۔ ملک کے تمام قاضیوں اور میران عدل پر اس کو افسری حاصل تھی۔ بے وینوں اور اہل بدعت پر موت کا فتویٰ جاری کر سکتا تھا۔ مسلمانوں میں فقیروں یا درویشوں یا دیگر اہل استحقاق کو بادشاہ کی طرف سے جو زمینیں بطور معافی کے دی جاتی تھیں ان کی تقسیم و توفیق کے متعلق اس کو کامل اختیارات حاصل ہوتے تھے۔

جس مجمع میں بڑے بڑے صاحب فضیلت جمع ہوں اور وہاں مختلف المشرک لوگ بھی حاضر ہوں اور بحث و مناظرے کے لئے مشکل و پیچیدہ مسائل پیش ہوں اور فریقین میں ہر شخص اپنے تئیں کال فن سمجھتا ہو تو پھر حالت اختلاف میں جوش و خروش کا پیدا ہو جانا

کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ لامحالہ بحثوں میں حدت بڑھی۔ علماء نے تعارض و تقابل کی تلواریں سونت لیں اور تقریر کرنے والے جوش و خروش کے ساتھ تقریریں کرنے لگے۔ ایک مرتبہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک عالم نے دوسرے عالم کو بد بخت و ملعون کہہ کر مارنے کو عصا سنبھالا اور کچھ دور پیچھے دوڑا بھی۔ شہنشاہ کو جو ان موقعوں پر موجود رہتا تھا یہ حرکتیں ناگوار گزرنے لگیں۔ ایک مرتبہ اس کو غصہ بھی آگیا مگر ملا عبد القادر کے ایک لطیفے نے بادشاہ کے غصے کو ٹھنڈا کر دیا۔ رفتہ رفتہ شیخ عبد النبی کے خلاف سنی و شیعہ حنفی و شافعی بحث انہی حد سے گزر گئی۔ مخدوم الملک نے شیخ صاحب کی نسبت ایک رسالے میں طرح طرح کی تمہینیں لگا کر جن میں بعض ماں کے فرائض منصب صدر الصدوری سے متعلق تھیں ان کے پیچھے نمائندہ پرستی ناجائز قرار دی۔ اس پر شیخ صاحب نے مخدوم الملک کی تحویل و تفصیل کی اور اس طرح کچھ لوگ اس طرف اور کچھ لوگ اس طرف ہو کر دو مختلف گروہ بن گئے اور تنازع اس حد کو پہنچا کہ مصالحت و شواہد ہوئی غرض جب حالت یہ ہوئی کہ علماء کا ایک فریق جس بات کو حق بتائے دوسرا اس کو باطل ٹھیسے۔ اے تو بادشاہ سمجھا کہ دونوں غلطی پر ہیں چنانچہ رفتہ رفتہ وہ ان عاملوں سے بد عقیدہ ہوتا گیا اور ان کی باہمی مخالفت سے سمجھ گیا کہ جس چیز کی اس کو تلاش ہے وہ ان کی بحث و تکرار میں نہ ملے گی۔ اس فیصلے کی وجہ کسی قدر یہ بھی تھی کہ اس پر ایسے عقائد کا عمل شروع ہو گیا تھا جو اہل سنت و جماعت سے اختلاف رکھتے تھے۔ اور یہ غضب اور ہوا تھا کہ بعض مسائل کی تحقیق میں جن کے نتیجے کا اثر بادشاہ کے ذاتی افعال پر پڑتا تھا خاطر خواہ جواب نہ ملنے پر علماء کی طرف سے کدورت پیدا ہو گئی تھی۔ بادشاہ کے مقررین جن میں علماء و دین کے علاوہ امراء و ندامت بھی شامل تھے گو سب بڑے پائے کے لوگ تھے مگر آپس میں دوست نہ تھے پرانی کاوشیں دل میں بھری تھیں تاکہ ایک دوسرے کو بے دین و بد باطن

حداکثر ایک روز ملا عبد القادر سے کہا کہ آئندہ جو شخص اس جماعت میں کوئی نامعقول بات کہے تو اس کی مجھ اطلاع دی جائے میں اس شخص کو مجلس سے اٹھا دوں گا۔ ملا عبد القادر نے یہ حکم سن کر آصف خاں سے آہستہ سے کہا کہ اس طرح تو اکثر علماء مجلس سے اٹھا دیے جائیں گے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ ملا کیا کہتا ہے۔ آصف خاں نے جو کچھ سنا تعارض کیا۔ بادشاہ ملا صاحب کی بات سن کر خوش ہوا اور اس کا ذکر اپنی مجلس میں اپنے مقررین سے کیا ملا ابو الفضل کو مخدوم الملک سے کاوش تھی۔ کیونکہ انھوں نے ابو الفضل کے باپ شیخ مبارک کی شکایت

زمانہ ساز اور خوشامدی سمجھتا تھا۔ علما کی طرف سے بادشاہ کی نظریں پھری دیکھتے ہی سب نے شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک پر الزاموں کے طومار پڑھ مار باندھ دئے اور ان پر ایسا عرصہ تنگ ہوا کہ ۹۸۵ھ کے اواخر میں دونوں صاحبوں کو اکبر کے حکم سے مکہ معظمہ جانا پڑا۔ بادشاہ نے شیخ صاحب کو میر حاج مقرر کر کے کچھ روپیہ دیا کہ حرمین شریفین میں مستحقین کو تقسیم کر دیں شیخ صاحب غالباً ۹۸۵ھ میں صدر الصدوری کے عہدے سے علیحدہ ہو چکے تھے، صرف مسلمان ہی بحث کے لئے طلب کیے جاتے تھے۔ اور مسائل بھی جس قدر بحث کے لئے پیش ہوتے تھے وہ اسلامی ہوتے تھے۔ گو بادشاہ پر غیر مسلم عقائد کا اثر پڑتا جاتا تھا۔ لیکن اثر غالب ابھی تک شیعہ۔ اور فیلسوفانہ خیالات کا تھا۔ ۹۸۵ھ سے غالباً عبادت خانے کے جلسوں میں غیر مسلم بھی باریاب ہونے لگے مگر جب ان کی کثرت ہوئی اور علمائے دین اس مجمع سے کشیدگی اختیار کرنے لگے تو پھر اس قسم کے مناظرے خاص قصر شاہی یا خسدت خانے میں ہونے لگے اور عبادت خانے کی مجلسیں غالباً بند ہو گئیں۔ ہندوؤں کے رسم و رواج سے تو طبیعت کسی قدر ہمیشہ سے مانوس تھی کیونکہ محل میں ہندو لڑکیاں موجود تھیں مگر اب ہندو مذہب کے متعلق بھی بادشاہ نے برہمنوں سے سبق لینا شروع کیا۔ پھر گوتم برہمن جس نے سنگھاسن بتی کی شرح لکھی تھی اور وی برہمن کو بادشاہ سے خلوت ہونے لگی۔ یہ لوگ راتوں کو بادشاہ کی خوابگاہ کے سامنے جو فیصل سے ملی ہوئی تھی جھولے میں بیٹھے معلق حاضر رہتے۔ علاوہ ان برہمنوں کے بیان ہوا ہے کہ شیخ تاج الدین دہلوی (تاج العارفین) بھی اسی طرح بادشاہ کے پاس پہنچتے اور ایسی باتیں جو خلاف شریعت تھیں بادشاہ کو سمجھاتے۔ قرآن اور حدیث میں تاویلات کرتے۔ انھوں نے بادشاہ کو انسان کامل بنا کر اس کی ذات کو اقدس ٹھہرایا اور اس کے لیے سجدہ تجویز کیا۔ ویسی برہمن لے تے توں اور آگ اور سورج کے ساتھ اساطین مذہب ہنود یعنی برہما۔ شیو۔ اور وشنو اور ہامانی کے احترام کے طریقے سکھاتے۔ بادشاہ کو خالق کا اوتار بتایا غرض جس زمانے میں لوگ سمجھ رہے تھے کہ بادشاہ انواع و اقسام کی مذہبی تعلیم حاصل کر رہا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۵) اکبر سے اس کی ہمدویت کے بارے میں کی تھی۔ اور شیخ مبارک کو مدت تک مصیبت کی حالت میں در بدر پھرنا پڑا تھا۔

اسی زمانے میں بادشاہ کو عیسائیوں پادریوں اور جینیوں کی طرف بھی خاص توجہ ہوئی پڑ گئی۔ ان میں پرتگیزی عیسائیوں کی حکومت تھی۔ ۱۵۱۷ء میں بادشاہ نے ان کے پادریوں کو دربار میں طلب کیا۔ چنانچہ ان کی ایک جماعت دور و دراز کا سفر طے کر کے غالباً ۱۵۱۷ء میں فتح پور سیکری پہنچی۔ اکبر نے فوراً ان سے ملاقات کی اور ان کی خاطر مدارات پر ابوالفضل کو مقرر کیا۔ پادریوں نے انجیل کا ایک نسخہ جو چار زبانوں میں تھا بادشاہ کو پیش کیا۔ بادشاہ نے انجیل کی بہت تعظیم کی اور اس کو بوسہ دیا۔ شہزادہ مراد کو جس کی عمر اس وقت دس برس کی تھی انجیل کی عبارت پڑھنے کے لئے کہا۔ پادریوں کا بیان ہے کہ بادشاہ نے ان کو حکم دیا کہ شہزادے کو پرتگیزی زبان اور سچی اخلاق سکھائیں۔ پادریوں کی درخواست پر بادشاہ نے ان کو علانیہ وعظ کہنے کی اجازت دی۔ مگر وہ عیسائی مورخ لکھتے ہیں کہ یہ پرتگیزی عیسائی اس درجہ متعصب و پلید زبان رکھتے تھے کہ ایک پادری کی تقریر سن کر بادشاہ بھی ناراض ہو گیا۔ شہر کے لوگوں کا یہ حال تھا کہ اگر بادشاہ ان پادریوں کی خاص طور پر حفاظت نہ کرتا تو ان کو اپنی جان بچانی شکل ہو جاتی۔ یہ پادری سمجھتے تھے کہ اکبر کو عیسائی کر لیں گے مگر جب قطعی مایوسی ہوئی تو اپنے دل کو یہ صبر دے کر کہ عیسائی نہ ہوا تو کیا ہے مسلمان تو نہ رہا اپنے گھروں کو واپس گئے۔ اکبر نے کچھ زمانے کے بعد ان پادریوں کے تحفے اور انجیل کا نسخہ جو انھوں نے نذر دیا تھا واپس کر دیا پڑا۔

۱۵۱۹ء میں جب کہ بادشاہ کی جلوت و خلوت میں غیبِ مسلموں کا جو ہم ہو چکا تھا چند واقعات ایسے پیش آئے کہ سنی المذہب رعایا کو بالعموم اور بھی برا سمجھتی ہوئی اسی سال کے ماہ جمادی الاول میں ایک دن جیسے کو فتح پور سیکری کی جامع مسجد میں منبر پر بیٹھ کر بادشاہ نے خطبہ پڑھا۔ یہ خدمت پہلے خطیب جامع مسجد کے سپرد تھی۔ لیکن یہ سن کر کہ ائمہ ہدیٰ اور خلفائے راشدین نے اس خدمت کو اپنے ذمے رکھا تھا بادشاہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہا۔ اور منبر پر بیٹھ کر شیخ ابوالفیض (فضی) کا لکھا ہوا خطبہ جو فارسی نظم میں تھا پڑھا۔ اول تو خلاف دستور خطبہ فارسی نظم میں پڑھا اور پھر وہ بھی فضی کا لکھا ہوا جس کو مسلمانوں کا ایک خاص طبقہ لائذہب سمجھتا تھا اور ایسے بادشاہ کا پڑھنا جس کے مذہب میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہو چلے تھے مسلمانوں کو سخت ناگوار گزارا پڑا۔

اسی سنہ یعنی ۱۵۲۹ء میں ایک محضر تیار ہوا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سلطان عادل

کا مرتبہ مجتہد سے بڑھ کر ہے۔ اکبر چونکہ بڑا عادل و ماعقل و خدا ترس بادشاہ ہے اس لیے کسی مسئلے میں اگر مجتہدوں کو اختلاف ہو تو بادشاہ کا فیصلہ ناطق سمجھا جاوے۔ بشرطیکہ یہ فیصلہ احکام قرآن کے خلاف نہ ہو۔ کہتے ہیں اس محضر کا مسودہ شیخ ابوالفضل کے باپ شیخ مبارک کا لکھا ہوا تھا جس نے کئی برس پہلے سے بادشاہ کے دل میں یہ خواہش پیدا کر دی تھی کہ ریاست دینیوی کے ساتھ جو بادشاہ ہونے کی وجہ سے حاصل تھی ریاست دینی بھی اپنی ذات میں مجتمع کر لے۔ اور اس طرح مسلمانوں کے دین و دنیا دونوں کا بادی و سر دار بن جاوے۔ اس محضر کی تیاری کے وقت مخدوم الملک اور شیخ عبدالبنی مکہ منظم نہیں گئے تھے۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں نے بھی اور لوگوں کے ساتھ اس پر اپنی ہرین کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں سنی عالم اکبر میں ایسی قابلیت نہیں سمجھتے تھے کہ وہ مسلمانوں کا امام عادل بنایا جاوے۔ اس لئے ضرور کسی مجبوری سے انہوں نے اپنی ہرین کی ہوں گی۔ بہر کیف اگر یہ محضر کوئی اثر رکھتا تھا تو ان کی تصدیق سے بادشاہ کو یہ اختیار ضرور مل گیا کہ جب مجتہدین کسی مسئلے میں اختلاف کریں تو بادشاہ اپنی عقل سے گرنے قرآنی کے مطابق اس مسئلے کا فیصلہ کر دے اور اس کی تعمیل سب مسلمانوں پر فرض ہو۔ اس قسم کے اختیار کو ایسے مسلمان جو اکبر سے بدظن ہو گئے تھے اس کے ہاتھ میں دیکھنا کب پسند کر سکتے تھے؟ اسی زمانے میں بادشاہ کو زردشتیوں کے عقائد کی طرف توجہ ہوئی۔ گجرات میں شہر نوساری موبدان زردشتی کا صدر مقام تھا۔ اس وقت ماہ یارچی رانا آتش پستوں کا سب سے بڑا دستور تھا۔ غالباً ۹۱۵ھ میں یہ اکبر کے دربار میں حاضر ہوا۔ اور آتش پرستی کے رموز بادشاہ پر ظاہر کئے۔ اس کی تعلیم کا بادشاہ کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ محل شاہی میں ایک آتشکدہ بنوا کر اس میں آگ روشن کرائی۔ اور ابوالفضل کو حکم ہوا کہ آگ بجھنے نہ پائے۔ اس واقعے کے چند سال بعد کچھ تو ماہ یارچی کی تعلیم سے اور کسی قدر راجہ سیرمل کے اثر صحبت سے ہندی و زردشتی دونوں قسم کی آتش و آفتاب پرستی کو اکبر نے اپنی عبادت میں شامل کیا اس میں کسی قدر اثر ہندو دانیوں کا بھی تھا جو محل میں ہوم کی رسم ادا کیا کرتی تھیں۔ اس رسم کو بھی آتش پرستی سے تعلق تھا۔ اس کے کچھ عرصے بعد بادشاہ کو چین مت والوں کی طرف توجہ ہوئی۔ جینیوں کے گرو ہیرا رچی سورجی اور دو اور گرو گجرات سے پیادہ پا بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بادشاہ کو جیورکشا کے بہت سے سبق پڑھائے۔

جب اکبر کی اس فراخ مشربی اور عوم ہر افزائی کا حال تمام ملک میں مشہور ہوا

تو مسلمانوں میں بالخصوص بنگال و بہار کے رہنے والوں میں ایک شورش پیدا ہو گئی۔ گو چند دنیاوی امور بھی اس شورش کی پہلی وجہ تھے۔ غرض اکبر سخت ملامتوں اور مذہبی الزاموں کا نشانہ بنایا گیا۔ جن میں خاص خاص الزام یہ تھے کہ پہلے تو محض بادشاہ تھا پھر پیغمبری کا مدعی ہوا۔ مجتہد تو بنا ہی تھا پھر اپنے تئیں ہدی زماں بھی سمجھنے لگا۔ اپنا کلمہ جاری کیا ہے جس میں خدا کا خلیفہ بنا ہے۔ صرف پیغمبری کا نہیں بلکہ نعوذ باللہ خدائی کا بھی دعویٰ کرتا ہے اللہ اکبر کا جملہ سلام کی جگہ زبان ہی سے ادا نہیں کیا جاتا بلکہ ہر قسم کی تحسیروں کی پیشانی پر بھی لکھا جاتا ہے۔ جس کے احتمالی معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اکبر خدا ہے۔ تاج العارفین کی تعلیم سے انسان کامل بن کر تقدس حاصل کیا ہے اور اپنے لئے سجدہ تجویز کیا ہے جو محض خدا کے لئے ہے اور اس کا نام بدل کر زمین بوس رکھا ہے۔ ایک مجموعی الزام یہ تھا کہ دین احمدی سے منکر ہوا ہے بت پرستوں اور مسلمانوں کا مقلد بنا ہے جو رسول عربی کے دشمن ہیں۔ آپ کی شان میں بے ادبی کے الفاظ سننے گوارا کر لیتا ہے۔ عربی کی تعلیم کو تفسیح اوقات سمجھ کر اس کی جگہ ریاضی و ہندسہ و نجوم و حکمت کو رواج دینا چاہتا ہے۔ سنہ ہجری جو آنحضرت صلعم کے کرم معظمہ سے مدینہ منورہ تشریف لیجانے کی یاد گار ہے اس کی جگہ اپنا سنہ طوس جاری کیا ہے اور اس کا نام تاریخ الہی رکھا ہے۔ سمجھ کر کہ سلام کو عنقریب ایک ہزار برس منتفی ہونے والے ہیں اور اب اس دین کی مدت ختم ہوتی ہے اسلام کی ایک تاریخ ہزار سالہ لکھوائی ہے جس کی ابتدا نبی پاک کی وفات سے رکھی ہے گویا آپ کی سیرت مبارک کا ذکر ہی اس تاریخ سے خارج ہے۔ ایک اعتراض یہ تھا کہ سنی نہیں رہا مذہب تشیع اختیار کیا ہے۔ خلفائے ثلاثہ پر طعن بڑے شوق سے سنتا ہے۔ ایرانی امراء شیعی پر خاص نظر عنایت ہے۔ ایک اور الزام یہ تھا کہ برہمنی و زرتشتی مذہب کا معتقد اور چین مت والوں کا حامی بنا ہے۔ آگ اور روشنی کو پوجتا ہے۔ زنا را باندھتا ہے۔ قشتہ کھینچتا ہے۔ آتش پرستوں کی عیدین مناتا ہے۔ نور کی تعظیم کے لئے جس وقت چراغ جلتے ہیں تو کھڑا ہو جاتا ہے۔ زرتشتیوں کے دنوں اور ہینوں کے نام اختیار کر لئے ہیں۔ گاؤں کشی ممنوع قرار پائی ہے جو ایسا کرے وہ واجب اہل طہیر ہے۔ سال میں سو دن گوشت خواری کی ممانعت ہوئی ہے ہندوؤں کی لچھئی اور خاطر طرح طرح سے منظور ہے۔ جزیہ موقوف کیا ہے۔ ڈراہمی منڈا تا ہے ہندوؤں کی طرح قریب کے رشتہ داروں میں شادی بیاہ کرنے کی مسلمانوں کو بھی ممانعت کی جاتی ہے۔ اور بسیں بڑھ کر یہ ہے کہ اپنا ایک مذہب ہی نیا ایجاد کیا ہے جس کا نام دین الہی یا توحید الہی رکھا ہے۔

اس میں توحید کو مان کر باقی جس قدر احکام کسی مذہب کے متعلق ہو سکتے ہیں ان کا وضع و جاری کرنے والا خود بنا ہے۔ جو لوگ اس مذہب میں شامل ہوتے ہیں وہ بادشاہ کو اپنا مرشد مانتے ہیں اور بادشاہ اپنے مریدوں کو جوگیوں کی اصطلاح میں چیلہ کہتا ہے۔ جس طرح ہندو اپنے محبوب پر تن من مہن دار تے ہیں اسی طرح اپنی وفاداری کے لئے چہار گانہ مراتب اخلاص مقرر کئے ہیں۔ یعنی جو شخص بادشاہ کی خیر خواہی میں جان و مال دین و ناموس ترک کرے اس کو ان چاروں چیزوں میں سے ہر ایک کے لئے ایک درجہ دیا جاتا ہے بادشاہ کے بعض خاص مریدوں نے دین الہی میں شامل ہونے کی پہلی شرط یہ قرار دی ہے کہ اسلام پر تہمت لگائیں۔ چنانچہ انھوں نے اس مضمون کے خطوط بادشاہ کو بھیجے ہیں۔ غرض یہ اور ان سے بھی بڑھ کر الزام محض الزام کے طور پر نہیں بلکہ مصدقہ جرائم کی صورت میں ملا عبد القادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں لکھے ہیں جس کے ماننے والے اب تک موجود ہیں ۶

اب دوسرے پہلو پر نظر کیجئے تو اکر نامہ میں بادشاہ کے مذہبی خیالات کا چربہ ابو الفضل نے بھی اتارا ہے۔ مگر ابو الفضل کا نقطہ نظر ملا عبد القادر سے بالکل جدا ہے۔ ملا صاحب نے ملت بیضاء و شریعت غزالی براہین سے اکر اور اکر کے بگاڑنے والوں پر ایسا وار کید ہے کہ ایک تہہ لگا نہیں چھوڑا۔ ابو الفضل نے ان جملوں کی یا تو کچھ پرواہی نہیں کی یا کہیں کہیں محض عقل و حکمت کی سپر سے ان کو روکنا چاہا ہے۔ دونوں کا اندازہ ہر شخص اپنی عقل اور اعتقاد سے کر سکتا ہے اکر کے مذہبی خیالات پر جو لوگ معترض ہوئے ان میں سے ابو الفضل بعض کو تیرہ رائے۔ آشفۃ عقل۔ ہرزہ دراز۔ فتنہ اندوز لکھتا ہے اور بعض کو تقلید و تعصب میں مبتلا سمجھتا ہے۔ بادشاہ کی نسبت لکھتا ہے کہ اس نے مختلف مذاہب و مشارب کی دلائل و براہین کی تنقیح کے لئے اور اس غرض سے کہ کسی طرح کھڑکھوٹے سے علیحدہ ہو جائے اہل علم و عمل اور اہل دین سے استفادہ چاہا۔ صوفی۔ متکلم۔ فقیہ۔ سنی۔ شیعہ۔ بہمن جینی۔ عیسائی۔ زرتشتی اس کی مجلسوں میں جمع ہوتے اور خود پرستی اور عروت سے علیحدہ ہو کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے جو لوگ ان مجلسوں میں کسی اور نیت سے شریک ہوئے ان کو سوائے رسوائی کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ بعض لوگ ایسے بھی شریک ہوئے جنھوں نے باوجود قابل و معقول ہونے کے زبان درازی اور سینہ زوری اختیار کی۔ مگر ایسے لوگوں کو اخیر میں شرمندہ ہو کر علیحدہ ہونا پڑا۔ ان لوگوں کا منشا یہ تھا کہ جیسے پہلے بادشاہوں کے زمانے میں مسائل علمی کی تشخیص کمتر کیا جاتی تھی اور اس سے ان لوگوں کی بات قائم رہتی تھی۔ اسی طرح اب بھی سینہ زوری سے وہ اپنا کام نکال لیں گے مگر ایسا نہ ہوا۔ بادشاہ نے

شمع تحقیق روشن کی سب کے خیالات کسوٹی پر چڑھا لئے گئے۔ اور جس کو جو فائدہ پہنچا تھا وہ پہنچا۔ ابو الفضل نے اکبر کے ایسے اقوال بھی نقل کئے ہیں جن سے ظاہر ہو کہ وہ خدا پرست تھا جس مذہب میں جو خوبی اس کی عقل تسلیم کرتی تھی اس کو اختیار کرتا تھا پرستی کا ایک حصہ سمجھتا تھا آفتاب کی تعظیم کرتا تھا مگر اس لئے نہیں کہ آفتاب خدا ہے بلکہ خدا کی ایسی بنائی ہوئی چیز ہے جس سے دنیا میں ہزاروں نعمتوں کا ظہور ہے اور اس کی تعظیم کرنی فی الحقیقت خدا کے کاموں کی تعریف کرنی ہے۔ جب بعض خوشامدی یا سرع الاعتقاد بادشاہ کے کوائف اور حقیقت حال کو دیکھ کر اس کو منظر حق سمجھنے لگے اور یہ کیفیت دیکھ کر دوسروں نے اعتراض شروع کئے کہ اکبر پیغمبری اور خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو بادشاہ ان اعتراضوں کو سن کر بار بار کہتا تھا کہ ”سبحان اللہ“ ان نادانوں کے دل میں یہ بات کیونکر آتی ہے کہ میں ایک امکا فی حادث در ماندہ طبیعت خدائی کا دعویٰ کروں۔ انبیاء کا گروہ کہ ہادیان آفاق ہے جس نے اپنے اعجاز دکھا کر نبوت کا اظہار فرمایا ہو۔ جس پر ایک زمانہ گزر چکا ہو اور جس کی ہدایتیں دنیا میں مدت سے چلی آتی ہوں اور ہمیشہ ترقی پر ہوں پھر کوئی پوچھے کہ میرے دل میں گروہ انبیاء سے ہونے کا خیال کیونکر آ سکتا ہے۔ معلوم نہیں کہ ان ظاہر بینوں کے دل میں یہ بدگمانی کیونکر پیدا ہوئی مگر جو لوگ صاف باطن ہوتے ہیں ان کو ایسے طعن و تشنیع سے اور فروغ ہوتا ہے اور وہ ان تیرہ رالیوں کی سرزنش نہیں کرتے۔ جہاں اکبر کے الزام دینے والے کہتے تھے کہ دین و علمائے دین کی عزت اس کے دل سے اٹھ گئی ہے اور ان کی تدلیل و تحقیق کر کے غیر مسلموں کی توقیر کرتا ہے۔ وہاں بادشاہ کے خیر خواہ جواب دیتے تھے کہ ”پہلے بادشاہوں کا دستور تھا کہ علمائے تعصب آمیز کے فتوؤں پر غیر مسلموں کو ایذا اور نقصان پہنچانا باعث ثواب سمجھا جاتا تھا۔ ان فتوؤں کی بنا پر بیگانوں سے ان کا مال و اسباب۔ عیال و اطفال کو چھین لینا ایک قسم کی عبادت جانتے تھے۔ مگر فی الحقیقت وہ عبادت نہ تھی بلکہ ایک قسم کی نفس پرستی تھی اکبر نے جس کو طریقہ معاش و معاد میں عقل خدا داد حاصل تھی صلح کل کی بساط بچھائی اور خلائق کے ہر طبقہ و جماعت کو یکساں شمار کیا۔ اس کا قول تھا کہ خالق نے ہر مذہب و ملت کی مخلوق پر اپنا در فیض کھولا ہے۔ اس کا لطف عام سب پر شامل ہے۔ پس بادشاہ جو ایزد متعال کا سایہ ہے اس پر واجب ہے کہ وہ متخالف و متنازع دینی کو منظور نظر نہ رکھے اور خدا کے بندوں کو ایک ہی نظر سے دیکھے اور اپنی عنایت کے پر تو کو آفتاب کے نور کی طرح نیک و بد پر یکساں چمکائے۔ اور ہندو مسلمان گیسو و ترسا اور دیگر

تمام مذاہب کے ماننے والوں سے صلح اختیار کرے۔

خلاصہ اس مضمون کا یہ ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی کی تحریر سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ اول شہنشاہ اکبر اپنے تئیں ان تمام حقوق کا مستحق سمجھا جو بادشاہ کے خدا کی طرف سے مقرر ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کا مجتہد بنا اور پھر پیغمبری کا دعویٰ کیا اور پھر خدا بنا اور پھر اپنا ایک نیا مذہب بھی دین الہی یا توحید الہی کے نام سے ایجاد کیا۔ یہ تمام حرکتیں ایسی تھیں جنہوں نے اکبر کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا اور وہ ایک بے دین اور ظالم بادشاہ مسلمانوں کے حق میں ثابت ہوا۔ ابو الفضل کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے کبھی خدا ہونے کا دعویٰ کیا نہ پیغمبر ہونے کا۔ اور ان دونوں باتوں کے باطل ہونے کو خود اکبر کے اقوال سے ثابت کیا ہے۔ مجتہد البتہ وہ اپنے تئیں اس معنی میں جانتا تھا کہ اگر مسلمان غلط کام کریں تو احکام قرآن کے بموجب وہ سیدھے راستے پر لائے جائیں۔ غرض ابو الفضل کے نزدیک اکبر اپنی مسلم غیر مسلم دونوں قسم کی رعایا میں ایک ہر دل عزیز بادشاہ تھا جس نے ہندوستان میں ہندو مسلمان گہر و ترساسب کو ایک ہی سلسلۂ اخوت میں باندھنا چاہا۔ بزرگان دین کی عقیدت اس کے دل میں ہمیشہ رہی۔ چنانچہ حضرت خواجہ معین چشتیؒ اور حضرت خواجہ سلیم چشتیؒ قدس سرہ کے ساتھ جو ارادت اس کو تھی وہ انظرین الشمس ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اکبر ہمیشہ حق کی تلاش کے سوالات کیا کرتا تھا مگر کبھی اس کو جواب ایسا نہ ملا کہ اس کے دل کو تسخیر ہو جاتی۔ گو اس کا دماغ حتیٰ پروہ تھا مگر وہ ہرگز ایسا قوی نہ تھا کہ ان برگزیدہ نفوس کے سامنے تک پہنچ سکتا جنہوں نے دنیا میں اپنی حق یا بائی سے حق پرستی کا لاکھوں دلوں میں نقش جما دیا ہو۔ اکبر کا دین الہی کوئی مستقل مذہب نہ تھا۔ جو گیوں اور فقروں کے ایک معمولی پتھر سے زیادہ اس کی حقیقت نہ تھی اور پتھر بھی ایسا جو زیادہ دن نہ چل سکا۔ چند شاعروں یا طامع مسلمانوں یا خوشامدی نوکروں کے سو کسی نے اس کو اختیار نہیں کیا۔ یہ قلت اشاعت ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس طریقے کی تبلیغ میں بادشاہ نے اپنے شاہی اقتدارات سے ہرگز زیادہ کام نہیں لیا۔ نہ ان کی اشاعت میں کچھ کوشش کی نہ اپنے اختیارات کو کام میں لایا اور نہ کسی کو اس مذہب کے اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ اکبر کے مرتبے ہی اکبر شاہی دین الہی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

مختتم تحریر مولوی علامہ اللہ صاحب۔

جس وقت فتح پور سیکری کے شاہی محلوں میں مذہب پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں ہو رہی تھیں پرانی دلی کے کھنڈروں میں بیٹھ کر ایک پرہیزی درویش نے آتش توحید کو یکایک ایسا بھڑکایا کہ اس کا اثر دور دور پہنچ گیا۔ ہماری مراد خواجہ باقی باللہ قدس سرہ سے ہے جو اسی دسویں صدی کے آخری یا گیارہویں صدی کے ابتدائی سن میں کابل سے دہلی تشریف لائے۔ اور صوفیہ کرام کے سلسلہ نقشبندیہ کے طریقے میں معارف اور حقائق اسلامی کی تعلیم دینی شروع کی جس سے صد ہا طالبین حق کے سینے منور ہو گئے۔ یہ سلسلہ میں شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمۃ (۹۶۲ھ تا ۱۰۶۷ھ) نے خواجہ باقی باللہ کی جانشینی کا شرف حاصل کیا۔ آپ کو مسلمانوں کی جماعت کثیر نے مجدد الف ثانی تسلیم کیا۔ آپ نے علمائے ظاہر و باطن کو ایک ہی نقطہ اتحاد پر جمع کیا اور مدلل طریقے پر بار بار اس اصول کو واضح کیا کہ اسلامی تصوف شریعت کا خادم ہے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمۃ کے ہی آستانے کے فیض یافتہ اور حضرت مجدد شیخ احمد سرہندی کے ہم عصر شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۹۵۸ھ تا ۱۰۵۲ھ) تھے اور یہ آپ ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ علوم اسلامیہ کی درس و تدریس کو جو اکبر کے زمانے میں سست پڑ گئی تھی پھر ترقی ہوئی۔ آپ کے کسی اقدربعد کے لوگوں میں ملا عبدالحکیم یا لکھنوی اس عہد کے مشہور فاضل گزرے ہیں۔

سولہویں صدی عیسوی کے ہندی مسلمانوں میں دیگر اہل علم اور ادیبوں کی بھی حیرت انگیز کثرت نظر آتی ہے جس کا ایک سبب یہ ہے کہ ان کی بعض تصانیف اور حالات ہمارے زمانے تک محفوظ ہیں۔ اس علمی فصل کی پیداوار میں گو تخم ریزی کا نہیں لیکن آبپاری کا شرف اول اول اسی اکبر بادشاہ کو حاصل ہوا اور اس کی علم نوازی اور شوق تاریخ و قصص نے بہت سے لائق اہل قلم کو دربار اکبری میں جمع کر دیا جن کے مفصل حالات اور علمی کمالات بیان کرنے کے لیے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں مختصر طور پر اتنا لکھنا کافی ہو گا کہ ارباب مسلم کے اسی گروہ میں ملا عبد القادر بدایونی، شیخ سلطان محمد نیسری حاجی ابراہیم سرہندی اور ملا شمسیری یا کوئی اور ابوالفیض فیضی جیسے نامور ادیب اور سنسکرت داں تھے جنہوں نے اس ہندی زبان کے متعدد قصص اور علمی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اسی گروہ میں ملا نظام الدین احمد نقیب خاں (فرزدینی) اور مولانا شاہ محمد شاہ آبادی وغیرہ فن تاریخ کے اہر و مصنف تھے جن کی مشترکہ سعی و محنت سے بہت سی تاریخی فارسی میں تصنیف

یا ترجمہ ہوئیں۔

فارسی شاعری کو بھی جو فروغ اس سولہویں صدی میں حاصل ہوا، کبھی پہلے ہندوستان میں ہوا تھا نہ بعد میں نصیب ہوا۔ اور جتانے کے لائق بات یہ ہے کہ ان دو سو کے قریب مشاہیر شعرائے عصر میں جن کے مختصر حالات اور کلام کا نمونہ منتخب التواریخ و جلد دوم اور ان میں اکبری (دفعہ دوم) میں محفوظ ہے، اچھا شعر لکھنے والے ہندوستانی تھے اور انہی میں سے دو یعنی قائم گاہی اور فیضی کو دربار شاہی سے خطاب "ملک الشعرا" حاصل ہوا تھا۔ ان ایرانی شعراء میں جو آج کل فارسی شاعری کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں، ظہوری اور ملک قمی دکن میں اور نظیری و شکیمی خان خانان عبدالرحیم خان کی دریا دل سرکاریں پہنچ گئے تھے۔ عمر فی شیرازی جس کا جوش انگیز کلام اس کی جوانی ہی میں عراق سے بنگالے تک تبرک کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا تھا، اکبر کے دربار میں پہنچا مگر کچھ اپنے غرور و استغنا اور کچھ فیضی کی رقابت کے باعث اس کی یہاں قدر نہیں ہوئی اور اس کے کمال کو بھی خان خانان ہی کی جوہر شناسی نے خرید لیا۔

ادب فارسی کی طرح "برج بھاشا" کی شاعری کے عروج کا وہ زمانہ جسے وسطی ہندی سے منسوب کرتے ہیں، یہی سولہویں صدی عیسوی ہے۔ یہی صدی کے بالکل آغاز میں دلچسپا چاری نے دکن سے آکر "گوگل" یعنی ستھر کے قریب چھاوٹی چھاٹی اور کرشن درادھا کے قصیدہ عشق پر

سہ مرزا عبدالرحیم خاں بیرام خاں اتالیق کا بیٹا ایک میواتی بیوی سے تعالیٰ فیہ میں پیدا ہوا اور باپ کے قتل کے بعد بادشاہ کی سرپرستی میں پرورش پائی؛ جب مظفر شاہ گجراتی نے نظر بندی سے فراہم کر گجرات میں فتنہ و فساد کیا تو میرزا عبدالرحیم ہی نے اس شورش کو فروغ دیا اور اپنی جنگی استعداد اور خوش انتظامی سے اس کی قوت توڑی۔ اسی خدمتِ حلیہ کے صلے میں اسے خطاب "خان خانان" اور منصب "نچھری عطا ہوا۔ بعد میں بھی بڑے بڑے عہدوں پر فراز ہوتا رہا۔ آخر میں زیادہ وقت دکن کی ہمت ہی میں بسر ہوا لیکن وفات سے تھوڑے دن پہلے دربار میں آگیا تھا۔ اور وہی میں وفات پائی (۱۶۳۳ء) اس کے علم و فضل اور سخاوت و فیاضی کے اکثر قصے آج تک مشہور ہیں۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی (دراستگرت) زبان میں کامل ہمارت رکھتا تھا بالخصوص ہندی کا بہت مقبول شاعر ہوا ہے اور اشعار کے علاوہ ترک بابری کا فارسی ترجمہ اسی کے شوقِ تصنیف کی یادگار ہے۔ دو مفضل حالات کے لئے ملاحظہ ہو آثار الامرا

اپنی مذہبی تعلیمات کی بنا رکھی۔ اس کے مقلدوں کی بدولت یہاں کی مقامی ہندی یا برج بھاشا کی شاعری قریب قریب تمام شمالی ہند میں شایع ہوئی۔ اس شاعر کی آٹھ اساتذہ (آٹھ چھاپ) میں سور و اس سب سے زیادہ مشہور ہے جو اکبر کے عہد میں تھا۔ اس کی کتاب ”سور ساگر“ میں روایت عام کی بوجب ساٹھ ہزار شعر ہوں یا نہ ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ برج بھاشا کی شاعری کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے اور اس سے کوئی ہندی کلام افضل مانا جاتا ہے تو وہ تلسنی و اس کی تصانیف میں جو مسئلہ طور پر ہندی زبان کا بہترین شاعر گزرا ہے۔ وہ ہالیوں کے پہلے عہد حکومت میں پیدا ہوا اور چھانگیر کے زمانے تک زندہ اور نہایت مقبول و با اثر مذہبی شاعر سمجھا جانے لگا تھا۔ ۱۶۳۲ء میں وفات پائی اور اپنی سب سے مشہور یادگار وہ ”رام چرت بانس“ چھوڑی جو عام طور پر ”رامائن تلسی داس“ کہلاتی ہے اور نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی سب سے مقبول و دلکش منظوم کتابوں میں شمار ہونے کی مستحق ہے۔



باب



سلطنت مغلیہ کا انتہائی عروج



پہلی فصل بدکن کی سیاسی حالت



اگرچہ ۱۵۱۹ء سے سلطنت بہمنی کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا اور لطائف الملوکی شروع ہو گئی تھی لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سلطنت کا خاتمہ عین اس وقت ہوا جب کہ مغل ہندوستان میں آئے۔ یعنی ۱۵۲۶ء میں جنگ پانی پت ہوئی اور شمال میں مغلوں کی عملداری قائم ہو گئی اور ادھر ۱۵۲۶ء میں خاندان بہمنی کا آخری بادشاہ کلیم اللہ امیر برید کی دست درازیوں سے عاجز آکر بیدر سے بھاگا اور احمد نگر میں جا کر پناہ لی اور اس طریقے سے سلطنت بہمنی کی تمام باقیات ختم ہو گئیں اور اس کی جگہ پانچ سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ بیدر پر بریدی خاندان قابض ہو گیا۔ برید ذات کے ترک اور بیدر کے صبر نوبت یعنی کوتوال تھے۔ قاسم برید نے محمود شاہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر چکے چکے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں کر لیے اور محمود شاہ اور اس کے تمام جانشین بریدیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو گئے تھے۔ ۱۵۵۷ء تک قاسم برید کی حکومت رہی اور اس کے مرنے کے بعد امیر برید کی سسیادت قائم ہو گئی۔

جب ۱۵۱۲ء میں کلیم الشہید سے بھاگا تو پھر خاندان بہمنی کا کوئی قسمہ لگا نہیں رہا۔ اور بیدری کی سلطنت پوری بریدی ہو گئی۔ یہ بیدر کا برید شاہی خاندان کہلاتا ہے جس کے آٹھ بادشاہ گزرے ہیں۔ لیکن ان کی طاقت اس قدر مختصر تھی کہ اس پاس کی بڑی سلطنتوں کے مقابلے میں ان کا زندہ بڑا بہت مشکل تھا۔ بڑے سیاسی جوڑ توڑ سے یہ اپنی ہستی قائم رکھتے تھے یعنی اپنے بچاؤ کے لئے دکنی سلطنتوں کو آپس میں لڑا دیتے تھے اس لئے یہ دکن کی لومڑی کہلاتے ہیں اور اس طریقے سے ان کو تلخ میں چھی بکری نہیں ملی سکی۔ بالآخر ۱۶۱۹ء میں بجاپور کی سلطنت نے اس کو ضم کر لیا۔ برار کی سلطنت کا بھی کچھ ہی رنگ تھا اس سلطنت کا قایم کرنے والا فتح اللہ عباد الملک ہے جو دکن میں ایک برہمن خاندان کا آدمی تھا اور برار کا صوبہ دار تھا اور ۱۶۹۹ء میں جب کہ سلطنت بہمنی کا شیرازہ بکھرنے لگا تو یہی خود مختار ہو گیا۔ فتح اللہ کے خطاب سے یہ عباد شاہی خاندان کہلاتا ہے۔ برار کی سلطنت بیدر سے زیادہ چھوٹی تھی۔ اس خاندان کے صرف پانچ بادشاہوں نے صرف ۱۵۴۷ء تک حکومت کی اور بالآخر احمد نگر نے اس کو ضم کر لیا اٹیچور اس کا پای تخت تھا جہاں اب بھی اس خاندان کے آثار قدیمہ پائے جاتے ہیں۔ ان کے قطع نظر احمد نگر بجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتیں زیادہ دیر پائاست ہوئیں اور ان کا ایک لکھنوی پانچ چھوڑی چیلنج دکن کا بڑا سرمایہ ہے۔ احمد نگر کی سلطنت کا قایم کرنے والا ملک احمد نظام الملک ہے جو مشہور ملک حسن بحری کا بیٹا تھا محمود گاداں کے قتل کے بعد ملک حسن مقتدر ہو گیا تھا لیکن محمود شاہ بہمنی سے اس کی آن بن ہو گئی چنانچہ شاہی خزانے کو سمیٹ کر جنیر بھاگتا تھا کہ قتل کر دیا گیا۔ یہ ملک حسن صوبہ جنیر کا گورنر تھا اور اس کا بیٹا احمد اپنے باپ کی طرف سے صوبہ مرہٹواری کی گورنری کرتا تھا۔ جب ملک حسن کا خاتمہ ہو گیا تو ۱۶۹۰ء میں ملک احمد نے جنیر میں خود مختاری حاصل کر لی۔ اس صوبے کا مستقر پہلے جنیر تھا لیکن ملک احمد نے دریائے گوداوری کی وادی میں احمد نگر کے نام سے ایک اور پائے تخت بنایا جو اپنے موقع محل کے اعتبار سے بہت اچھا تھا اور آج یہ ایک بارونق شہر ہے۔ چونکہ نظام الملک ان کا خاندانی خطاب تھا اس لیے یہ نظام شاہی خاندان کہلاتا ہے یوں تو اس خاندان کے کم و بیش گیارہ ملایں گزرے ہیں لیکن پہلے تین سلاطین ملک احمد نظام شاہ اور اس کا بیٹا اور پھر ان نظام شاہ اور حسین نظام شاہ بڑے طاقتور اور قابل مند بادشاہ گزرے ہیں۔ ان کے زمانے میں یہ احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت غیر معمولی طاقتور ہو گئی تھی اور تمام ہمارا اثر پر چھائی ہوئی تھی جسین نظام شاہ کے بعد جس کا انتقال ۱۷۱۵ء میں ہوا تھا اس سلطنت کو بہت ہی کمزور سلاطین سے سابقہ پڑا اور یہ سلطنت

روز بروز کمزور ہوتی گئی اور اکبر کے آخری عہد سے اس پر مغلوں کے حملے شروع ہو گئے اور شاہجہاں کے عہد میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

بیجا پور مرہٹو اثری اور کرناتک کا سنگم ہے۔ جب محمود گاداں نے بہمنی صوبوں کی جدید تقسیم کی تو مغرب میں بیجا پور کوکن کا ایک جدید صوبہ قرار دیا گیا تھا۔ یوسف عادل خاں جو محمود گاداں کا آفریدہ تھا محمود شاہ بہمنی کے عہد میں یہاں کا صوبہ دار تھا۔ یہ شخص غلام کی حیثیت میں سلطنت بہمنی کا متوسل ہوا تھا لیکن محمود گاداں کی فرقہ پرستی کے زور سے اس نے غیر معمولی ترقی کر لی۔ فوج کا منظر اور بیجا پور کا صوبہ دار ہو گیا۔ محمود گاداں کے قتل ہونے پر سب سے پہلے اسی نے انحراف کیا اور محمود شاہ بہمنی کے عہد میں ۱۵۹۹ء میں بیجا پور کی خود مختار سلطنت قائم کر لی۔ یہ سب پور کا عادل شاہی خاندان کہلاتا ہے۔ اس خاندان نے تقریباً دو سو سال تک حکومت کی اور اپنے پاکیزہ تمدن اور معاشرت کی بڑی تاریخ چھوڑی ہے۔ اس خاندان کے نوسلاطین گزرے ہیں ان کے منجملہ اکثر جلیل القدر ہیں جو اپنی سیاسی قابلیت اور تمدنی ذوق کی وجہ سے مشہور ہیں۔ چنانچہ ان کی سرپرستی میں بیجا پور نے علم و فن میں بڑی ترقی کی۔ یوسف عادل شاہ کے بعد اس کا پوتا ابراہیم عادل شاہ اول جو ۱۵۳۱ء میں تخت نشین ہوا تھا اور اس کا پر پوتا علی عادل شاہ اول جو ۱۵۵۵ء میں تخت نشین ہوا اس خاندان کے طاقتور حکمران تھے جن کی سرپرستی میں بیجا پور بہت بڑی سلطنت ہو گئی تھی علی عادل شاہ کا جانشین ابراہیم عادل شاہ ثانی جو ۱۵۷۵ء میں تخت نشین ہوا تھا علوم و فنون کی سرپرستی کی وجہ سے غیر معمولی شہرت رکھتا ہے اور جگت گرو کے لقب سے مشہور ہے اس کے انتقال کے بعد ۱۵۷۶ء میں مغلوں کی یورشیں ہونے لگیں اور جب شاہجہاں کے عہد میں احمد نگر کا بالکل خاتمہ ہو گیا تو ۱۶۲۳ء میں بیجا پور کی سلطنت بھی مغلوں کی باجگزار ہو گئی اس کے پچاس سال کے بعد اورنگ زیب نے اس کا بالکل خاتمہ کر دیا۔

گوکہ کٹھنہ صوبہ تنگنا کا مستقر تھا۔ یہاں سلطنت بہمنی کے صوبہ دار مولی ٹم تک تمام تنگنا پر حکومت کرتے تھے۔ اس سلطنت کا بانی سلطان قلی نامی ایک ایرانی تھا جو محمود شاہ بہمنی کے عہد میں ہمدان سے آکر سلطنت بہمنی کا ملازم ہوا تھا۔ پہلے یہ تنگنا کے شروف و فساد کو فرو کرنے کے لئے مقرر کیا گیا اور قطیف الملک و کھنئی کے انتقال کے بعد جو تنگنا کا صوبہ دار تھا اس کو قطیف الملک خطاب دے کر صوبہ دار بنایا گیا۔ جب ۱۶۹۰ء میں احمد نگر اور بیجا پور کے صوبہ دار خود مختار ہو گئے تو سلفان قلی کو بھی موقع تھا چنانچہ مذکورہ بالا صوبہ داروں نے اس کو ترغیب بھی دی تھی

لیکن سلطان قسلی اپنے جذبہ وفاداری سے مجبور تھا چنانچہ اس نے محمود شاہ بہمنی کے انتقال تک جو ۱۵۱۵ء میں ہوا تھا اعلان خود مختاری نہیں کیا گو علی طور پر اس کو سب کچھ اختیارات حاصل تھے اس طرح گوکنڈے کی قطب شاہی سلطنت سب سے دیر میں قائم ہوئی۔ یہ قطب شاہی خاندان کہلاتا ہے جس کے سات بادشاہ گزرے ہیں جن میں سے اکثر اقبال مند تھے۔ سلطان قسلی نے جو سلطنت کا بانی تھا بڑی عمر پائی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں اس کو اچھی طرح مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد تھوڑی سی خانہ جنگی ہوئی لیکن جب اس کا چھوٹا بیٹا ابراہیم قطب شاہ ۱۵۵۱ء میں تخت نشین ہوا تو اس سلطنت کی پھر ترقی شروع ہو گئی اور ابراہیم کے جانشین محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں اس کو غیر معمولی مروج حاصل ہو گیا۔ محمد قلی قطب شاہ نے ایک جدید شہر حیدر آباد کے نام سے آباد کیا جو اب تک موجود ہے اور روز افزوں ترقی پر ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے جتنی عہد میں جو محمد قطب شاہ کے لقب سے ۱۶۱۲ء میں تخت نشین ہوا تھا سلطنت کی ترقی برابر جاری رہی۔ عظیم الشان تعمیر کا کام ہوا اور علم و فن کی سرپرستی ہوئی۔ لیکن جب ۱۶۲۶ء میں اس کا انتقال ہوا تو سلطنت کو زوال شروع ہو گیا اور بیجا پور کے ساتھ یہ سلطنت بھی مخلوں کی باجگزار ہو گئی اور بیجا پور کے ساتھ پچاس سال کے بعد اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اگر مجموعی طور پر ان سلطنتوں پر نظر ڈالی جائے تو ان کے کئی دور قرار دیے جاسکتے ہیں ان کا ابتدائی دور جب کہ احمد نگر میں احمد نظام شاہ اور برہان نظام شاہ بیجا پور میں یوسف عادل شاہ اور ابراہیم عادل شاہ اول اور گوکنڈے میں سلطان قلی اور ابراہیم قطب شاہ حکومت کرتے تھے ان سلطنتوں کی تاسیس اور استحکام کا زمانہ ہے۔ اس میں ان سلطنتوں کی بنیادیں پڑیں اور ان کو اندر اور باہر سے مستحکم کیا گیا۔ اس ابتدائی زمانے میں تمدنی ترقی نہیں ہو سکتی تھی لیکن جب ان کے جانشین یعنی احمد نگر میں حسین نظام شاہ اور بیجا پور میں علی عادل شاہ اول اور ابراہیم عادل شاہ دوم اور گوکنڈے میں محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ تخت نشین ہوئے تو ان سلطنتوں کو انتہائی عروج حاصل ہو گیا۔ نہ صرف یہ سلطنتیں وسیع ہو گئیں بلکہ ان میں غیر معمولی تمدنی ترقیاں ہوئیں جن پر اہل دکن فخر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اول تو یہ سلاطین بڑے متدین اور اہل اخلاص تھے ان فرماں رواؤں نے اپنی سلطنتوں کی کامیاب سیاسی رہنمائی کے علاوہ علوم و فنون کی سچی سرپرستی کی تھی۔ ان کے درباروں میں ہمیشہ اہل علم و فن جمع رہتے تھے۔ نہ صرف شعر و سخن اور ادب و حکمت پر کتابیں لکھی گئیں بلکہ عمارت سازی، تصویر کشی اور نقاشی موسیقی جیسے فنون لطیفہ میں بھی غیر معمولی کام ہوا جن کی یادگاریں

اب تک موجود ہیں بجا پور اس خصوص میں زیادہ پیش پیش تھا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی علمی و فنی سرپرستی تو ضرب اثل ہے اور اسی وجہ سے اس کو دکن میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی اور لوگ اس کو جگت گرو کہتے تھے۔

سلطنت بہمنی کے انتشار و شکستگی اور مسلمانان دکن کی مذکورہ بالا لامرگزیت و خانہ جنگی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ جنوب میں ہندو ریاست و جیا نگر کو نہ صرف مسلمانوں کے حملوں سے نجات ملی بلکہ خود اس نے بعض شمالی اضلاع پر قبضہ حاصل کر لیا اور اپنے راجاؤں کے تیسرے خاندان کے عہد میں جو پہلوں صدی عیسوی کے اوائل میں برسرِ اقتدار ہوا تھا بڑی قوت ہم پہنچائی چنانچہ اسی خاندان کے تیسرے راجہ کرشن دیو (۹۱۵ء تا ۹۳۵ء) کا زمانہ و جیا نگر کے اہتمامی عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے جب کہ اس ریاست میں جنوبی ہند کا قریب قریب وہ تمام علاقہ داخل تھا جو اب آحاطہ مدراس ریاست میسور اور دیگر دیسی ریاستوں میں شامل ہے۔

بائیں ہمیشہ ریاست اپنی خانہ جنگیوں میں کبھی کبھی مسلمان سلاطین دکن سے مدد لیتی تھی اور دربار بجا پور و گوکنڈہ سے آنے والے وہاں کے ہندو امرا ساز باز کرتے رہتے تھے۔ اسی ضمن میں جب حکومت کی صلی باگ و جیا نگر کے وزیر رام راج کے ہاتھ میں آئی (۹۳۹ء) تو وہ خوشی سے اس جتنے میں شریک ہو گیا جسے برہان نظام شاہ والی احمد نگر نے ۹۵۳ء میں ریاست بجا پور کے خلاف متحد کیا تھا۔ اتحادیوں کو اول اول نمایاں کامیابی ہوئی لیکن دربار بجا پور کے مشہور امیر اسد خاں (لاری) نے کچھ جنگی و دلیری اور زیادہ تر اپنی ریشہ و دانی سے حلیفوں میں نفاق ڈلوکا عادل شاہی سلطنت کو تباہ ہونے سے بچا لیا اور و جیا نگر کو اپنے ساتھ متحد کر لیا۔ یہ سیاسی اتحاد بیس بائیس برس تک بحال رہا اور کئی مرتبہ و جیا نگر کی فوج بجا پوریوں کی مدد کے لئے شمالی علاقوں میں بلانی گئی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ صریح عہد و پیمان کے باوجود وہاں کے ہندو سپاہی شدید تعصب کا اظہار کرتے تھے اور فارسی تواریخ میں جابجا ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ ہندو اتحادیوں نے اسلامی شہروں میں گھس کر مساجد کو آگ لگا دی اور شہری مسلمانوں پر طرح طرح کی نارواز باتیں کیں۔ ان واقعات نے ریاست بجا پور کے مسلمانوں میں اسد خاں لاری کی مکت علی کے خلاف عام جوش پیدا کر دیا۔ احمد نگر، بیدر، نیزگوکنڈہ کی اسلامی حکومتیں پہلے ہی و جیا نگر کی رقیب و دشمن تھیں۔

و جیا نگر کا عروج

ستلی کوٹ

باب

غرض سیاسی اغراض اور مذہبی حیثیت نے ایک مرتبہ پھر اسلامی دکن کو متحد کر دیا اور گویا اتحاد پائدار نہ تھا لیکن مسلمان اتحادیوں کے پہلے ہی مقابلے میں سلطنت وجیا نگر کا تار و پود بکھر گیا اور پائے تخت اور وجیا نگر کی کال بربادی کے ساتھ ایک طرف پینا زندگی اور دوسری طرف کالی کٹ تک اس کے علاقے فتح مند مسلمانوں نے آپس میں تقسیم کر لیے (۱۵۶۹ء)

ترقی تمدن

اس فتح عظیم نے دکن کی اسلامی ریاستوں، خاص کر بیجا پور و گولکنڈے کی قوت و عظمت کو پہلے سے کہیں زیادہ بڑھا دیا۔ بہت سالانہ غنیمت اور علاقہ پاتھ آنے کے علاوہ انھیں ایک دشمن سخت سے نجات مل گئی جس کے خلاف آئے دن کی لڑائیاں ان کی زیر باری اور جنوبی اضلاع کی خرابی کا موجب تھیں۔ پس مجموعی طور پر ان دکنی ریاستوں کے انتہائی فسروغ کا یہی زمانہ ہے جس میں بیجا پور حیدر آباد اور احمد نگر کے شہر دولت و مدنیت کے اعتبار سے دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں شمار ہونے لگے جن کے بازاروں میں ممالک عالم کی بہترین مصنوعات فروخت ہونے آتی تھیں نیز جاجباد قلعے اور عمارات اسی عہد میں تعمیر ہوئیں جن کے آثار قدیمہ آج بھی دکن کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ان اسلامی ریاستوں کی خصوصیت بھی قابل بیان ہے کہ غالباً یہاں کے مسلمان اپنے ہندو ہمسایوں کے ساتھ سب جگہ سے زیادہ متعلقہ ہوتے جاتے تھے اور بعض رسوم معاشرت کو براہ راست اختیار کر لینے کے علاوہ انھوں نے خود اپنی رسموں میں بھی ہندوین کی شان پیدا کر لی تھی۔

عسایہ اتحاد زیادہ تر سید مصطفیٰ خاں اردستانی کی کوشش سے صورت پذیر ہوا تھا جس نے بیجا پور و احمد نگر کی قدیم عداوت کو صلح سے مبدل کر دکھایا اور احمد نگر کی شہزادی چاند سلطان کی علی عادل شاہ بیجا پور کے ساتھ شادی کرنے (۱۵۶۲ء) سے مزید تقویت پہنچائی۔

عسایہ زبردست لڑائی مدگل کے قریب ہوئی (جمادی الثانی ۹۷۰ھ مطابق جنوری ۱۵۶۱ء) مگر جنگ تالی کوٹ کے نام سے جہاں مسلمانوں کا اجتماع ہوا تھا، موسوم ہے۔ فارسی تواریخ کے علاوہ، حال میں اس جنگ اور وجیا نگر کے حالات کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے جن میں سویل کی کتاب "دی فورگولن ایمپائر" سب سے زیادہ مشہور ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ لڑائی میں رام راج پانچ لاکھ سے زیادہ جنگ آزمائہ ہمارہ لایا تھا اور بنگلہ ہر یہی سبب ہے کہ اسی ایک ہزیمت نے وجیا نگر کی قوت کو بالکل کمزور کر دیا اور اس کے دولت مند پائے تخت کو پہلے بنجاروں اور لمباڑوں نے لوٹا اور اس کے بعد فتح مند حملہ آوروں نے تاراج و تہدم کیسا (سویل کی

چنانچہ شادی بیاہ کی رسموں سے قطع نظر، عیدین اور محرم کے تہواروں کو جس طرح دکن میں منایا جاتا تھا وہ بہت کچھ ہندوؤں کے میلوں سے مشابہ تھا اور اس مشابہت کے بعض پہلو آج بھی نمایاں ہیں۔ ان رسوم معاشرت کو لینے کے ساتھ انھی اور کئی درباروں میں سب سے اول ہندوؤں کی زبان کو دفتری کاروبار میں استعمال کرنے کی اجازت دی گئی اور یہیں ہندوستانوں کی اس مشترکہ زبان کی تحریر کا سب سے پہلے رواج ہوا جسے اب اردو کہتے گئے ہیں۔

درباری تزک و احتشام اور امیرانہ عیش و تکلفات کی فراہمی میں سلاطین دکن فوجی تیاریوں کو فراموش نہ کر سکتے تھے۔ باوجود ہم مذہب ہونے کے ان کی باہمی رقابت ہر وقت ہمسایوں کا علاقہ و بانے کی ناک میں رہتی تھی اور اس مسلسل جنگ و جدال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اپنی جگہ پر مر رست زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر افواج مرتب کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ پس بجا پورا گوگلنڈہ اور احمد نگر میں پانچ لاکھ جنگجو پیادہ و سوار کی تعداد کو اسلامی دکن کی کل فوجی قوت کا کم سے کم تخمینہ سمجھنا چاہیے جس میں عربوں اور حبشیوں کی ایک بڑی جمعیت شامل تھی اور اسی ایک واقعے سے ان افواج کی آراستگی کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ تالی کوٹ کی جنگ میں صرف احمد نگر کا سلطان چھ تو میدانی توپیں ہمراہ لایا تھا۔ لیکن اپنے آخری دور میں مذہبی دورنگی کی وجہ سے یہ سلاطین بہت کم ور ہو گئے۔ کیونکہ احمد نگر بجا پورا اور گوگلنڈہ کے سلاطین نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا جس نے انھیں اپنی سنی رہایا سے بیگانہ بنا دیا تھا۔

جنگی استعداد

باہمی لڑائیوں کے علاوہ اسی دسویں صدی ہجری کے اواخر میں اہل دکن کی سلطنت غلیہ سے جنگ چھڑ گئی تھی اور اس نئے خطرے نے سلاطین دکن کی جنگی استعداد کو کوشش کو یقیناً بہت بڑھا دیا ہوگا۔ لیکن ان معرکوں کا حال بیان کرنے سے پہلے ان کو مئی سلاطین کے نام اور مئی جلوس کا اجمالی نقشہ پیش کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا۔

سلاطین کے نام اور مئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱) مذکور بالا کتاب کے علاوہ دیکھو (اکس فورڈ ہسٹری صفحہ ۳۶۲-۳۶۳)۔

علاوہ قول مورلینڈ کے تازہ ترین نتائج تحقیقات پر مبنی ہے اور گورنمنٹ المحروف ان کی تحقیقات کو چنداں قابل نہیں سمجھتا تاہم کم سے کم تخمینہ کرتے وقت اسے پیش کرنے میں مضائقہ نہیں

(انڈیا ایٹ دی ڈیویڈنٹ آف الہ ص ۱۹) نیز دیکھو (نیشن ۱۹۰۶)۔

گوکنڈے کا قطب شاہی خاندان	بیجاپور کا عادل شاہی خاندان	احمد نگر کا نظام شاہی خاندان
(۱) سلطان قلی قطب شاہ سلطان محمد بہمنی کے ترک ملازموں میں داخل تھا اور گویندھویں صدی کے اواخر میں قریب قریب آزاد ہو چکا تھا بایں ہمہ معلوم ہوتا ہے کہ اس خود مختار بادشاہی کا اعلان ۹۱۵ھ میں ہوا۔	(۱) یوسف عادل شاہ جو اپنے آپ کو عثمانی سلاطین ترکی کی اولاد میں بتاتا تھا غلام کی حیثیت سے دربار بہمنی میں بکا اور بتدریج ترقی کر کے بیجاپور کا خود مختار بادشاہ بن گیا ۸۹۵ھ تا ۹۱۵ھ ۶۱۳۸۹ تا ۶۱۵۱۰	(۱) احمد نظام شاہ بن نظام الملک بھروی۔ تو سلم بہمن زادہ تھا اور مگر اس نے علانیہ لقب بادشاہی اختیار نہیں کیا لیکن ۹۱۵ھ میں سلطان محمد بہمنی کو شکست دینے کے بعد احمد نگر کو پای تخت بنا کر خود مختار ہو گیا تھا۔
(۲) جمشید قطب شاہ ۹۵۰ھ تا ۹۵۶ھ ۱۵۴۳ تا ۱۵۵۰	(۲) اسماعیل عادل شاہ ۹۱۵ھ تا ۹۲۱ھ ۱۵۱۰ تا ۱۵۱۶	(۲) برہان نظام شاہ ۹۱۵ھ تا ۹۶۱ھ ۱۵۱۰ تا ۱۵۵۶
(۳) سبحان قطب شاہ طفل ہفت سالہ تھا چند روز تخت نشین ہوا ۹۵۰ھ تا ۹۵۶ھ ۱۵۴۳ تا ۱۵۵۰	(۳) ملو عادل شاہ چھ مہینے تخت نشین رہا ۹۲۱ھ تا ۹۲۳ھ ۱۵۱۶ تا ۱۵۱۸	(۳) حسین نظام شاہ ۹۶۱ھ تا ۹۹۲ھ ۱۵۵۶ تا ۱۵۹۷
(۴) ابراہیم قطب شاہ ۹۵۶ھ تا ۹۸۸ھ ۱۵۵۰ تا ۱۵۸۱	(۴) ابراہیم عادل شاہ ۹۲۳ھ تا ۹۶۱ھ ۱۵۱۸ تا ۱۵۵۶	(۴) مر قی نظام شاہ ۹۹۲ھ تا ۹۹۶ھ ۱۵۹۷ تا ۱۶۰۱
(۵) محمد قلی قطب شاہ ۱۰۲۰ھ تا ۱۰۲۱ھ ۱۶۱۱ تا ۱۶۱۲	(۵) علی عادل شاہ بن ابراہیم ۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ ۱۵۸۱ تا ۱۶۱۱	(۵) میرا حسین نظام شاہ (دو ماہ چند روز) ۹۹۶ھ تا ۹۹۷ھ ۱۶۰۱ تا ۱۶۰۲
(۶) محمد قطب شاہ برادر زادہ محمد قلی۔ ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۳۶ھ ۱۶۲۶ تا ۱۶۲۷	(۶) ابراہیم عادل شاہ ثانی ۱۰۳۴ھ تا ۱۰۳۶ھ ۱۶۲۴ تا ۱۶۲۶	(۶) اسماعیل بن برہان نظام شاہ ۱۰۳۶ھ تا ۱۰۳۷ھ ۱۶۲۶ تا ۱۶۲۷
(۷) عبداللہ بن محمد قطب شاہ ۱۰۴۳ھ تا ۱۰۴۴ھ ۱۶۳۳ تا ۱۶۳۴	(۷) محمد عادل شاہ ۱۰۳۶ھ تا ۱۰۳۷ھ ۱۶۲۶ تا ۱۶۲۷	(۷) ابراہیم بن برہان نظام شاہ (ثانی) چند ماہ ۱۰۳۷ھ تا ۱۰۳۸ھ ۱۶۲۷ تا ۱۶۲۸
(۸) ابوالحسن تا انتزاع سلطنت ۱۰۹۶ھ ۱۶۸۶	(۸) علی عادل شاہ (ثانی) ۱۰۸۲ھ تا ۱۰۸۳ھ ۱۶۷۲ تا ۱۶۷۳	(۸) اس کے بعد گرجہ آئندہ چارلس ترک اس کے بعد احمد نگر سلطنت مغلیہ سے بچ گئی اور قوت قوت غلامان شاہی کے افراد کو بادشاہ بناتے رہے لیکن یہ برائے نام بادشاہ تھے اور اسی ہی حکومت کا بھی ۱۰۴۳ھ کے اوخر میں خاتمہ ہو گیا۔ ۱۰۴۳ھ ۱۶۳۳

دوسری فصل اکبر کی فتوحات و کن



وضع رہے کہ مالوے کی فتح نے مغلیہ سلطنت کی حدیں بہت دن پہلے خاندیس کی آزاد ریاست فاروقیہ سے لاوی تھیں اور یہ ملک وکن کا وہ شمالی قطعہ ہے جو ادوی نربدا کے ختم ہوتے ہی سرست پڑا کی پہاڑیوں سے شروع ہوتا ہے اور دریائے تپتی کے زرخیز طاس کو وسط میں چھوڑ کر جنوب میں برار کی پہاڑیوں سے آگیا ہے جن کا سلسلہ خاندیس کی مشرقی حد بنا ہوا شمال میں ادوی نربدا کی مشرقی پہاڑیوں تک چلا گیا ہے۔ لیکن مغرب میں سورت و بڑوچ کے ساحلی اور کوہستانی اضلاع خاندیس میں داخل نہیں اور فاروقی حکومت کے عہد میں بھی سلطنت گجرات کے تابع تھے۔ اس طرح مولویوں صدی عیسوی کے شروع ہی سے ہم اس چوٹی سی سلطنت کو گجرات و مالوہ اور برار و احمد نگر کے حریفوں میں گھرا ہوا پاتے ہیں اور بے شبہ یہ واقعہ وہاں کے حکمرانوں کی بڑی قابلیت کا ثبوت ہے کہ پشت پائست تک نہ صرف خاندانی درختے کو بچائے رہے بلکہ اکثر اپنے قوی تر ہمسایوں کے معاملات میں انھوں نے شریک غالب کی حیثیت سے حصہ لیا اور غلوں کو بھی ایک عرصے تک جدوجہد کے بغیر اپنے ملک پر قابض نہ ہونے دیا۔

مگر ظاہر ہے کہ مغل کشورستانوں کے ساتھ ان کی جنگ برابر والوں کی طرح نہ ہو سکتی تھی اور اس بات کا اندازہ ان کے نویں فرمانروا میراں مبارک شاہ نے اکبری فتوحات کے آغاز ہی میں کر لیا تھا چنانچہ ۱۵۶۱ء میں جب اکبر لیکا ایک مالوے آیا اور اس کے صوبہ دار عبداللہ خاں ازبک نے گجرات کی راہ لی اور بادشاہ کو ازمرنہ صوبہ مالوہ کا انتظام کرنا پڑا تو میراں مبارک شاہ نے بطور خود اکبری سیات و شہنشاہی تسلیم کر لی اور اس کی بیٹی کو بادشاہ نے زوجیت میں لے کر اس اتحاد کی تصدیق کی۔ نیز کچھ روز بعد اسی میراں مبارک شاہ کے ایک فرزند راجہ علی خاں کو ہم بادشاہی ملازمت میں منسلک پاتے ہیں جو اپنے بھائی کے بعد ۱۵۶۹ء میں خاندیس آکر وہاں کا فرماں روا ہو گیا تھا۔

اس کی حکمت عملی بھی وہی تھی کہ مغلوں کی سیادت کو تسلیم کرنے کے باوجود انھیں وکن کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا روادار نہ تھا اور جس وقت تفضی نظام شاہ و مالی احمد نگر کے چند امرا اپنی حکومت سے گروا کر اگر سے کی جانب فرار ہوئے کہ اکبر کو تسخیر وکن پر ابھاریں

توراجہ علی خاں نے ان کو راستے میں روکا اور سمجھایا کہ منگلوں سے اپنے اندر دینی معاملات میں مدد لینے کا وہی نتیجہ ہوگا جو ابراہیم لودھی کے عہد میں سلطنت دہلی کا ہوا تھا۔ اور یہ غلامی دکن کی آزادی کا خاتمہ کر دے گی۔ پھر ان وطن فروش امرائے اس کی نصیحت نہ مانی اور چھپ کر برہان پور سے چل دیے توراجہ علی خاں نے ان کو گرفتار کرنا چاہا لیکن یہ لوگ لڑ بھڑ کر جس طرح ممکن ہوا دریائے نربدا سے پار ہو گئے (۱۵۹۲ء)

واضح رہے کہ ترقی نظام شاہ کا بھائی برہان ابن حسین نظام شاہ پہلے سے دربار اکبری میں پناہ گزین تھا ان امرائے احمد نگر کے اگرے پہنچتے ہی اکبر کو کہہ دیا کہ ہمیشہ درمیں تسخیر دکن بود و فرصت انتظار می نمود نظام شاہی ریاست پر فوج کشی کا نہایت عمدہ موقع مل گیا اور ۱۵۹۲ء میں خان اعظم میرزا عزیز کو کہانا مژدہ دیا گیا کہ ان پناہ گزینوں کو ساتھ لے کر احمد نگر پر پیش قدمی کرے۔ خاندیس کا ملک افواج اکبری کے راستے میں تھا اور راجہ علی خاں سے برابر پیغام سلام ہو رہے تھے کہ اس حملے میں شہنشاہ کی معاونت کرے لیکن یہ دورانیش سردار خوب سمجھتا تھا کہ احمد نگر کی فتح کے بعد فاروقیوں کی خیر نہ ہوگی لہذا منگلوں کے اس پہلے حملے میں اس نے علانیہ احمد نگر کا ساتھ دیا اور کچھ ان ریاستوں کی متحدہ قوت کچھ اپنے بعض ماتحت سرداروں سے بدگمانی کی بنا پر میرزا عزیز کو جمع کر بڑی لڑائی لڑنے کی تہمت نہ پڑی اور وہ برار میں ایچ پور تک بڑھ کر مغربی خاندیس (سندربار یا نڈو بار) کے راستے گجرات چلا آیا کہ از سر نو فوج اچھی سامان فراہم کرے گا

لیکن ان تیاریوں اور ارادوں کا عرصہ تک کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلا اور اس آٹناہیں اندونی فساد

علامیرزا عزیز دتو (۱۵۹۳ء) اکبر کا رضاعی بھائی اور مشہور سپہ سالار ہے۔ گجرات و بنگال میں بڑی لڑائیاں لڑا اور پنجہزاری کے منصب تک ترقی کی۔ اس کی دو بیٹیاں خاندان شاہی میں منسوب تھیں اور اکبری وفات کے وقت وہ اپنے داماد شہزادہ خسرو بن جہانگیر کی تخت نشینی کا خواہاں تھا اسی بنا پر جہانگیر اور نیز شاہ جہاں اس سے خوش نہ تھے اور اپنی بے باکی کی بدولت اسے کئی مرتبہ قید و محرومی کی سزا ملی۔ باریہ خاندان شاہی سے اس کے دیرینہ تعلقات نیز جنگی اور ملکی قابلیت کی بدولت پھر منصب پر بحال کر دیا جاتا تھا اکبری تاریخوں میں جابجا اس کے حالات تحریر ہیں نیز دیگر آثار الامراء ص ۶۵، ۶۶، ۶۷ اس پہلے حملے کی ناکامی کا اکبری تاریخوں میں بہت محل بیان ملتا ہے۔ مگر وہیں ہدی کے اخیر (۱۵۹۳ء) تک

حسین نظام شاہ ثانی کی وفات ۹۹۹ھ اور دو ڈھائی سال کے سیاسی خلفشار کے بعد ۱۵۸۹

تاریخ فرشتہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۵) شمالی دکن کی تاریخ کا بہترین ماخذ تانویخ فرشتہ (مقالہ سوم و ششم) ہے جس کا مولف محمد قاسم ہندو شاہ استر آبادی المعروف بہ فرشتہ اس وقت بیجا پور میں اپنی مشہور کتاب تالیف کر رہا تھا اس کی ولادت کا سنہ ۹۵۵ھ (۱۵۵۱ء) کی قدر شدہ ہے لیکن اتنا خود اس کی کتاب سے ثابت ہے کہ وہ اپنے وطن استر آباد (ایران) سے باپ (غلام علی ہندو شاہ) کے ہمراہ بچپن ہی میں احمد نگر آ گیا تھا اور سلطان مرفعی نظام شاہ کے ہجر بعد نیز کچھ عرصے بعد تک اسی سرکاری ملازم رہا۔ اس کی پہلی قدردانی بیجا پور آ کر ہوئی جہاں ابراہیم عادل شاہ نے اسے ہندوستان و دکن کے اسلامی سلاطین کی تاریخ لکھنے کا حکم دیا۔ یہ سنہ ۱۵۹۱ء یا کچھ پہلے کا واقعہ ہے اور جیسا کہ مولف نے دیباچے میں تحریر کیا ہے اس کی تاریخ جس کا اصلی نام ”گلشن ابراہیمی“ یا ”فوس نامہ“ تھا ۱۵۹۶ء میں پوری ہو گئی تھی لیکن بعد میں جب تک وہ زندہ رہا جا بجا اصلاح و اضافہ کرتا رہا۔ اس کی وفات کا سنہ ۱۵۹۶ء ٹھیک معلوم نہیں۔ قرینہ کہتا ہے کہ ۱۶۲۳ء یا اس کے کچھ بعد اس کا انتقال ہوا۔ یہ کتاب سو لہویں صدی عیسوی کے اخیر تک اسلامی سلاطین ہند کی سب سے جامع فارسی تاریخ اور طبقات اکبر نامی کا نقش ثانی ہے بلکہ ریاست ہائے دکن کے حالات جس تفصیل سے فرشتہ نے لکھے ہیں، طبقات میں موجود نہیں۔ اس کے قبول عام کی دوسری وجہ تحریر کی خوبی اور سستگی ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ مورخ جس طرح قدیم اصول تاریخ نویسی کے مطابق واقعات کو جمع کرنے کا سیدھا دیکھتا ہے اسی طرح نہایت ہنرمند انداز ہے۔ یہ تصوری جملے سے پہلے کے حالات لکھنے میں اس نے بعض بعض غلطیاں کی ہیں اور یہ جتنا بے بیہوشی چاہا وہ نہیں کہ کہیں کہیں عبارتیں کی عبارتیں طبقات اکبری سے نقل کر لی ہیں۔ بائیں ہر مجموعی طور پر اس کی تاریخ اس موضوع پر بہترین کتابوں میں داخل ہے اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانے کی انگریزی تاریخیں بالعموم اسی کے انگریزی ترجموں سے ماخوذ ہیں۔

انگریزی ترجمہ

مگر ان نام نہاد مترجمین کی تحریروں کو ترجمہ، کہنا اور حقیقت لوگوں کو صریح فہم دینا ہے اور مورخ گن سے لے کر سچر اور فیملک خود ان مغربی اہل تحقیق نے جنہیں اسلامی تاریخ یا فارسی زبان کی واقفیت ہے ان ترجموں کو نہایت ناقابل اعتبار سمجھا ہے بالخصوص رادرفی نے اپنے فاضلانہ ترجمہ ”طبقات ناصری“ کے حواشی میں ان انگریزی ترجموں کی بخوبی قلمی کھولی ہے اور جا بجا اصل عبارت کو لکھ کر دکھایا ہے کہ مترجم نہ صرف اصل مطلب نہیں سمجھتے بلکہ بعض اوقات بالکل الٹے معنی بیان کرتے ہیں اور انھوں نے اپنی ناقابلیت چھپانے کے لئے یا محض بہ اقصائے تعصب، صریح کذب و افتراء بھی

باب

اسی برہان (ثانی) بن حسین نظام شاہ نے جس کی دستگیری میں اکبری حملہ بیکار ثابت ہوا تھا، راجہ علی خاں فاروقی کی مدد سے ریاست احمد نگر پر قبضہ حاصل کر لیا اور اس کے جیتے جی مغلوں کو احمد نگر کا رخ کرنے کی جرات یا فرصت نہ ہوئی۔ لیکن چند ہی سال میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ۱۵۹۹ء اور نظام شاہی ریاست میں اسی قسم کی بلکہ زیادہ شدت کے ساتھ فرقہ بندی اور خانہ جنگی شروع ہو گئی جس نے پہلے مغلوں کو محلے کا موقع دیا تھا اور خود وہاں کے بعض امرا پھر اکبر کی امداد کی درخواست کرنے لگے۔ اس اندرونی فساد نے ریاست احمد نگر کو ایک بڑا نقصان پہنچایا کہ اس کا دور اندیش حلیف راجہ علی خاں نظام شاہیوں کے مستقبل سے مایوس ہو گیا اور اب اسے اپنی سلاطی اسی میں نظر آئی کہ خود بھی مثل حملہ آوروں کی اس فوج کے ساتھ ل جانے جو اکبر کے منجھلے بیٹے شہزادہ ہمایوں اور میرزا عبدالرحیم خان خاناں کے ماتحت گجرات و مالوے سے احمد نگر پر بڑھ رہی تھی۔ ۱۵۹۹ء اس فوج کی کل تعداد تیس ہزار سوار بتائی گئی ہے (فرشتہ، جلد دوم صفحہ ۱۵۹) اور اس قلت کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کو مزاحمت یا کسی بڑی جنگ کی توقع نہ تھی وہ محض احمد نگر کے امیر میاں منجھو کی امداد کے حیلے سے آئے تھے اور اس شخص کو جو ظاہری طور پر ایک لڑکے کو بادشاہ بنا کے خود ریاست کا مختار بن بیٹھا تھا اور بار کے بعض جشی سرداروں نے محصور کر رکھا تھا اور اسی نے مغلوں سے امداد کی درخواست کی تھی۔ لیکن ان کے آتے آتے یہ جھگڑے ایک حد تک آپس ہی میں طے ہو گئے۔ میاں منجھو کو مغلوں کے بلانے سے پشیمانی ہوئی اور اب شہر کو شہزادی چاند سلطان کے سپرد کر کے وہ بیجا پور و گولکنڈہ جا رہا تھا کہ وہاں کے بادشاہوں کی مدد لے کر اس بلا کو دفع کرے جو خود اس کی بلانی ہوئی تھی۔ کیونکہ مغلوں نے امداد کا بہانہ چھوڑ کر اب علانیہ احمد نگر کی تخریب کا سامان کیا اور شہر پناہ کے باہر بعض محلوں پر

حاضرہ احمد نگر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کام لیا ہے، اب قیاس کرنا چاہئے کہ ہندوستان کی جو تاریخیں "ایسے عجیب" ماخذ پر مبنی ہوں گی، وہ کیسی ہوں گی؟

(ان ترجموں میں سب سے اول سیر ڈاؤن نے صرف سلاطین دہلی کے حالات کا ترجمہ شائع کیا تھا (۱۷۷۷ء) بعد میں اضافے ہوتے رہے اور آخر میں مکمل اور سب سے اچھا ترجمہ وہ سمجھا جاتا تھا جسے جرنل برگزٹ نے ۱۸۹۷ء میں شائع کیا۔ مگر جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا یہ سب ترجمے غلط سے ملے اور ناقابل اعتبار ہیں اور سرسری ایٹ جنھوں نے ان مترجموں کی ایک حد تک وکالت و حمایت کی ہے (جلد ششم صفحہ ۲۰۰) خود انہی کی مدین شامل ہیں!)

قابلض ہو گئے!

بایں ہر شہزادی چاند سلطان یا چاند بی بی نے بہت نہاری وہ احمد نگر کے تیسرے بادشاہ حسین نظام کی بیٹی تھی اور ہم حاشیے میں بتا چکے ہیں کہ اس کی شادی علی عادل شاہ بجا پور سے ہوئی تھی اس بادشاہ کی وفات ۹۸۸ھ کے بعد یہ بجا پور میں رہی اور چونکہ اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی مکن تھا اس لیے اسی کو ملک کی سیاسی رہنمائی کرنا پڑی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احمد نگر کے آخری قیادات کے وقت یہ نظام شاہی پائے تخت میں موجود تھی۔ ایسے نازک وقت میں تمام فریقوں کا اسے حکم اور سرداران لینا ہی چاند سلطان کی مشہور و مسلمہ قابلیت کی دلیل ہے۔ غنان اقتیارات ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے اس نے اپنے بھتیجے ابراہیم نظام شاہ کے بچے بہادر کی بادشاہی کا اعلان کروایا اور اس کے بعد اپنی دلیری اور خوش انتظامی کے ساتھ حاکم کا مقابلہ کیا کہ ان کے دل چھوٹ گئے اور کچھ سامان رسد کی کمی اور کچھ بجا پور کی ملک آنے کی خبر سن کر وہ مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔

(۳) الحاق برار

بے شبہ چاند سلطان کی مردانہ حب وطن اور قابلیت نے شہر احمد نگر کو دشمنوں سے بچا لیا۔ لیکن اہل وطن کی اصلی کمزوری کا وہ کوئی علاج نہ کر سکتی تھی اور اسی لئے اسے شرائط صلح میں اضلاع برار سے دست بردار ہونا پڑا جہاں کے امرا پہلے ہی دربار احمد نگر سے منحرف تھے۔ اس معاہدے سے ریاست احمد نگر کا نہ صرف شمالی علاقہ مغلوں کے قبضے میں آ گیا بلکہ بجا پور اور گونڈے کی امدادی فوج سے لڑنے کے لیے وہ گوداوری کو عبور کر کے سرکار عالی کے موجودہ نائیک بڑھ آئے اور کہنا چاہئے کہ دکن کی دونوں جنوبی ریاستوں سے بھی بالواسطہ ان کی لڑائی چھڑ گئی۔ لیکن اس صلح نامہ سے احمد نگر کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ مغلوں کے ہتھے ہی احمد نگر کے بے وفائے پھر سیاسی انتشار پیدا کر دیا۔ جن لوگوں کو ملک چاند بی بی نے سلطنت کی وزارت تفویض کی تھی بے وفائیت ہوئے اور جب ملک سے ان بن ہو گئی تو مغلوں کو دعوت دینی شروع کی۔ مغسل تو منتظر ہی تھے۔ دوسرے ہی سال عبدالرحیم خانخاناں اور شہزادہ مراد حملہ کرنے کے لئے بڑھے۔ احمد نگر میں تو کوئی فوجی طاقت نہیں تھی۔ بجا پور کے مشہور جنرل سہیل خاں نے اس کا مقابلہ کیا۔ دریائے گوداوری کے کنارے سوپہ کے مقام پر یہ لڑائی ہوئی جنوری ۱۵۹۶ء یہ اگرچہ شہنشاہ فوج کا مقابلہ تھا جس کی کمان خانخاناں اور شہزادہ مراد کے ہاتھ میں تھی اور شاہ رخ مرزا اور راجہ علی خاں والی خاندیس بھی فوج میں تھے لیکن سہیل خاں کی مردانہ بہت

کی وجہ سے سخت محو کہ ہوا اور مغلوں کو بڑی مشکل سے کامیابی ہوئی اور حیر سے سہیل خاں اور مغلوں کی طرف سے راجہ علی خاں میدان میں کھیت رہے اس کا سببی کے بعد سفل آسانی سے احمد نگر پر قبضہ کر سکتے تھے لیکن مراد اور خانخاناں کی نا اتفاقی سے کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی اور سفل فوج اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

الحاقی خاندیس

راجہ علی خاں فاروقی نے اپنی پوتی کو شہزادہ مراد سے منسوب کر کے بظاہر اپنے آئندہ استقلال کا مزید اطمینان کر لیا تھا لیکن سوہیہ کی لڑائی میں یہ مارگیا (۱۵۹۹ء) اور تقدیر سے شہزادہ مراد نے چند ماہ بعد برار میں وفات پائی۔ اور حکومت خاندیس کا نیا وارث بہادر خاں (راجہ علی خاں) ایک نا تجربہ کار و عیش دوست آدمی نکلا یہ اپنے باپ کی طرح مغلوں کا دوست نہیں تھا چنانچہ دکن کے نئے صوبہ دار اور خانخانان کی فوجیں خاندیس میں سے ہو کر گزریں تو اس نے خیر مقدم سے پہلو تہی کی خود دانیال نے اس کی خبر لینی چاہی لیکن خود اکبر معاملات دکن کو صاف کرنے کی نیت سے ماند میں پہنچ گیا (۱۵۹۹ء) تو خاندیس و احمد نگر کی رہی سہی آزادی کا خاتمہ ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی اور گو قلعہ اسیر گڑھ کو بلند پہاڑیوں پر اس اتہام و استحکام سے بنایا گیا تھا کہ اس زمانے کے آلات قلعہ کشائی کارگر نہ ہو سکتے تھے۔ نیز بہادر نے طویل سے طویل محاصرے کی پیش بندی میں دس برس کا آذوقہ فراہم کر لیا تھا۔ اسی وجہ سے ایک سال سے زیادہ اس کا محاصرہ کرنا پڑا اور فتح اس طرح ہوئی کہ محاصرے میں شہر کے اندر وبا پیدا ہوئی اور بعض دیگر اوبام نے بہادر کو اس درجہ خوف زدہ کیا کہ اس نے ہتھیار رکھ دئے اور دعویٰ حکومت سے دست بردار ہو گیا۔ خاندیس کا مستقل طور پر سلطنت مغلیہ سے الحاق کر لیا گیا (۱۵۹۹ء) اور بہادر کی زندگی کے باقی دن معمولی امیر کی حیثیت سے شاہان مغلیہ کے دربار میں بسر ہوئے ۶

فتح احمد نگر

پہلے محاصرے کے بعد سفل سرداروں نے صرف برار پر قناعت نہ کی تھی اور جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں احمد نگر کے جنوب مشرقی اضلاع پر بھی دست تصرف دراز کر رہے تھے۔ امرائے احمد نگر بجا پور اور گو لکنڈے کی مدد سے ان کے خلاف جا بجا جدوجہد کر رہے تھے اسی وجہ سے ۱۵۹۹ء میں سوہیہ کی لڑائی ہوئی لیکن صدر حکومت کی کمزوری اور اندرونی نفاق کی وجہ سے خاطر خواہ کوئی تدارک ممکن نہ تھا اور اکبر نے خاندیس پہنچ کر اس رہی سہی بادشاہی کے بھی خاتمہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اسیر گڑھ کے محاصرے کے ساتھ امیر رزا عبد الرحیم کو احکام بھیج دئے گئے کہ برار و دولت آباد کی طرف سے تمام مغلیہ فوجیں سمیٹ کر پہلے احمد نگر کو

فتح کر لے کہ صدر حکومت کے خاتمے سے دیگر امراء نے نظام شاہی کی ہمتیں پست ہو جائیں۔
 الغرض محل افواج نے دوبارہ شہر احمد نگر کو گھیر لیا۔ ^{۱۵۹۹} ۱۵۹۹ء اور اس مرتبہ چاند سلطان کو
 مصلحت اسی میں نظر آئی کہ بہادر شاہ فدا دینی کی طرح قلعہ محاصرین کے حوالے کر دیا جائے۔
 لیکن اس کے فوجی سرداروں نے یہ مشورہ نہ مانا اور کچھ بڑی اور کچھ عذاری کے شبہ پر
 اس نامور خاتون کو قتل کر دیا۔ ان کی یہ ظالمانہ منہاکی احمد نگر کو نہ بچا سکی۔ مغلوں نے سنگ لگا کر
 فصیلوں میں رخنے ڈال دیے اور قلعے میں گھس کر ایسا قتل عام کیا کہ فرشتے کے قول کے بموجب
 تمام بہادر بادشاہ بہادر نظام شاہ کے سوائے کوئی ان کی تلوار سے زندہ نہ بچا۔ ^{۱۶۰۱} ۱۶۰۱ء
 بایں ہمہ اہل احمد نگر نے اغیار کے طوق حکومت کو خود گٹھے میں ڈالنے کا ننگ گورانہ کیا اور ان کے
 جو سردار ادھر ادھر منتشر تھے یا فتح سے کچھ پہلے نکل گئے تھے وہ بھی سالہا سال تک
 اپنی آزادی کے لئے مغلوں سے جدوجہد کرتے رہے۔ چنانچہ گو شہر احمد نگر کی تسخیر کے ساتھ ہی
 ”نظام شاہی ریاست“ کے سلطنت مغلیہ میں الحاق کا اعلان کروایا گیا تھا لیکن حقیقی طور پر
 اس الحاق کی تکمیل سینتالیس برس کے بعد ہو سکی جس کا حال آگے آتا ہے۔

تیسری فصل :- جہانگیر و شاہجہاں

خاندان احمد نگر کی تسخیر نیز ابراہیم عادل شاہ والی بیجا پور سے سالانہ ”پیشکش“
 یا خراج گزاری کا اقرار لے کر خود اکبر آگرے چلا گیا اور دکن کے تین نئے صوبے میرزا عبدالرحیم
 خانخاناں کی آمانت میں اپنے چھوٹے بیٹے شہزادہ دانیال کے سپرد کر گیا تھا جسے تھوڑے
 عرصے بعد بیجا پور کے بادشاہ نے اپنی بیٹی بیادہ کی کہ مغلوں کے ساتھ نئے اتحاد کو مزید توثیق پہنچائی جائے۔ لیکن
 ظاہر ہے کہ اسی قسم کی غلطی یا مجبوری تھی جس نے خاندان کے معاملات میں مغلوں کو مداخلت کا موقع دیا تھا چنانچہ
 انجام کار حکومت بیجا پور بھی وہی گزری جو طاقتور مغلوں سے تعلق ہونے کی بدولت خاندان پر گزری تھی۔
 مگر یہ بعد کے واقعات ہیں۔ خود اکبر کو اوڑھے پور و بنگالہ کی طرح بیجا پور ایک طرف
 فتح احمد نگر کی خاطر خواہ تکمیل کی فرصت نہیں ملی۔ اور گو خوشامدی جو تیشوں اور پنجابیوں نے

اکبر کی وفات

۱۶۰۵ء تا ۱۶۰۶ء میں دوم صفیہ ۱۶۰۶ء بہادر نظام شاہ کو قتل کروایا گیا تھا اور ایک عرصے بعد وہیں اس نے وفات پائی۔

درازی عمر کے یقینی حکم لگا کر بادشاہ کے دل میں طرح طرح کی مہموم آرزوئیں پیدا کر دی تھیں لیکن دکن سے مراجعت کو تین چار سال ہی گزرے تھے کہ وہ آگرے میں بیمار ہوا اور تقریباً پینسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (جمادی الثانی ۱۰۱۱ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۶۰۵ء) اور تر کے میں اتنی بڑی اور دولتمند و خوشحال سلطنت چھوڑی کہ سلطنت عثمانیہ کے سوائے دنیا کی کوئی ہم عصر سلطنت اس کے برابر نہ تھی!

جہاںگیر

۱۰۱۱ھ تا ۱۰۲۷ھ
۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء

اکبر کے دونوں چھوٹے بیٹے اس کی زندگی میں انتقال کر گئے تھے اور اگرچہ ولیعہد سلطنت یا بڑے بیٹے شہزادہ سلیم سے آخری ایام حکومت میں وہ کئی مرتبہ ایسا ناخوش ہوا کہ عجب نہ تھا کہ خاتمہ جنگ کی نوبت پہنچ جائے بایں ہمہ بعض اہلکار کی یہ کوشش کہ اس شہزادے کے فرزند خسر و کو اپنے دادا کا جانشین بنایا جائے۔ کارگر نہ ہو سکی نئے بادشاہ کا جہاںگیر کے لقب سے اعلان تخت نشینی ہوا اور جب شہزادہ خسر و نے پائے تخت سے بھاگ کر کچھ فتنہ و فساد پکڑا چاہا تو اس وقت بھی بہت جلد اس کا تدارک کر دیا گیا اور خسر و کی باقی زندگی قید میں ہی گزری۔

دکن کی لڑائیاں

جنگالے اور اوڑے پور کی فتوحات میں جو کسر باقی رہ گئی تھی، وہ جہاںگیر کے عہد میں پوری ہوئی جس کا ہم اوپر تذکرہ کر چکے ہیں۔ لیکن ریاست احمد نگر پر کامل قبضہ حاصل کرنے میں ان دونوں قہات سے کہیں زیادہ اہتمام اور دوسری کی ضرورت تھی اور جس وقت وہاں کے ایک حبشی سردار ملک عنبر نے خاندان نظام شاہی کے نئے وارث، مگر کھنڈی نظام شاہ کی (جو اس خاندان کے دوسرے مانروا برہان کا پوتا تھا) بادشاہی تسلیم کر لی تو چند سال کے واسطے اس ریاست کے بے جان قالب میں گویائی روح پیدا ہو گئی ملک عنبر غضب کا مستعد منتظم اور دور اندیش سپہ سالار تھا۔ اگرچہ اس کی حکومت پوری طرح سرکار عالی کے موجودہ صوبہ اوزنگ آباد اور صوبہ بیگی کی قیمت وسطی (سنٹرل ڈویژن) کے تمام اضلاع پر بھی نہ چلتی تھی تاہم اپنے زیر اثر علاقے کے شاید ہر قابل جنگ آدمی کو اس نے سپاہی بنا دیا تھا اور درحقیقت اسی حبشی سپہ سالار کی کوشش کا ثمرہ تھا کہ یہاں کے مرہٹے باشندے بن حیث القوم فنون جنگ سے آشنا ہوئے اور انھیں "قزاقانہ جنگ" کے ان طریقوں کی مشق و مہارت ہوئی جو بعد میں اہل دکن بالخصوص مرہٹہ سپاہیوں کی خصوصیت سمجھی جانے لگی تھی۔

چند سال تک دکن کے مغل صوبہ دار ملک عنبر سے الجھتے اور اپنے طور پر اس کی دست و رازیوں کا سد باب کرتے رہے۔ لیکن جب ۱۰۱۹ھ میں اس نے دولت آباد کے

علاقے سے بڑھ کر خسائیس پر پورش کی بلکہ نربدا کو اتر کے مالوے کے بعض جنوبی اضلاع بھی تاراج کر گیا تو بادشاہ کروسیح پیمانے پر جنگی ہم کی تیاری کرنی پڑی اور اودے پور کا ٹکڑے کا فاتح شہزادہ خرم افواج دکن کی سپہ سالاری پر مامور ہوا (۱۶۲۹ء)۔

یہ شہزادہ جس کے عہد بادشاہی کے غیر معمولی تزک و احتشام اور بزم پیش و فراغت کی دھوم دھام نے، اس کے جنگی کارناموں کو چھپا لیا ہے، و حقیقت فن حرب کا ماہر اور اپنے زمانے کا نہایت کامیاب سپہ سالار تھا۔ آج کل ذاتی شجاعت و سپہ گری کی چنداں قدر نہیں ورنہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی سے زیادہ سالہ موجود ہے کہ (فتح میر سے پہلے) خاندان تیوری کا ہر فرماں روا شیر دلی اور بہادری کے اعتبار سے جو افراد ان روزگار میں شمار ہونے کے لائق ہے لیکن سپہ سالاری کا کمال یہ مانا جاتا ہے کہ ہم کو غنیم لڑنے پر مجبور نہ کر سکے بلکہ ہم جب اوجہاں چاہیں وہاں اسے جنگ کرنے پر مجبور کر دیں۔ شہزادہ خرم کی راجپوتانہ اور دکن، دونوں ملکوں کی لڑائیاں فن حرب کی اسی مہارت کی نظیر ہیں کہ دونوں جگہ دشمن کو ایک وسیع اور پہاڑی ملک میں پناہ لینے کے موقعے حاصل تھے اور اس کی ساری کوشش ہی یہ تھی کہ مغلوں سے میدانی جنگ کی نوبت نہ آئے بلکہ تنگ مقامات پر قزاقانہ تاخت اور ناگہانی حملوں سے ان کی ہمت اور قوت کمزور کر دیکر اسی دوران کی سردر سانی میں اس قدر مشکلات پیدا کر دی جائیں کہ وہ طوعاً و کرہاً ملک سے دفع ہو جائیں۔ اہل دکن کو سرد روکنے کے لئے خود اپنا ملک تاراج کرنے میں باک نہ تھا اور اٹھ و سس برس کی پیہم جنگ و جدال میں وہ نہ صرف نہایت مشاق اور تیر دست سپاہی ہو گئے تھے بلکہ مغلوں کے خلاف ان کی جدوجہد میں بعض اوقات اس مایوسانہ جانبازی کی شان نظر آتی ہے جس نے اودے پور جیسی چھوٹی ریاست کے باشندوں کو ساہا سال تک مغلوب ہونے دیا تھا۔ لیکن شہزادہ خرم کی جنگی تدابیر و شجاعت نے ملک عبرت کے تمام منصوبے الٹ دیے شمالی دکن کے چتے چتے سے عبرت کی واقفیت، دکنی سپاہیوں کی بہادری اور گریز پانی، کوئی شے کارگر نہ ہوئی۔ تھوڑے ہی دن بعد دکنی دستے نہ صرف جا بجا سے پسپا ہو کر مرکزی مقامات کی طرف منتھنے لگے بلکہ صاف نظر آنے لگا کہ ان کا حریف مقامی واقفیت اور ایک بہ یک حملہ کرنے کے فن میں خود ان سے چار قدم آگے ہے۔ چنانچہ ایک ہی سال (۱۶۳۰ء) کے اندر اہل دکن کو بالکل اپنے منشا اور مصلحت کے خلاف و دیاتین میدانوں میں مجبوراً لڑائی لڑنی پڑی اور ہر جگہ انھوں نے سخت نقصان اٹھایا کیونکہ اس میں کوئی کلام نہ تھا کہ جنگی ساز و سامان اور کھلے میدان کی

شہزادہ خرم کی سپہ سالاری

درباری ساڈیں

لڑائی لڑنے میں مغل اہل دکن پر برتری رکھتے تھے۔

اب ملک خیر صلح پر آمادہ تھا۔ مغل فوجیں بھی زیادہ عرصے تک ایسے ملک میں جہاں کئی فصل سے زراعت نہ ہوتی تھی۔ قیام نہ کر سکتی تھیں۔ لہذا آئندہ اطاعت و خراج گزاری کے عہد و پیمان پچھلے خراج کی رقوم کی ادائی اور احمد نگر کے شمالی اضلاع سے دست برداری کے اقرار پر شہزادہ خرم نے اسے امان دیدی اور خاندیس و برار کی جانب فوجیں واپس ہٹا لایا۔ مگر ملک عمر کی فوجی قوت اس قدر مضبوط ہو گئی تھی کہ تھوڑے سے وقفے کے بعد آئندہ جب کبھی مغل فوج کشی کرتے اپنے حریف کو یا مال کر ڈالتے لیکن اس کی نوبت نہ آئی تھی کہ بعض نئے واقعات نے دربار جہاںگیر میں سخت انتشار پیدا کر دیا اور اس کی حکومت کے آخری چند سال انھی درباری سازشوں میں ختم ہوئے جن کی اصلی ذمہ دار بادشاہ کی محبوب ملک نور جہاں بیگم تھیں۔

ہوایہ کہ سنہ مذکور میں بادشاہ سخت بیمار ہوا اور امیروں میں اس کی وراثت کے متعلق سرگوشیاں ہونے لگیں۔ جہاںگیر کا بڑا بیٹا خسر و قید میں تھا اور اسی سال اس نے وفات پائی اور بعض راویوں نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ اُسے شہزادہ خرم کے ہوا خواہوں نے زہر دے دیا۔ دوسرا بیٹا پیر ویز میرٹھ دوست لالہ بلی مزاج شہزادہ تھا اور اسی طرح سب سے چھوٹا شہر یار اپنے بچھلے بھائی خرم کے مقابلے میں حکومت و بادشاہی کی کوئی امید نہ رکھ سکتا تھا۔ ادھر نور جہاں بیگم کے باپ نواب اعتماد الدولہ کے انتقال کے بعد قلمدان وزارت مرحوم کے فرزند ابو الحسن (المخاطب بہین الدولہ آصف خاں) کے سپرد ہو جس کی اقبال مندی ارجبندہ بالو بیگم شہزادہ خرم سے منسوب تھی اور ممتاز محل کے لقب سے دنیا کی مشہور و معروف خواتین میں داخل ہے پس ان سب اسباب نے مل کر نور جہاں بیگم کو یقین دلایا کہ تخت کا آئندہ وارث نظام شہزادہ خرم کے سوا دوسرے انھی دنوں متوحات دکن کے صلے میں شاہ کا لقب عنایت ہو گیا تھا اور دوسرے نہیں ہو سکتا۔ بایں ہمہ جہاںگیر کی صحت یابی اور اعتماد الدولہ کی وفات کے بعد محاطات سلطنت میں اپنا روز افزوں رسوخ و اثر دیکھ کر نور جہاں اس بات پر آمادہ ہو گئی کہ جس طرح ممکن ہو

شہزادہ خرم کی قوت کمزور کر دی جائے۔ دولت و حکومت کی چاشنی سے یقیناً اس کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ جہانگیر کے بعد بھی اس کے ذاتی اقتدار میں فرق نہ آئے اور اس نے اپنی بیٹی کو جو پہلے شوہر سے تھی، شہزادہ شہریار کے ساتھ ضرور اسی خیال سے منسوب کر دیا تھا۔ لیکن تاریخ نویسوں کا یہ عام قیاس کہ وہ شہریار ہی کو مالک ہند کا فرماں روا بنانا چاہتی تھی یا یہ کہ جہانگیر بالکل اس کی مرضی کا تابع ہو گیا تھا کہ وہ جو چاہتی کر لیتی، آسانی سے قابل تسلیم نہیں ہے۔

اس جگہ میں سب سے پہلے جہانگیر بادشاہ کے ذاتی خصائل یا مزاج کو سمجھنے کی کوشش کرنی پڑے گی حالانکہ اس کتاب میں اس قسم کی بحث چھیڑنے سے ایک حد تک احتراز کیا گیا ہے۔ حقیقت میں جب کہ ہم اپنے احباب و اقربا ملک کے ذاتی مزاج و خصلت کا اندازہ کرنے میں بعض اوقات سخت غلطی کرتے ہیں، تو قیاس کرنا چاہئے کہ گزشتہ اشخاص کے بارے میں کوئی قطعی رائے لگانا کس درجہ دشوار بلکہ بے اعتبار کی بات ہوگی؟ بہر نوع، مسلمہ تاریخی واقعات کو پڑھنے اور پرکھنے سے جہانگیر کے متعلق جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ گو اس نے تخت نشین ہو کر ”دین الہی البرکشاہی“ کے ان آئین و قوانین کو جن سے مسلمانوں کو سخت اختلاف تھا منسوخ کر دیا، تاہم خود وہ ایسا بے اصول، رند، مشرب سا آدمی ہے جس کا مطمح نظر صرف یہ ہو کہ دنیا کی زندگی کو اپنی خواہشوں کے مطابق عیش و آرام کے ساتھ گزار دیا جائے۔ ذہانت و فراست میں وہ کسی طرح اپنے باپ سے کم نہیں اور علمی قابلیت کے اعتبار سے کیسی افضل ہے۔ اسی طرح مطلق العنانی اور دواب شاہی کا وہ پاس و لحاظ جو سلطانِ مغل کی خصوصیت ہے اس میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے چنانچہ اس کے عہد میں نہ صرف ”زین بوس“ یا ”سجدے“ کی رسم جاری رہی بلکہ اسی قبیل کے بعض اور آئین وضع ہوئے کہ بادشاہ اور اس کی رعایا کے فرق مراتب کو نمایاں کیا جائے۔ وہ بہادری اور کشور کشائی کے جذبے سے خالی نہیں۔ لیکن عیش و دوست و آسانی پسند ہے اور کسی طویل جنگ کے مصائب برداشت کرنے کو ارا نہیں کرتا۔ البتہ اپنے اندرونی ملکی معاملات پر اس کی کافی نگرانی ہے اور وہ اتنی فہم و قابلیت رکھتا ہے کہ عہد اکبری میں نظم و نسق کے جو آئین جاری ہو گئے تھے ان پر اپنے ماتحتوں سے عمل درآمد کرتا رہے حتیٰ کہ انہی ”فرائض جہانداری“ کو خاطر خواہ ادا کرنے کے واسطے وہ بالعموم دن کے وقت شراب نہیں پیتا جس کی جوانی سے اسے لت پڑ گئی تھی۔ نیز اعلان کرتا ہے کہ

جہانگیر کے خصلت

رعایا میں سے شخص جس وقت چاہے بادشاہ سے مل سکتا ہے اور اس غرض سے ایک "زنجیر عدل" فیصلہ قلعہ کے نیچے تک لٹکائی جاتی ہے کہ دادخواہ قلعے کے باہر ہی سے زنجیر ہلا کر بادشاہ کو متوجہ کر سکے۔

سازشوں کا انجا

ایسے بادشاہ پر نور جہاں بیگم کا جسے خود جہانگیر نے معمولی درجے سے بڑھا کر اعلیٰ مرتبہ پر پہنچایا، ایسا قابو پایا جانا کہ اس کے خلاف نشانہ کوئی کام نہ کر سکے عقل میں نہیں آتا اور نہ واقعات اس خیال کی تائید کرتے ہیں۔ دوسرے جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، بہت ممکن ہے کہ اول اول نور جہاں شہزادہ خرم کی قوت توڑ کر صرف یہ چاہتی ہو کہ تینوں بھائیوں میں ممالک ہند کی اس طرح تقسیم ہو جائے کہ اس کے داماد شہریار کا بھی ایک حصہ ملک پر بادشاہانہ قبضہ رہے۔ امیر تیمور کی سلطنت اس کے پوتے اور پوتوں میں اسی طرح تقسیم ہو گئی تھی اور خود شہزادہ خرم بادشاہ ہو کر غالباً یہی چاہتا تھا کہ اس کے چاروں فرزند علیحدہ علیحدہ ممالک پر فرماں روا رہیں لیکن تیموری نسل کے ہندی شہزادے عزم و ہمت اور وسعت نظر میں اپنے اجداد سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے اور ان کے شوق شہنشاہی نے اس قسم کی کسی تجویز پر کبھی بھی ایسا عمل درآمد نہ ہونے دیا جو دیر پا ہوتا۔ دوسرے جہانگیر کی اولاد کے متعلق ایسی تقسیم کا کوئی منصوبہ تھا بھی تو آئندہ واقعات نے اسے بہت جلد درہم و برہم کر دیا اور چند ہی سال میں معاملات کی صورت اس قدر جلد جلد بدلی کہ آخری نتیجے کو اگر محض تقدیری فیصلہ کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔

قندھار

اصل یہ ہے کہ جس زمانے میں نور جہاں بیگم بادشاہ کو شہزادہ خرم سے ناراض کر دینے کی فکر میں تھی، ایرانیوں کے قندھار پر فوج کشی کرنے کی اطلاع ملی۔ شہر یا صوبہ ہمایوں کے وقت سے دولت ایران و ہند میں مابہ التزاع تھا اور اس ہر تہہ خود شاہ ایران اس کی تسخیر کے لئے بڑھا تھا (۱۶۱۹ء) لہذا جہانگیر نے شہزادہ خرم کے نام احکام جاری کئے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اپنی افواج کو لے کر دکن سے واپس آئے اور اس نئے خطرے کا دھیہ کرے۔ اس نئی مہم کو لے جانے کے صلے میں شہزادے نے جو مطالبہ پیش کیا کہ پنجاب کے اکثر اقطاع اسے بطریق جاگیر دے دیئے جائیں وہ بھی بادشاہ نے قبول کر لیا تھا بایں ہمہ اس نے موسم بارش کے عذر پر مالوے سے

بڑھنے میں بہت دیر کی۔ قندھار فتح ہو گیا اور اس موقع پر نور جہاں بیگم نے اگر بادشاہ کو یہ یقین دلادیا کہ یہ شہزادہ حکم کی تعمیل میں لیت و لعل کرتا ہے، تو یہ کچھ بے بنیاد بات نہ تھی بادشاہ شہزادہ حرم کی جانب سے مکدر ہو گیا اور اس نے قندھار کو واپس لینے کی مہم پر شہزادہ شہر یار کو نامزد کر کے احکام جاری کر دئے کہ جو بادشاہی فوجیں مالوے میں شہزادہ حرم کے ساتھ ہیں وہ بلا تاخیر آگرے پہنچ جائیں۔

یہ اور دیگر واقعات بادشاہ کی ناراضی کا کھلا ہوا ثبوت تھے اور اس حالت میں اگر شہزادہ حرم نے تمام فوج کے ساتھ آگرے کی طرف کوچ کیا تو جہانگیر ہی پر منحصر نہیں عام طور پر یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ شہزادہ باغی ہو گیا۔ اور جنگ کے ارادے سے پیش قدمی کر رہا ہے۔ بادشاہ ان دونوں لاہور میں مہم قندھار کی تیاری میں مصروف تھا۔ یہ پریشان کن خبریں سن کر اسے پائے تخت کی طرف آنا پڑا اور دہلی میں ٹھہر کر اس نے شہزادہ حرم کے خلاف ایک فوج روانہ کی کہ جبراً اسے آگے بڑھنے سے روک دے کیونکہ شہزادے کو دکن واپس جانے کے جو احکام بھیجے گئے تھے، ان کی تعمیل میں ہر مرتبہ اس نے یہ عذر کیا تھا کہ میں خود حضور کی خدمت میں باریاب ہونا چاہتا ہوں۔

مجمعہ فارسی مؤرخ جو علانیہ شہزادہ حرم کے جانب دار ہیں ہر طرح اس کی بے گناہی ثابت کرتے ہیں۔ لیکن واقعی وہ محض باپ کے شکوک دفع کرنے کے لیے آیا تھا یا کسی اور قصد سے یہ مسلم ہے کہ بادشاہی فوجوں کا مقابلے کے لئے روانہ ہونا سن کر پھر اسے پیش قدمی کی ہمت نہ ہوئی اور اپنی فوجیں فتح پور (سیکری) ہی میں چھوڑ کر وہ خود دکن کی طرف واپس چلا گیا۔ لیکن اب اس کی حیثیت ایک مغرور باغی کی سی تھی اور آئندہ تین چار سال تک بادشاہی حکام اس کی گرفتاری کی فکر میں رہے، اور وہ کبھی مالوے سے دکن کو دکن سے بنگالہ اور پھر دکن و گجرات، سندھ و راجپوتانہ میں اپنی جان بچاتا پھرا۔ اسی تعاقب کے دوران میں شہزادہ پرویز کا انتقال ہوا۔ ۱۶۲۳ء اور انھی سرگرمیوں میں نور جہاں بیگم کی اپنے بھائی اور آخریں پہ سالار مہابت خاں سے ان بن ہوئی اور

۱۔ خاقی خاں جلد اول ۳۳۴ نیز دیکھو اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۱۹۸ و ۱۹۹ وغیرہ۔

۲۔ اصلی نام زمانہ بیگ تھا لیکن اس کے بیٹے خان زمان خان کا بیان ہے کہ ہم لوگ خاندان سادات

شہزادہ خرم کی
تخت نشینی

اس نے موقع پا کر ایک مرتبہ خود بادشاہ کو اپنی حراست میں لے لیا (۱۰۳۵ھ) جس سے
بیشکل نجات ملی اور کچھ عرصے کے لئے کاروبار سلطنت میں انتشار پیدا ہو گیا پھر
اس عرصے میں شہزادہ خرم جا بجا شکستیں کھا کر بالکل مایوس و مجبور ہو گیا تھا اور مالوے کے
قلعے جو اب تک اس کے قبضے میں تھے نیز اپنے بیٹے بطوریر خاں بادشاہ کے حوالے کر کے
بلا شرط اطاعت پر آمادہ تھا اور اگر نو جہاں بیگم رخنہ اندازی نہ کرتی تو غالباً باپ بیٹوں میں
صفائی ہو جاتی۔ لیکن ابھی تک دلوں میں تھوڑا بہت غبار باقی تھا کہ جہانگیر پر قدیم مرض
(دوسے) کا دورہ پڑا اور کشمیر کا سفر ملتوی کر کے وہ واپس لاہور آتا تھا کہ راستے میں وفات پائی
(ماہ صفر ۱۰۳۷ھ) اور تھوڑے ہی عرصے میں آصف خاں نے شہر یار کو لاہور میں شکست دے کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۶) سے ہیں اور شیراز سے آکر کابل میں آباد ہوئے پھر زمانہ بیگم جوانی میں شہزادہ سلیم
کی سرکار میں ملازم ہوا اور ترقی کرتے کرتے ۱۰۲۶ھ میں سہ ہزاری منصب اور صوبہ داری کابل پر نامزد ہو گیا تھا
اور شہزادہ خرم سے نو جہاں بیگم کی مخالفت شروع ہوئی تو بیگم نے اسی کو اپنے بھائی کی بجائے عہدہ وزارت
پر مقرر کر دیا کہ شہزادہ خرم کے مقابلے کے واسطے اس سے بہتر کوئی شخص نظر نہ آتا تھا اول اول
اس منصوبے میں کامیابی بھی ہوئی لیکن بعد نو جہاں اس کی سرکشی اور شہزادہ پر وزیر کی سسرنداری بیکھ کر
ناخوش ہو گئی اور اسے معزول و ذلیل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ لہذا ہابت خاں نے جو نہایت بے اصول و
بے باک سپاہی تھا اثنائے سفر میں موقع پا کر جب کہ شاہی لشکر دریا کے جہلم کو عبور کر چکا تھا اور بادشاہ کے
ساتھ تھوڑے سے خدمت گار رہ گئے تھے بارگاہ شاہی کو گھیر کر جہانگیر کو حراست میں لے لیا۔
پھر چند ماہ تک اگرچہ ظاہر آداب شاہی میں کوئی فرق نہ آیا اور نہایت خاں دست بستہ حضور میں حاضر رہتا
تھا لیکن انہیں پناہ اس کے نشا کے بغیر کوئی کام نہ کر سکتے تھے اور چند راجپوت سپاہی تلوار لیے ہر وقت
ان کے ساتھ رہتے تھے (۱۰۳۶ھ) آخر کار کابل جا کر بیشکل بعض تدبیروں سے اس بلا سے
نجات ملی اور اب ہابت خاں کو جان بچا کر فرار ہونا پڑا۔ اس نے شہزادہ خرم کی
پناہ لی تھی جو خود بھی گجرات و دکن میں منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ شہزادہ خرم کی تخت نشینی کے بعد
اپنی مختلف کارگزاریوں کے صلے میں اسے "خان خانان" کا خطاب اور مفت ہزاری منصب
عطا ہوا اور آخر تک وہ سلطنت کا نہایت محسوس و زور کن رکھن رہا۔ (۱۰۳۷ھ) میں
وفات پائی

گرفتار کر لیا۔ غالباً اسی حریف سے مقابلہ کرنے اور عوام الناس کو دھوکا دینے کے واسطے اس نے جہانگیر کے مرتے ہی شہزادہ خسرو مرحوم کے بیٹے داؤد بخش کی بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا لیکن جب شہر یار اور نیز شہزادہ اقبال بن اکبر کے دو بیٹے جن سے شورش و فساد کا اندیشہ تھا، قابو میں آگئے تو شہزادہ خرم کے اشارے سے (جو دکن کے قلعہ حیدر میں باپ کے انتقال کی خبر سنتے ہی احمد آباد کے راستے آگئے) ان کے ساتھ داؤد بخش کو بھی قتل کر دیا گیا اور انسانی جانوں کی قیمتی بھینٹ چڑھا کر ہندوستان کا سب سے اقبال مند منسل بادشاہ آگرے میں شاہجہاں کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ ۱۶۲۵ء

چند اندرونی مقصد کے
(۱) جہاںگیر کے بندیل

آئندہ تیس برس کی حکومت میں شاہجہاں کو بیرونی جہات کے علاوہ چند اندرونی مقصد سے بھی دفع کرنے پڑے جن میں جہاںگیر کے بندیل کی شورش اور خان جہاں لودھی کی بغاوت سب سے اہم اور قابل ذکر ہیں۔ بندیل کھنڈ کا یہ راجہ بیرنگہ شاہ تھا جس نے جہانگیر کے حکم سے ابو الفضل کو دکن سے آگرے آتے میں قتل کیا اور اس جرم کی سزائیں اکبر نے اس کی ریاست کو پامال و تاراج کرایا تھا۔ لیکن جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی اور وہ سلطنت کے نہایت معزز بیروں میں داخل کر لیا گیا۔ بادشاہ کے اسی لطف خاص کے زعم پر وہ نہ صرف اپنی رعایا بلکہ بیایوں اور مسافروں پر طرح طرح کے ظلم کرنے لگا تھا اور کچھ ملکی خلفشار کچھ بادشاہ کے پائے تخت سے باہر رہنے کی وجہ سے بھی لوگوں کو ایسے منظور نظر سردار کے خلاف شکوے شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا۔ شاہجہاں کو تخت نشینی ہی کے وقت سے اس کی تنبیہ و تادیب کا فکر تھا کہ اس کی وفات کی اطلاع ملی اور ساتھ ہی اس کے بیٹے جہاںگیر نے بادشاہ کی بغیر اجازت آگرے سے چھپ کر اپنے وطن کی راہ لی۔ دراصل اسے اپنے باپ کی زیادہ شانوں کے محاسبے کا خوف ہو گیا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس مطالبے کو بچنے کے لئے یہ علانیہ سرکشی مثل شہنشاہ کو کسی طرح گوارا نہ ہو سکتی تھی۔ فوراً ایک فوج راجہ کی سرکوبی کے لئے جس کا علاقہ قریب قریب وہاں تھا جو آج کل "غربی بندیل کھنڈ" کہلاتا ہے روانہ ہوئی اور

مل فارسی تواریخ میں اسے جابجا "زنگیہ دیو" لکھا ہے۔

پہم شکست و ناکامی نے جھارنگھ کو چند ہی روز میں امان مانگنے پر مجبور کیا۔ اور گو خود اس کے چند ہم قوم افواج شاہی میں موجود اور منصب راجہ کے اہل و امیدوار تھے بایں ہسمہ شاہجہاں نے اس کی دست بستہ معافی قبول کر لی اور خراج کے ساتھ تھوڑا سا سلاقت ضبط کرنے کے بعد اسے ریاست پر بحال کر دیا گیا۔ (۱۶۳۹ء)۔

چند سال کے بعد جھارنگھ نے پھر علانیہ بغاوت پر کمر باندھی اور اپنی قزاقوں سے دکن کے راستے مخدوش کر دیئے اس وقت شہزادہ اورنگ زیب بندیوں کے اتصال پر مامور ہوا اور اس کی سپہ سالاری میں مغل فوجوں نے اس ریاست کے تینوں مشہور و مضبوط قلعے اونچھ (یا اڑچھا) دھامونی اور جھانسی جبراً فتح کر لئے اور بندیل کھنڈ کے گھنے جنگلوں کا جہاں جھار بھاگ بھاگ کر چھپ رہا تھا گوشہ گوشہ چھان مارا مجبوراً باغیوں کو گونڈوانے کے علاقے میں فرار ہونا پڑا اور وہیں وہ اپنے قدیم دشمن گونڈوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ ریاست دیو می سنگھ بندیل کو بخش دی گئی جس کا خاندان بیرنگھ سے پہلے یہاں کا اصلی فرماں روا تھا۔

(۲) خان جہاں لودھو۔ اس اثنائیں خان جہاں لودھی کی بغاوت میں نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن طاقتور سلطنتوں کے حق میں ہر نئی دشواری کا حل از و یا قوت کا سبب ہو جاتا ہے۔ اس بغاوت کے فرو کرنے میں بھی مغلوں کو ریاستہ کے دکن پر اپنے پنجے جمانے کا مفت میں موقع مل گیا اور دراصل یہی گہری اغراض مرکوز خاطر تھیں کہ خود بادشاہ نے اگر سے سے خاندان کا سفر کیا اور دوڑھانی سال تک (۱۶۳۲ء تا ۱۶۳۴ء) انہی علاقوں میں مقیم رہے یہاں تک کہ ”چوں“ پیرائے کا فرما جرایہ اسرمیال و نہب اموال بہ سزائے اعمال نکوہیدہ رسید۔ ”و بے نظام“ نیز یکفر حمایت و رعایت او دست زد و حادث و پامال فوائب گشت و ملک بیجا پور کہ اصلاً تاخت سرحدش در عہد عرش آشیانی (اکبر) حضرت جنت مکانی (جہانگیر)..... دست بہم ندادہ۔ چہ جائے آنکہ آل ملک بہ ورو و لشکر شاہی پے سپر گردید و نورس پور کہ در حوالی بیجا پور است دارالملک و حاکم نشین، با توابع و مصافات

۱۔ بادشاہ نامہ جلد اول۔ ۲۴۰ و ۲۴۱ و ۲۴۲ خانی خاں جلد اول ۲۴۰ و ۲۴۱ و ۲۴۲ نیز دیکھو مآثر الامرا جلد دوم

حالات ”جھارنگھ بندیلہ“ پ

خراب شد..... نہضت ریاست جہاں کشا یہ صوبہ دار الخلافت اکبر آباد مقرر شد
 واضح رہے کہ خان جہاں کا اصلی نام پیر خاں (پسر دولت خاں) تھا جسے موج نے
 ازراہ حقارت ”پیرا“ لکھا ہے۔ حالانکہ ایک زمانہ تھا جب کہ یہی ”پیرا“ جہانگیر کا سب سے
 معزز و محترم درباری سمجھا جاتا تھا اور بادشاہ اسے ہاتھ سے سہارا دے کر کھڑے پر
 سوار کرتے تھے تاہم جہانگیر کی میں وہ بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوتا رہا اور اس کے
 انتقال کے وقت بھی خاندیس و دکن کا صوبہ دار تھا۔ بادشاہ کی وفات اور دواور بخش کی
 تخت نشینی کی اطلاع سن کر وہ یا اس کے مشیر سخت غمگینی میں مبتلا ہو گئے اور شاہ جہاں کی بادشاہی
 تسلیم کرنے میں تامل کرنے لگے اور گو بعد میں خانجہاں نے معافی مانگ لی اور اس کے
 اعزاز و اکرام میں کوئی ظاہری فرق نہ آیا تاہم دلوں میں کسی قدر کمزورت باقی تھی اور اسی نے
 آخر کار خانجہاں کو رفتہ رفتہ اس قدر بدگمان کیا کہ وہ بادشاہ کی بغیر اجازت اپنی جمعیت کو
 لے کر آگرے سے چل دیا۔ بادشاہی فوجوں نے اسے دھول پور سے کچھ آگے بڑھ کر جالیا تھا
 لیکن وہ لڑ بھڑ کر چنبیل کو عبور کر گیا اور بندھیل کھنڈ اور گونڈوانہ کے غیر معروف راستوں سے
 نکل کر دولت آباد آہنچا (۱۶۳۹ء) جہاں مرنقی نظام شاہ نے بڑے تیاک و اعزاز
 کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور اس کے مصارف کے واسطے بیڑ کا پرگنہ عطا کیا کہ اہلنمان سے
 وہاں رہ کر فوجی جمعیت فراہم کرے۔ کیونکہ خان جہاں لودھی درحقیقت ہندی اور سرحدی
 افغانوں کا مسلمہ سرگروہ تھا اور دکن میں اس کے پیچھے کی خبر سنتے ہی بہت سے ردھیلے
 یا افغان سپاہی جوق جوق اس کے گرد جمع ہو رہے تھے اور یہ منصوبے دلوں سے نکل کر زبانوں پر
 آنے لگے تھے کہ خانجہاں کو علانیہ بادشاہی کا اعلان کر کے شیر شاہ سوری کی شل پھر ایک مرتبہ

۱۔ بادشاہ نامہ دفتر اول صفحہ ۴۲۲۔ عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ جب خان جہاں لودھی کو اپنے اعمال کی منزا
 مل چکی اور وادی دولت آباد بھی اس کی مدد کے جرم میں کافی سزا بھگت چکا، تو لشکر شاہی نے ملک بیجا پور پر
 یورش کی اور خاص پائے تخت کے قریب تک کا علاقہ پامال کر ڈالا حالانکہ اکبر و جہاں گیر کے عہد میں مغلوں کو
 کبھی یہاں تک بڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا پھر اس کار نمایاں کے انجام پانے کے بعد بادشاہ نے شامی ہند کو مہجرت کی
 مسئلہ آثار الامرا جلد اول ۱۹۰۱ء میں تصریح ہے کہ جہت جہت خان جہاں لودھی کے حالات تحریر ہیں۔
 صاحب آثار الامرا نے انھیں نہایت خوبی سے جمع کروایا ہے و

شاہجہاں کی
تومات و کن

مغلوں سے شمشیر آزمائی کرنی چاہئے!

غرض پہلی مرتبہ شاہجہاں کے برہانپور آنے کا اصلی مدعا اسی شورش و بغاوت کا
استیصال کرنا تھا لیکن اسی ضمن میں مغلوں نے نظام شاہی ریاست کے رہے رہے اضلاع
پامال کر ڈالے اور پہلی دفعہ بیجاپور کے علاقوں میں بھی دور تک گھس گئے۔ خان جہاں لودھی تو
چند شکستیں کھا کر دکن سے نکل گیا تھا اور آخر کار کئی جگہ کشت و خون کے بعد کالنجھر کے قریب
مارا گیا اور اس کی جمیعت منتشر ہو گئی (۱۶۳۱ء) لیکن انھی لڑائیوں کے سلسلے میں بالاکھاٹ پر
مغلوں کا قتل قبضہ ہو گیا اور جاجان کی سرحدیں کوکن، و بیجاپور کے سرحدی اضلاع سے جا ملیں
جو آئندہ جنگ و آویزش کی لازمی تہیہ تھی۔

نظام شاہی حکومت کے قبضے میں اب صرف دولت آباد، جینر اور ناسک کے چند اضلاع
رہ گئے تھے اور ان کے قلعوں پر بھی جاجا مضل یہ سالاروں کی فوجیں حملہ کر رہی تھیں۔ ادھر
ملک غنیمت کی وفات (۱۶۳۶ء) سے یہاں کے امرا کا وہ اتحاد بھی مفقود ہو گیا جس نے ریاست کی
سمارت کو گرتے کرتے چند روز کے لئے سنبھال لیا تھا اور خود اس کے بیٹے فتح خاں اور مرتضیٰ نظام شاہ
میں سخت عداوت پیدا ہو گئی۔ اس گروہ بندی نے بعض نظام شاہی سرداروں کو اور بھی آمادہ
کر دیا کہ وہ جاکر مضل صوبہ داروں سے مل گئے اور انھی میں مرہٹہ فوج کا ذی اثر سردار جادو رائے
بھی تھا جسے بعد میں مرتضیٰ نظام شاہ نے اسی بے وفائی کے جرم پر دھوکے سے دولت آباد ہلا کر
قتل کر دیا۔

لیکن اس خاندان شاہی کے خاتمے کا زمانہ بھی قریب آ گیا تھا۔ رہے سبے اضلاع اور
قلعوں پر مضل فوجیں جاجا حملے کر رہی تھیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیجاپور بھی مغلوں سے متحد
ہونے پر آمادہ تھے کہ سلطنت نظام شاہی کی آخری تقسیم کے وقت حصہ بنائیں، مگر جب
ان پریشانیوں میں مرتضیٰ نظام شاہ نے فتح خاں کو قید سے رہائی دی تو اس نے موقع پا کر
اس بادشاہ اور اس کے رفیقوں کو قتل کر دیا اور خود ہی مغلوں کی اطاعت قبول کر لی! (۱۶۳۱ء)

آج کل ناگپور کے شمال و مشرق میں سرکار انگیزی کا بھی ایک ضلع بالاکھاٹ کہلاتا ہے لیکن اس جگہ بالاکھاٹ سے
وہ علاقہ مراد ہے جو برار کے جنوب اور دولت آباد کے مشرق میں پان گنگا سے گوداوری تک پھیلا ہوا تھا اور
بعد میں اسی کو کچھ حصے کے واسطے صوبہ سنگنجان میں ضم کر دیا گیا تھا۔

رسمی طور پر اب (دولت آباد کی) نظام شاہی حکومت سے مغلوں کی لڑائی ختم ہو گئی۔ اور وہ لڑکا جسے مرنے والی نظام شاہ کے بعد فتح خاں نے برائے نام بادشاہ بنایا تھا سلطنتِ مغلیہ کا باجگزار ہو گیا۔ لیکن بعض سرکش قلعہ داروں کے علاوہ جو بطور خود مغلوں کا مقابلہ کر رہے تھے اس موقع پر جادو رائے مقتول کے داماد ساجو جی بھونسلہ نے ایک نیا منصوبہ سوچا اور بچانے کی کوشش میں رہی یہی نظام شاہی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ واضح رہے کہ اپنے خسر جادو رائے کے قتل کے بعد وہ مغلوں سے آلا تھا اور اس کے ساتھ اسی رعایت و عزت کا سلوک مرعی رکھا گیا تھا لیکن جب خود فتح خاں نے اطاعت قبول کر لی تو اس کے مقابلے میں ساجو جی اور نسیہز دیگر امرائے نظام شاہی جو مغلوں سے آئے تھے ماند پڑ گئے اور اسی ناقدری سے بگڑ کر سب ہونے دربارِ بیجا پور کے ساتھ یہ سازش کی کہ خاندانِ نظام شاہی کے ایک اور شہزادے کی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور بیجا پور کی فوج کے ساتھ مل کر خاص دولت آباد پر حملہ کیا کہ فتح خاں اور اس کے نامبرو بادشاہ کو نکال کر خود پائے تخت پر قابض ہو جائے۔

فتح خاں نے مغلوں سے مدد مانگی اور ان کی فوجوں نے دولت آباد کے سامنے بیجا پوری افواج کو شکست دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ لیکن ابھی جنگ کا کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوا تھا کہ فتح خاں اہل بیجا پور سے مل گیا اور ایک عقبہ سے خود اپنے اتحادیوں پر حملہ آور ہوا اسی کو بچانے آئے تھے بایں بہت سیل سپاہیوں کی جو اندری اور سپہ سالار بہابت خاں کی کاروائی کی بدولت اس ناگہانی حملے میں بھی اہل دکن کو شکست ہوئی اور اب اوصہر ایک مثل فوج تو بیجا پوریوں کے تعاقب میں روانہ کی گئی اور دوسری نے قلعہ دولت آباد کا محاصرہ کر لیا۔

سامانِ جنگ و رسد کی کمی سے مجبور ہو کر آخر کار فتح خاں نے ہتھیار ڈال دیئے نظام شاہیوں کا یہ دوسرا پائے تخت فتح ہو گیا (ذو الحجہ ۱۰۲۲ھ) اور اس کا آخری وارث حسین نظام شاہ بھی بہار اور نظام شاہ کی طرح (صفحہ ۱۵۲) گوالیار بھیج دیا گیا۔

اب قدیم سلطنت احمد نگر کا خاتمہ ہو جانے میں بظاہر کوئی کسر نہ رہی تھی لیکن اول تو اس کا ایک مشہور سردار قلعہ پرمینڈہ تسخیر نہیں ہوا تھا جو سینا ندی پر (آج کل عثمان آباد کے ضلع میں) واقع ہے۔ دوسرے ساجو جی اس لڑکے سمیت جس کی بادشاہی کا اس نے اعلان کیا تھا بج کر نکل گیا اور اہل بیجا پور کی مدد سے کوکمن کے کم آباد کو ہستانی علاقے میں فتنہ و فساد مچا رہا تھا۔ پھر یہ کہ جب بادشاہ کے منجھلے بیٹے شہزادہ شجاع (ولادت ۱۰۲۵ھ) کو پہلی مرتبہ

بیجا پور و لکھنؤ
کا باجگزاری

علی ان فرامین کے نقول ملاحظہ ہوں بادشاہ نامہ دفتر دوم صفحات ۲۶ تا ۱۲۳ نیز ان کا خلاصہ منتخب البلیاب خافی خاں جلد اول صفحات ۱۶ تا ۴۹، خافی خاں کہتا ہے اور بادشاہ نامے کے بعض اقوال سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ جو سفیر بجا پور بھیجا گیا اسے بادشاہ نے تباکبید سمجھا دیا تھا کہ بالمشافہ انگلو میں شاہ بجا پور کو اچھی طرح تہدید و تنبیہ کرے۔ بایں ہند راقم الحروف کے نزدیک بجا پور کے ساتھ رعایت و نرمی کی اصلی وجہ بالکل دوسری تھی جسے یہ مورخ اپنی بے پروائی یا سادہ لوحی کے باعث نہیں سمجھے یا بیان نہیں کرتے۔ اور وہ یہ کہ ان دنوں بجا پور کی فوجی قوت گو کہ گنڈہ سے کہیں زیادہ تھی کیونکہ اول تو حکومت نظام شاہی کے اکثر سردار و سپاہی جن میں ساہو جی کی مرہٹہ فوج بھی داخل ہے اس ریاست کے ٹٹنے کے بعد بجا پور کی سرکار میں چلے آئے تھے اور آئے دن کی لڑائیوں نے بجا پور کی افواج کو مغضوں کا مقابلہ کرنے میں بھی خاصہ ولیہ و مشاق بنادیا تھا دو سرے فرنگی تاجروں کے ذریعے دربار بجا پور کو مغربی سہاں ہند سے جنگی ساز و سامان فراہم کرنا بھی آسان ہو گیا تھا۔

اس تصریح کی زیادہ ضرورت اسے لئے ہوئی کہ ان فارسی تواریخ کی ناقص تحریروں نے انگریزی تاریخ نویسوں کو بھی مغالطے میں ڈال دیا اور وہ شاہجہاں کی بیجا پور کے ساتھ رعایت اور گوکھنڈ کی اطاعت گزاری کے اصلی سبب کو نہ سمجھ کر عجیب عجیب تاویلیں بلکہ "اختراعات" کرنے لگے مثلاً دیکھو گرائڈزٹ کی تاریخ مہرہ، جلد اول صفحہ ۸۹۔ بابو جادو ناتھ سرکار کی تاریخ اورنگ زیب صفحہ ۲۶ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ "محققین" نہ صرف صورت واقعات کو نہیں سمجھے بلکہ کمال دلیری سے محض اپنی

اب تک، دوستانہ نامہ و پیام اور تحفہ دیا یا بھیجنے کے سوا مغل شہنشاہوں کے زیر اثر نہ آئی تھی اور اگر یہ مان لیا جائے کہ وہاں پر علانیہ تبریٰ کہا جانا یا خطبوں میں شاہ ایران کا نام لیا جانا شاہجہاں کو ناگوار تھا اور نوید و مروج مذہب سنت و جماعت کی حیثیت سے وہ ان رسوم کو محو کرنا چاہتا تھا تو بھی آخر میں یہ مطالبہ کہ آئندہ خطبوں میں مغل بادشاہ کا نام لیا جائے اور سالانہ خراج کی ایک مقررہ رقم ادا کی جائے، محض ایک کمزور ہمایہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا تھا اور نیز جس قسم کے سلسلہ جنگ کو ختم کرنے وہ اب وکن آ رہا تھا اسی قسم کے ایک نئے سلسلہ جنگ کی تہدید بھی ابہر حال تسلیم کرنا چاہئے کہ شاہجہاں فن سیاسیات کا نہایت مشاق ماہر تھا اور اس نے اپنے وکنی حریفوں کی حالت کا اس قدر صحیح اندازہ کیا تھا کہ آئندہ اس کی ہرجی اور سیاسی چال ٹھیک اور کارگر پڑی: عبداللہ قطب شاہ نے توبے لڑے بھڑے مغل شہنشاہ کے مطالبات تسلیم کر لئے اور دربار بیجاپور کے لیت و لعل کے جواب میں یکبارگی مغلوں کی فوجیں عادل شاہی علاقوں میں گھس گھس اور پاسے سے تحت بیجاپور کی نواح تک تمام ملک پامال و تاراج کر دیا: بیجاپوری دستے ہر طرف سے سمٹ کر پائے تحت میں آ گئے تھے اور یہیں قلعہ بند ہو کر لڑنے کا انہوں نے کافی انتظام کر لیا تھا لیکن شاہجہاں کو وقت کے وقت بیجاپور کی تخریر سے غرض نہ تھی اور اس کے مغل سپہ سالاروں نے دشمن کی فوجوں کو قلعوں میں وکیل کر صرف میدانی اضلاع کی تاراجی کا تہیہ کر لیا تھا جس نے چند ہی ہفتے میں اہل بیجاپور کے حواس باختہ کر دیئے اور انہوں نے عاجزانہ مصالحت کی درخواست کی اس موقع پر شاہجہاں نے جن شرائط پر صلح کی (۱۵۹۲ء) وہ اس کی اصلی اغراض اور نیز صورت و اقصیات کی نہایت عمدہ شاہد ہیں۔

(۱) نہ صرف بیجاپور کا اصلی علاقہ بحال رکھا گیا بلکہ کوکن اور قلعہ پرینہ کے قریبی قطع جو تھانز عریفہ اور پہلے نظام شاہی حکومت میں داخل تھے ریاست بیجاپور ہی کو دے دیئے گئے اور عادل شاہ سے حلفیہ اقرار لیا گیا کہ وہ آئندہ نظام شاہی حکومت کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۳) غلط رائے کو تاریخی و احمات کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ باقی نوٹ استیعہ کے متعلق تو کچھ لکھا غالباً یکبارہ جو ظاہر اپنی تاریخ دانی اور بے لطف انشا پردازی کا کمال ہی ہیچھا ہے کہ سلاطین اسلامی کے حق میں سخت سے سخت الفاظ استعمال کیئے جائیں۔

احیا کی کسی کوشش یا سازش میں شریک نہ ہو گا اور نہ ساتھ جی یا دیگر نظام شاہی ملکی
(مغلوں کے خلاف) کوئی مدد کرے گا۔

(۲) مقررہ خراج کی باقیات جو پچاس لاکھ روپے کے قریب نکلتی تھیں ادا کرنے کے
بعد آئندہ ریاست بیجا پور چار لاکھ کے بجائے صرف دو لاکھ ہونے کا تقریباً
آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ بطریق پیشکش ادا کرتی رہے گی۔

(۳) بیجا پور میں خطبہ اور سکے شاہجہاں کے نام کا جاری کروایا جائے گا۔
اس معاہدے سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مذکورہ کشور کا اول صرف نظام شاہی حکومت کو
اطمینان و استقلال کے ساتھ سلطنت مغلیہ میں جذب کرنا چاہتا ہے اس نے از خود چند سرحدی
اور کوہستانی اضلاع دربار بیجا پور کے حوالے کر دیئے ہیں تاکہ وہاں کے حکمران یا وہ امرائے
نظام شاہی جو دولت آباد سے نکل نکل کر بیجا پور پہنچ گئے تھے خوشی سے اس علاقے پر آگیا کریں
اور احمد نگر کی حکومت رفتہ کو دوبارہ زندہ کرنے کا خیال بھی انھیں نہ آئے۔ اسی کے ساتھ

علاء آباد و ناتھ سرکار رکھتے ہیں (تاریخ اورنگ زیب)۔ جلد اول صفحہ ۲۹ و ۲۵ جہاں باب نہم کو اسی
غلط بنیاد پر شروع کیا ہے کہ اس معاہدے کی چوتھی شرط یہ تھی کہ عادل شاہ اس کے معاہدے میں
بیس لاکھ روپیہ (نقد اور بصورت اجناس) شہنشاہ کی نذر کرے لیکن اس پر کوئی سالانہ خراج عائد
نہیں کیا گیا تھا اس آخری فقرے پر انھوں نے خاص طور سے زور دیا ہے اور لطیفہ یہ ہے کہ بادشاہ شاہ
اور خانی خاں کی تاریخ کے انہی صفحات کا حوالہ دیتے ہیں جن کی اصلی عبارت (از جانب شاہجہاں)
یہ ہے کہ قریب بیجا لک روپیہ پیشکش کہ بعد از طوس اقدس مقرر فرمودہ بودیم ارسال و ادا ہوئی
مقتضی آں بود کہ آں قطب فلک ایالت را رعایت فرمائیم۔ بنا پر اس مقرر فرمودیم کہ از جملہ چار لک ہون
ہر سال حسب العظم الاشراف بہ نظام الملک میداؤد لاک ہون را ہر سال بہ سرکار خاصہ شریفہ اصل
سار و دو لاک ہون دیگر بہ آں قطب فلک شوکت صاف باشد۔ (بادشاہ نامہ جلد اول دفتر دوم صفحہ ۱۱
سطح ۱۳۲) یہی جملہ خانی خاں کے ہاں موجود ہے (باب جلد اول صفحہ ۳۳۵ سطر ۹ تا ۱۴)
پھر خانی خاں نے جہاں عادل شاہ کا خط بادشاہ کے نام نقل کیا ہے وہاں بھی وہ منجملہ دیگر شرائط کے یہ دو لک
ہون (یا ہشت لک روپیہ) سالانہ پیشکش کی شرط تسلیم کرتا ہے (صفحہ ۸۳۶) اب مجھ میں نہیں آتا کہ
سرکار صاحب کے مذکورہ بالا نتیجہ تحقیقات کو "غلطی" کی کوئی قسم قرار دیا جائے تو

اس نے خود سچاپور میں اپنی مداخلت بلکہ آئندہ اس کے الحاق کا راستہ تیار کر لیا ہے کہ جب نئی فتوحات دولت آباد وغیرہ کا نظم و نسق درست ہو جائے تو فرصت سے مغلیہ فوجیں سینا اور بھیمانپور کی طرف بڑھائی جائیں گے۔
مذکورہ بالا معاہدے کی تکمیل و توثیق کے بعد شاہجہاں نے ”کون“ کو چار صوبوں میں تقسیم کر دیا: خانہ گیس، برار، تانہ گمانہ اور دولت آباد جس میں مغربی گھاٹ یا سواحل ہند کے پہاڑوں تک، احمد نگر کے تمام مغربی اضلاع شامل تھے۔ پھر ان چاروں کی حکومت اس من و انتظام کی بجالی نیز سائو جی اور بعض دیگر سرکشوں کی سرکوبی کی خدمت شہزادہ اورنگ زیب کے سپرد کر کے خود شمالی ہند کو مراجعت کی (صفر ۱۰۳۶ھ) کیونکہ پچھلے چند سال کی لڑائیوں نے شمالی دکن میں اس درجہ انتشار و بد نظمی اور زرعی پیداوار میں کمی پیدا کر دی تھی کہ بادشاہی لشکر کے واسطے رسد فراہم کرنا غریب لوگوں پر بار ہو گیا تھا۔

تیسری فصل: اورنگ زیب (۱) عہد شہزادگی

گزشتہ جنگ و جدال کے بیان میں ضمناً حکومت دکن کی ان دشواریوں کا اندازہ ہوتا ہے جن سے بڑے بڑے نامی امراء مغل اور خود بادشاہ کا بھٹلا فرزند شہزادہ محمد شجاع عہدہ برائہ ہو سکا تھا۔ لیکن اب جس شہزادے کو یہ اہم خدمت سپرد کی گئی اس کے نصیب میں آئندہ ہندوستان کا سب سے جلیل القدر شہنشاہ ہونا تحریر تھا اور گویا اسی لئے قدرت نے نوجوانی سے اس کی ذات میں وہ صفات اور قابیلیتیں جمع کر دی تھیں جو بظاہر ذاتی محنت و اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتیں چنانچہ یہاں خاص طور پر یاد دلانے کے لائق بات یہ ہے کہ اٹھارہ برس کی عمر سے جب کہ وہ صوبہ دار دکن کی حیثیت سے پہلی مرتبہ مملکت داری کے میدان میں داخل ہوا اس کی شہرت و ناموری ہندوستان کے ہر کھوہ سے بڑھ گئی اور عہد شاہجہانی کے سب سے اہم سیاسی واقعات اور جنگی فتوحات کا باقی حال

پہلی صوبہ داری

تین چوتھائی سے زیادہ شہزادہ اور نگ زیب کے کارناموں کی داستان ہے !
شاہ بہادر شاہ کے دکن سے واپس جانے کے بعد سلطنت نظام شاہی کی فتح و الحاق کی تکمیل میں
جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ اسی شہزادے نے پوری کی۔ اور تسخیر آدگیر کے علاوہ دکن کا شمال مشرقی علاقہ
جو معاہدے کی رو سے مغلوں کے حصے میں آیا تھا اسی کی صوبہ داری میں سرکشوں سے پاک ہوا۔
انہی پہاڑی علاقوں اور غلوں میں بھاگتے بھاگتے ساموجی نے آخر کار تیار ڈال دئے اور چند قلعے جو اب تک
اس کے قبضے میں تھے، نیز نظام شاہی خاندان کا وہ لڑکا جسے وہ اب تک بادشاہ بنائے ہوئے تھا
مغلوں کے حوالے کر دئے۔ اس کے معاہدے میں مغلوں نے اسے بیجا پور میں ملازمت
کرنے کی اجازت دے دی۔

اس کے دو سال بعد اورنگ زیب نے بنگالہ کے اضلاع کا مالک محروسہ میں اضافہ کیا
اور (۱۰۴۸ھ) غزنویں دسورت کے درمیان کا یہ وہ پہاڑی قطعہ ہے جس کے قلعوں کی سنگینی اور
دشواری شہزادہ شہر تھی اور جس پر آگبر کی فوجیں بھی خاطر خواہ تصرف نہ حاصل کر سکی تھیں۔ اورنگ زیب
کی حسن سعی اور اس کے پیادہوں کی نمایاں جواہری سے یہ علاقہ چند مہینے کی جدوجہد کے بعد
مستقل طور پر مغلوں کے قبضے میں آ گیا اور اسی کار نمایاں کے محلے میں شہزادے کو پانزدہ ہزار سی
دنہ ہزار سوار کے منصب پر ترقی دی گئی۔

بڑے بھائی کا حصہ

اس جنگ کامیابی نیز ممالک دکن میں انہیں شہزادہ جہاں نے سخت برہنہ اور اتری کی
حالت میں چھوڑا تھا اورنگ زیب کے حسن انتظام کی شہرت عام نے پہلی مرتبہ اس حسد کو نمایاں کیا
جس نے اس کے بڑے بھائی داراشکوہ (ولادت ۱۰۱۵ھ) کو غالباً ۱۶۱۵ء سے اورنگ زیب کا
خالف کر دیا تھا۔ یہ شہزادہ علی اور انصاری یا سپاہیانہ اور انتظامی قابلیت کے اعتبار سے اپنے
سنجھے بھائی سے کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا لیکن باپ کی مفرط محبت اور اہل غرض کی خوشامد نے
اسے نہایت مغرور و خود پسند بنا دیا تھا۔ لہذا شہزادہ اورنگ زیب کی واجبی مدح و ستائش بھی
اسے ناگوار گزرتی تھی۔ ایسے شاہی خاندان میں جو وراثت سلطنت کے معاملے میں کسی مسلم اصول و قانون کا
پابند نہ ہو افراد خاندان کی باہمی رقابت و دشمنی کوئی حیرت کی بات نہیں ہے لیکن یہاں ہمیں
خاص طور پر یہ جانا منظور ہے کہ شاہ جہاں کی اولاد میں اس رقابت و دشمنی کی ابتدا داراشکوہ

کی جانب سے ہوئی جو ولی عہدی کا مذہبی اور آئندہ تخت نشینی کا امیدوار تھا۔ بالخصوص اورنگ زیب کے معاملے میں تمام تاریخی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ داراشکوہ اس کی تدبیل و آزار رسانی کے درپے تھا اور غالباً یہی وقت ہے جب سے اورنگ زیب نے اسے "برادر ناہریان" سمجھنا شروع کیا۔ اس عہد کی فارسی تاریخیں پڑھنے والوں سے یہ امر بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ ہمعصر مورخ بالعموم اورنگ زیب سے ناراض و بدگمان ہیں۔ بایں ہمہ اس کی شہزادگی (یعنی جوانی کے پرورش زمانے) میں ہیں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے ثابت ہو کہ اورنگ زیب نے شخص بھائی کی عداوت کے جواب میں یا مدافعت ہی کے عذر پر داراشکوہ کے خلاف کوئی دشمنی یا سازش کی۔ بے شبہ شاہی دربار و محل سرا میں اس کا موقع بھی کم تھا۔ لیکن اس سے قطع نظر ایسی عداوت خود اورنگ زیب کے اس حکم و انکسار نیز اطاعت گزاری و سعادت مندی کے خلاف تھی جن کی مثالوں سے ہمعصر تواریخ اور عالمگیری خطوط کے اوراق معمور ہیں۔ انہی رقعات کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہم پہلی مرتبہ ایک ایسے مغل شہر یار سے دوچار ہوئے ہیں جس کی عادات و افکار بلکہ رنگ و پے میں اسلامی تعلیم سرایت کر گئی تھی۔

اورنگ زیب کے
بعض خصائل

اسی مذہبی میلان اور ذوق عبادت کا نتیجہ تھا کہ اورنگ زیب نے زیر نظر زمانے میں بھائی کی دراندازی سے تنگ آکر گوشہ گیری کا ارادہ کر لیا وہ بخوبی سمجھ گیا تھا کہ اگر اپنے منصب اور عہدے پر فائز رہ کر وہ اسی طرح تن دہی سے بادشاہ کی خدمت انجام دے گا تو اس کے بھائی کی آتش رشک و حسد برابر ترقی کرتی رہے گی اور آئندہ جنگ و تنازع کے سوا اس کا کوئی اچھا انجام نہ ہوگا۔ لہذا ان مختصات سے بچنے کی خاطر اس نے ان دنوں جب کہ وہ بیمار بہن کی عیادت کے لئے آکرے آیا ہوا تھا "سرکاری عہدے سے استعفا دیدیا"۔

گوشہ نشینی کا ارادہ

واضح رہے کہ اس ارادہ خلوت نشینی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ عداوت و حسد کا بے گناہ شکار ہونے کے علاوہ اورنگ زیب کو اپنے بڑے بھائی کے ماتحت و حاشیہ نشین رہ کر زندگی گزارنے کی گوارا نہ تھی۔ وہ داراشکوہ کو مذہباً ملحد اور اخلاقاً سفلہ پرور و بدخو جانتا تھا اور اس دلی بیزاری کو ظاہری محبت و خوشامدی صورت میں بدل دینا اس کے مزاج و طبیعت کے خلاف تھا۔ نظریں اپنے ذمی اثر بھائی کی دشمنی سے محفوظ رہنے کی بہترین تدبیر یہی تھی کہ معاملات سلطنت سے دست کشی کر لی جائے اور باقی ماندہ زندگی ہندو خواہ بیرون ہند میں

درویشانہ طریق پر بسر کی جانے جس کا شوق اورنگ زیب کو تمام عمر دامن گیر رہا۔ لیکن اس طرح منصب سے کنارہ کش ہونے میں خود شاہجہاں کی بیجا طغیانی کی شکایت مضمر تھی اور قرینہ کہتا ہے کہ اس بدگمانی کی بنا پر وہ اورنگ زیب کے استغنے سے ناخوش ہوا۔ مگر یہ چند روز کی بات تھی۔ محبت پدری اور شاہی جوہر شناسی نے بہت جلد رنجیدہ شہزادے کو منالیا اور اسے پھر بادشاہ کے اصرار سے گجرات کی صوبہ داری پر اجماع آباد جانا پڑا (ذو الحجہ ۱۰۹۶ھ)۔

ع۔ استغنے کے واقعے کا شاہی تاریخ نویسوں نے مختصر طور پر ذکر کیا ہے (بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۳۷۶) اور اسی کے تول کو خانی خاں نے نا بھمی سے الفاظ بدل کر اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے (جلد اول صفحہ ۶۰۰) لیکن بعض دیگر شہادتوں کے علاوہ اس واقعے کی سب سے اچھی شہادت اس خط میں محفوظ ہے جو اورنگ زیب نے دوسری مرتبہ کی صوبہ داری کے زمانے میں دکن سے اپنی بہن جہاں آرا بیگم کے نام ارسال کیا تھا۔ خط کی تاریخی صحت و اصدیت میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں اور ہم ذیل میں اس کا ضروری حصہ بحسنہ نقل کرتے ہیں تاکہ داراشکوہ کی زیادتی اور شاہجہاں کی بیجانا انصافی کا جو اورنگ زیب کے ساتھ روا رکھی جاتی تھی صحیح اندازہ ہو جائے۔

خیر اندیش آئندہ مند بعد انہماک شیناق معروض می دارد کہ بر خاطر عطف و ناز پوشیدہ نہ خواہد بود کہ اعظم حضرت از قایت عنایت این مرید فدوی را بہ منصب امتیاز بخشیدہ اند بہر خدمت کے از پیشگاہ خلافت امور شدہ بقدر امکان و استقلال آں را بہ تقدیم رسانیدہ بہ ہیج باب کوتاہی نہ نمودہ و اطاعت و بندگی پیرو مرشد حقیقی را سعادت خویش دانستہ در جمیع کار با نظر براستروقتی خاطر مقدس داشتہ فی داند کہ دریں وقت چہ تعقیر و خطا از این مرید سرزدہ کہ امور سے کہ موجب خفت و عدم اعتبارش دور و نزدیک است بنظہوری رسد۔ اول مقدمہ قلند اسیر..... زہے خسارت و ندامت و کم طالعی این مرید کہ وہاں وجود آنکہ مدت بست سال صرف خدمت و بندگی نمودہ در طریق عقیدت بجان و مال مضایقہ نہ کردہ، ہنوز برابر برادر زادہ پہل (۹) ہم سامان اعتماد نیست..... مشفقہ من اگرچہ این فدوی ہرگز خود را داخل مریداں و بندہانہ شمردہ بجز غلامی دعوی نہ دار و وہر وضعی کہ دارند بخورند دست۔ لیکن از آنجا کہ از دولیت اعظم حضرت عمرے بعزت و ناموس گزرا نیدہ و درمیں ولایت مدتے بہ استقلال بسر بردہ درنہ لائیز پیرو مرشد حقیقی بے خواہش و انہماک مرید محض بفضل ایالت این مملکت را بہ این اخلاص آئین مرحمت فرمودہ اند و ظہور این

باب

لیکن ابھی کسی بڑی لڑائی کی نوبت نہ آئی تھی کہ شہزادہ ہمایوں نے باپ کے روکتے روکتے
بلخ سے واپس چلا آیا۔ اس کی ذاتی بہادری مسلم تھی لیکن سپہ سالاری کی ذمہ داریاں اور
عرصے تک گھر سے دور سرد ملکوں میں پڑے رہنا اس ولدادہ پیش نوجوان کے مزاج سے کوئی
مناسبت نہ رکھتا تھا۔ قریب قریب اسی قسم کی طبیعت اس کے دوسرے بھائی شہزادہ شجاع
کی تھی جس نے لیت و لعل سے اپنی جان بچائی اور ہم کاسارا بار شہزادہ اورنگ زیب پر پڑا
جو ۱۰۵۷ء کے شروع میں حسب الحکم لاہور سے کابل اور وہاں سے بلخ پہنچ گیا۔ راستے ہی میں
ازبکوں سے لڑائیاں شروع ہوئیں تھیں اور آئندہ سات آٹھ چھینے تک برابر جنگ کا سلسلہ
جاری رہا۔ اورنگ زیب کی کل میدانی فوج پچیس ہزار بھی نہ تھی اور مقابلہ پوری ذریعہ قوم سے
تھا جو اگرچہ ایسے عمدہ اسلحہ سے آراستہ نہ تھی لیکن جنگ قزاقانہ کی مشاق اور تعداد میں انہوں سے
کبیس زیادہ تھی۔ چنانچہ ایک جگہ شکست کھانے کے بعد وہ ہٹ کر دوسری جگہ جمع ہو جاتے
اور اپنے ناگہانی اور چار طرفہ حملوں سے منلوں کا ناک میں دم کر دیتے تھے۔

بالآخر شاہجہاں کو اپنی غلطی نظر آگئی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ شمالی پہاڑوں کے ان
جنگجو اور آزادی پرست باشندوں پر جبراً حکومت کرنا نہایت مشکل اور خرچ طلب کام ہے۔
اسی سال ویرانہ سال کی لڑائی میں بادشاہ کے شوق کشور کشائی کی خاطر تین کروڑ سے زیادہ
روپیہ صرف ہو چکا تھا اور کامل تسلط قائم کرنا روز بروز دشوار تر ہوتا جاتا تھا۔ غرض
سنہ مذکور کے اواخر میں افواج شاہی کو واپسی کے احکام پہنچ گئے اور جس طرح ہوا ازبک
حریفوں سے صلح صفائی کر کے اورنگ زیب اور ہندی لشکر کابل کی جانب ہٹ آیا۔
نقصان جان کا کل اندازہ چھ ہزار کے قریب کیا جاتا ہے جس میں سے پانچ ہزار سپاہی
صرف برفباری اور بیماری سے ضائع ہوئے۔

لیکن مہم کی ناکامی کے باوجود غور و غفل سپہ سالار کی قابلیت اور دیسری
کی دوست دشمن پر شخص کے دل پر دھاک بیٹھ گئی اور آئندہ بھی سلطنت کی سب سے
بڑی فوجی مہم یعنی فتح قندھار کے لئے اسی کو سپہ سالار بنایا گیا۔ واضح رہے کہ ان لڑائیوں

قمان و سندھ کی

صوبہ داری

۱۰۵۷ء تا ۱۰۶۲ء
۱۵۲ تا ۱۵۷

علا بادشاہ نامہ جلد دوم صفحہ ۷۰۲، خانی خاں نے منل فوج کی تعداد بیس ہزار بتائی ہے۔ (جلد اول صفحہ
۱۶۱) لیکن غالباً اس میں وہ دس بارہ ہزار سپاہی بھی شامل ہیں جو قلعوں میں مقیم تھے۔

باب

تو جم کر ان کا مقابلہ کیا جائے۔ لیکن دنیا میں لڑائی کا فیصلہ مستحکم مورچوں اور سنگین بروج و فیل پراتنا منحصر نہیں جتنا فریقین کی جنگی قابلیت اور عزم و استقلال پر ہے۔ دوسرے ایرانیوں کے پاس آتش اسلحہ ہندیوں سے بہتر تھے اور ترکوں سے بہم جنگ و جدال نے انھیں توپ اندازی کے فن میں طاق کر دیا تھا۔ بہشتیہ میں انھوں نے خلافتِ توقع شدید سردی کے زمانے میں قندھار پر فوج کشی کی اور دو مہینے کے محاصرے کے بعد یہ سنگین قلعہ قلعہ دار کی نااہلی اور ہندی دستوں کے باہمی نفاق نیز غداری کی بدولت تسخیر ہو گیا۔

اس مرتبہ حکومت ہند نے لکھ پھانے میں جو تباہ و تباخیر کی تھی اس کی پھر کبھی تلافی نہ ہو سکی۔ دونوں ہمیں جو اورنگ زیب کی سپہ سالاری میں بھی گئیں (۱۱۴۵ھ) ناکام رہیں۔ ایرانیوں کی عمدہ توپوں اور مشاق توپچیوں نے ہندی فوج کو سرنگیں لگانے یا فیل میں رخنہ کرنے کا موقع ہی نہ دیا اور شہزادے کی یہ درخواست کہ یورش کر کے قلعہ لینے کی اجازت دی جائے، شاہجہاں نے منظور نہیں کی۔ آخر مہم ناکام و نامراد واپس آئی اور دو سال بعد دارا شکوہ کی مہم کا اس سے بھی بدتر خسر ہوا۔ اس نے اور اس کے مصاحبوں نے اورنگ زیب کی ناکامی پر خوب قہقہے لگائے تھے اور اب کہیں زیادہ لشکر و ساز و سامان کے ساتھ قلعہ پر فوج کشی کی اجازت لی تھی کہ جو کام بھائی سے نہ بن پڑا وہ خود کر دکھائے لیکن اس مرتبہ اپنی بھی کامیابی نہ ہوئی اور بیشتر نقصان جان و مال کے ساتھ منغل فوجیں واپس ہٹ آئیں (۱۱۵۳ھ)۔

دکن کی
دوسری
صوبہ دار

اس اثنا میں شہزادہ اورنگ زیب کو دوسری مرتبہ مالک دکن کی صوبہ داری پر نامزد کر کے بھیجا گیا تھا (۱۱۶۲ھ) اور محض یہ انتخاب اس بات کی نہایت عمدہ شہادت ہے کہ حکومت ہندوستان کے نزدیک کوئی امیر و شہزادہ اس سے زیادہ قابل و مشتم نہ تھا۔ کیونکہ گزشتہ آٹھ نو سال میں صوبہ داروں میں کئی بار تبدیلی کے باوجود ان جنوبی صوبوں کی اندرونی حالت اس درجے خراب ہو گئی تھی کہ مالی فائدہ درکنار، وہاں کے سرکاری معارف ہی کے واسطے الٹا شاہی خزانے سے روپیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ زراعت و تجارت دونوں میں

تغزل کے آثار نمایاں تھے اور مالگیزی تین کروڑ $\frac{1}{4}$ ۶۲ لاکھ کی بجائے گھٹتے گھٹتے صرف ایک کروڑ روپیہ تخمینہ کی جانے لگی تھی۔ فوجوں کی حالت ایسی ابتر ہوتی جاتی تھی کہ شاہان بجا پور کو لکندہ کئی سال سے مقررہ پیش کش ادا کرنے میں سیت و عمل کرنے لگے تھے بلکہ بعض اوقات ان کی جانب سے سرکشی کا اظہار ہوا تھا اور نئے صوبہ دار کے مستقر پر پہنچنے سے پہلے شاہجہاں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی اور شاہ بجا پور کے ”کفران نعمت“ کی خاص طور پر شکایت کی تھی۔

شہزادہ اورنگ زیب کے دولت آباد پہنچتے ہی ان حالات میں ہمیں نمایاں انقلاب ہوتا نظر آتا ہے۔ اور تین سال کے اندر دکن کے شمالی صوبوں کی حالت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے، یہاں کی مزرعوں اور ارضی کی پیمائش اور مختلف حیثیتوں کی تشخیص جو ملک عنبر کے عہد میں شروع ہوئی تھی اسی نے وسیع پیمانہ پر کرائی اور مرشد قلی خاں اور ملتفت خاں جیسے لائق عہدہ داروں کے مشورے سے پہلی مرتبہ وہ مالگیزی بند و بست ”راج“ ہوا جو عرصہ دراز تک دھارا مرشد قلی خاں کے نام سے مشہور تھا۔ بہت سے ویران علاقے از سر نو آباد ہوئے

۱۔ آداب عالمگیری ورق ۱۵۔ نیز دیکھو اثر الامرا جلد سوم صفحہ ۴۹۶ و ۴۹۷۔ باب مادونا تہ سرکار نے بھی ان حالات اور بعد میں اورنگ زیب کی اصلاحات کے نتائج کو کافی تحقیق و تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ (تاریخ اورنگ زیب جلد اول باب نہم)۔

۲۔ آداب عالمگیری ورق ۳۴۔ واضح رہے کہ ان شیعہ ریاستوں کے ساتھ حکومت مغلیہ کے معاملات کو عہد عالمگیری کے متوجہوں نے جو خود شیعہ ہیں۔ اس طرح بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہو سکے مغلوں کی زیادتی اور نا انصافی ظاہر ہو۔ اور ان کی ذاتی آراء اور بعض غلط روایات کی بنیاد پر انگریزی تاریخ نویسوں نے اچھی کتابوں میں اورنگ زیب پر اس قدر اہتمام و الزام وار کئے ہیں کہ ان کی تردید و تکذیب کے لیے ضخیم سے ضخیم کتاب بھی چھپ کر کافی چوکتی ہے۔ ہماری تاریخ میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان عجیب عجیب الزامات اور اعتراضات پر بحث کی جائے۔ ہم صرف عہد عالمگیری کے اہم واقعات کو صحت و تحقیق کے ساتھ اپنے طور پر بیان کریں گے اور ان اعتراضات اور غلط بیانیوں سے ہمیں قطع نظر کرنی پڑے گی تو

اب

اور نقاوی کی فیاضانہ اعانت سے بہت سے بنجر قبضے سرسبز و زرخیز بن گئے، اورنگ آباد کی آئندہ عظمت و شہرت کی بنیاد اسی زمانے میں پڑی اور یہ قصبہ (کھڑکی) جو ملک عبیر کے عہد میں ابھی طرح آباد ہو گیا تھا شہزادے کے نام پر بتدریج ایک خوبصورت و وسیع شہر بننے لگا۔

صوبے کا اندرونی نظم و نسق اور فوج کی درستی کے بعد اورنگ زیب کو فرصت ملی کہ دکن کی ریاستوں کے معاملات پر اپنی توجہ مبذول کرے یا دیکھنا چاہئے کہ منگل کشور کٹا مدتوں سے ان ریاستوں کی فتح کی تمہید ڈال چکے تھے احمد نگر کی تسخیر کے بعد بیجا پور نے خود ہی اپنے آپ کو ان کے جال میں پھنسا لیا تھا اور گو لکنڈے کے بادشاہ کو شاہ جہاں اور نیز اورنگ زیب نہایت حقیر جانتے تھے۔ وہاں کی دولت و ثروت سن کر جس قدر طمع پیدا ہوتی تھی اسی قدر مذہبی حمیت انھیں اس ملک کو قطب شاہیوں سے چھین لینے پر ابھارتی تھی جن کے آخری عہد میں یہ ملک فسق و فجور، بدعت و اوہام کا گھر بن گیا تھا۔ گزشتہ معاہدوں کے بعد آئندہ لڑائی چھیڑنے کے بھی بہت سے مواقع مغلوں کو مل گئے تھے کیونکہ دکن کی یہ زوال پذیر حکومتیں اکثر ان شرائط کی خلاف ورزی کرتی تھیں اور اصلی قوت نہ ہونے کی وجہ سے فریب و سازش پر ان کی سیاسی کامیابی کا انحصار رہ گیا تھا، ظاہر ہے کہ ایک طاقتور حریف کے سامنے جو اپنے ہمسائے کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے پر تلا ہوا تھا، ایسی حیلہ سازیاں زیادہ عرصے تک کا گر نہیں ہو سکتیں۔ جب گزشتہ پیش کش کی رقوم ادا کرنے میں دیر بار گو لکنڈہ کی طرف سے براہریت و صل ہوتی رہی اور اسی طرح بعض اور مطالبات کے تسلیم کرنے میں تاہل و سرکشی کا اظہار ہوا تو آخر کار شاہ جہاں کے حکم سے منگل فوجیں گول کنڈے کے علاقے میں گھس گئیں اور اس قدر تیزی سے حیدر آباد پر بڑھیں کہ عہدائندہ قطب شاہ بے حواس ہو کر شہر سے بھاگا اور قلعہ گو لکنڈہ میں قلعہ بند ہو گیا۔ (۱۶۵۶ء)

لے مائل خاں شیرازی صاحب ”واقعات عالمگیری“ کی یہ روایت (جو متن کی اور برنیر کی تحریروں میں کسی قدر اختلاف کے ساتھ موجود ہے) کہ اورنگ زیب نے اپنے بڑے بیٹے شہزادہ محمد سلطان کو

مغلوں کے مقدمہ ہمیش نے حیدرآباد پر قبضہ کر لیا اور انتظام ہوتے ہوتے اس دو تہہ شہر کے بعض حصوں کو لوٹ لیا، محصور و مجبور عبداللہ قطب شاہ اب تمام خسرات ماننے پر عاجزانہ آمادگی کا اظہار کر رہا تھا لیکن اورنگ زیب کا فشا یہ تھا کہ اگر شاہجہاں اجازت دے دے تو اب اس ریاست کی علیحدہ ہستی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ حیدرآباد کی طرف کوچ کرتے وقت باپ کو تحریر کرتا ہے کہ عادل شاہ کی طرف سے شورش و سازش کے آثار دیکھ کر ”ایں مرید توقف را مصلحت نہ دیدہ از ناندیڑ کوچ نمودہ بہ اعتضاد عنایت الہی و توجہ پیر و مرشد حقیقی عازم صوبہ گولکنڈہ است و تا رسیدن میر حیدر آغا بودہ اگر حکم اشرف صادر گردد بہ توفیق یزدانی و اقبال لایزال قبلہ و کعبہ دو جہانی قطب الملک را با سہل و جہہ و تکیہ ساختہ تمامی ولایت اورا..... بجزوہ تصرف و تسخیر خواهد آورد..... و بر تقدیریکہ اٹھ حضرت باوجود صدور چنین حق ناسپاسی بکافر نعمتی و ظہور این قسم تقصیر غلطیم کہ قلب الملک کوتاہ اندیش مرتکب آں گردیدہ..... بہ انتزاع مملکت او حکم نفرمانید خواہر و اقبال..... دبست و دولک روپیہ از بقایاے پیش کش سابق کہ بر ذمہ او ماندہ با پیش کش خیرے از و گرفتہ مراجعت خواهد نمود“

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ بگلے ہانے کے بہانے حیدرآباد کی طرف بھیجا اور ایک بہ یک عبداللہ قطب شاہ پر حملہ کر دیا تھا، ایک بازاری گپ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ سرکار نے بھی اس کی تردید کی ہے ائمید باب بیہم جلد اول) اور جیسا کہ شاہجہاں نامہ (عمد وارث اور آداب عالمگیری کے متعدد خطوط سے ظاہر ہوتا ہے عبداللہ قطب شاہ کو ہفتوں پہلے سے اعلان جنگ دیدیا گیا تھا، لیکن سرکار صاحب نے یہ تازہ الزام نرا شاہجہاں کہ اورنگ زیب نے بیٹے کو ہدایت کر دی تھی کہ عبداللہ قطب شاہ کو ملاقات کے بہانے بلا کر قتل کر دے۔ اس کے ثبوت میں آداب عالمگیری کا جو خط وہ پیش کرتے ہیں اول تو وہ ہمیں اپنے پیش نظر نسخے میں کہیں نہیں ملا دوسرے غلامی کے انگریزی ترجمے میں (صفحہ ۲۳۰) ”ملاقات کے بہانے سے قتل کرنے“ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔“

۱۔ آداب عالمگیری۔ ورق ۵۳۔ خط کا اردو میں غلام یہ ہے کہ خاکسار کو (یعنی شہزادہ اورنگ زیب کو) زیادہ ٹھیکر خلاف مصلحت نظر آیا۔ لہذا ناندیڑ سے گولکنڈہ روانہ ہوا ہے اور میر حیدر کے (شاہجہاں کے پاس) سے

باب
دارا کی
خلافت

لیکن شاہجہاں بذات خود گولکنڈے کے الحاق پر آمادہ تعیانہ تھا، اس کے بڑے بیٹے کو یہ بات کسی طرح منظور نہ ہوئی۔ چلہ منے والے باپ کی عمر کے ساتھ اس کا معاملات سلطنت میں روز بروز دخل بڑھتا جاتا تھا اور اسے سب بھائیوں سے زیادہ اورنگ زیب کا حد تھا جس کی شہرت کا رگزاری میں برابر ترقی ہو رہی تھی۔ ادھر خود اورنگ زیب کی بھائی سے ناراضی کی نوعیت بھی اب بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ زمانہ گیا جبکہ وہ بڑے بھائی کے رشک و حسد سے بچنے کی خاطر مجبوراً گوشہ نشینی اختیار کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک پختہ کار صاحب اہل و عیال آدمی تھا اور اگر اسے اپنی اولاد کی آئندہ فلاح و بہبود کی طبعی فکر نہ تھی تو بھی غالباً اب وہ اپنی زندگی کو دنیا میں رہ کر پوری قوت و مستعدی کے ساتھ خالصتہً لوجہ اقتدار گزارنے کے راز کو سمجھ گیا تھا۔ اور اگر وہ خود سلطنت ہند کا آرزو مند نہ ہو یا اول اول صرف مالک دکن کی بادشاہی اس کا صلح نظر ہو تو بھی یہ قریب قریب یقینی بات ہے کہ اسے داراشکوہ کا آئندہ بادشاہ ہونا سخت ناگوار تھا کیونکہ اس شہزادے نے اسلامی تصوف اور دعویٰ ولایت کے دائرے سے گزر کر اب وہ ”مشرّب و سبع“ اختیار کر لیا تھا جو اس زمانے کے اکثر مصنفوں کے نزدیک تو ”آزاد خیالی“ کی دلیل ہے لیکن راسخ العقیدہ مسلمانوں میں ہمیشہ لاذہبی اور بے دینی سمجھا گیا ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ آئے تک اسی طرف قیام کرے گا کہ اگر بادشاہی حکم ہو تو قطب الملک کو گرفتار کر لیا جائے۔ لیکن اگر حضور (یعنی شاہجہاں) کو قطب الملک کی غلط کاریوں کے باوجود یہ منظور نہیں ہے تو اس صورت میں اس سے صرف پیش کش کی باقیات اور نیز کچھ تاوان لینے پر اکتفا کی جائے گی۔ لہ ”مطائف الاخبار“ سے جو داراشکوہ کے ایک مدح کی تعریف ہے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شہزادہ اپنی کشف و کرات کا بہت دن سے مدعی تھا (صفحہ ۱۷) صوفی سرمد اور جوگی لال داس اس کے شہور استاد ہیں۔ پھر اسے ”مجمع البحرین“ نامی کتاب لکھ کر یہ ثابت کرنا چاہا کہ دنیا کے سب مذہب ایک ہیں اور ”اچندہ“ کے فارسی ترجمے میں جہاں تک ترقی کی کہ قرآن مجید کو اسی کتاب سے ماخوذ بتایا، بظاہر وہ اپنے پروردگار اکبر کا مقلد تھا اور عجب نہیں کہ بادشاہ ہو کر ”دین الہی“ کی طرح اس کے واسطے بھی کوئی نیا مذہب تیار کر لیا جائے۔

ہاں ہمدردنگ زریب نے اپنی طرف سے آخر تک بھائی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ دکن کی دوسری صوبہ داری کے زمانے میں بار بار صدر حکومت نے اس کی آزار رسانی اور توہین کی کوشش کی۔ اس کی مالی اور فوجی اصلاحات کے راستے میں طرح طرح کی مشکلات مائل کی گئیں جنہیں وہ اپنے متعدد خطوط میں باپ کو جتاتا ہے۔ اب بھی گو لکھنؤ کی تسخیر سے حکماً اس کو روک دیا گیا اور وہ اپنی فٹائے خلاف محض باپ کی تعمیل حکم میں پیش کش کی کچھ رقوم اور آئندہ اطاعت گزاری کے ناقابل اعتبار عہد و پیمان لے کر واپس اورنگ آباد چلا آیا (۱۶۵۶ء) اسی طرح جب سال آئندہ خود شاہجہاں کے حکم اور شاہی افواج کی امداد سے اس نے بیجا پور پر فوج کشی کی اور اپنی حیرت انگیز قابلیت سپہ سالاری اور شجاعت سے بمیدرو کلیانی جیسے مستحکم قلعے چھین لیے نیز اہل بیجا پور کو کئی خونریز معرکوں میں شکستیں دیں (۱۶۵۶ء) تو عین اس وقت جب کہ اس نے دشمن کی قوت مدافعت کو مضصل کر دیا تھا اور اس کی فتنہ فو میں بیجا پور کے اندرونی علاقوں میں بڑھ رہی تھیں شاہجہاں نے حکماً اس کو صلح کرنے پر مجبور کیا اور اسے بادل ناخواستہ بیدرو کلیانی کے اضلاع اور ڈیرہ کڑوڑ و سپہ بقایا و تاوان کی شرط پر حکومت بیجا پور سے صلح کرنی پڑی۔

اورنگ زریب کے خلاف یہ تمام کارروائیاں داراشکوہ کی کوشش و رسوخ کا نتیجہ تھیں اور جب اسی زمانے میں (ذو حجہ ۱۶۵۶ء) شاہجہاں سخت بیمار ہوا تو پھر تمام اختیارات، علانیہ اس کے ہاتھ میں آ گئے اور اس نے سب سے پہلا کام ہی کیا کہ

خانہ جنگی

۱۔ چنانچہ عبداللہ طلب شاہ نے غلوں کے واپس جانے کے بعد صلح نامہ کی اکثر شرط کی تفصیل نہیں کی تفصیل کے لیے دیکھو سرکار، جلد اول صفحہ ۴۴ وغیرہ)

۲۔ خانی خاں لکھتا ہے (جلد دوم صفحہ ۴۴) دو داراشکوہ کو ولی عہد مستقل خود راجی گرفت و درایام صحت نیز تمام اختیار ملک رانی بدست او بدو یہ تقلید ملحدان صوفی مشرب تصوف را ہدام ساختہ کفر و اسلام را بزدور توام خواندہ دریں وقت فرصت را غنیمت دانستہ اغیار امور سلطنت کثمت اقتدار خود در آوردہ نیز دیکھو آثار عالمگیری صفحہ ۳۰ وغیرہ وغیرہ۔

تاکیدی احکام بھیج کر دکن کی بادشاہی فوجوں کو جو اورنگ زیب کی امداد کے واسطے بھیجی گئی تھیں، واپس طلب کر لیا۔ اس شہزادے نے ہر چند چاہا کہ یہ فوجیں کم سے کم اس وقت تک کہ صلح نامے کی شرائط کی تعمیل ہو جائے، ٹھہری رہیں لیکن ملک میں عام طور پر شاہجہاں کے انتقال اور دارا شکوہ کی تخت نشینی کی افواہیں پھیل گئی تھیں افواج شاہی کے سرداروں نے اورنگ زیب کی ایک نہ سنی اور بعض علانیہ سرکشی کے ساتھ بغیر اس سے رخصت ہوئے شمالی ہند کی جانب روانہ ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذکورہ بالا شرائط صلح کی بجا آوری میں بھی اہل بجا پور ریت و لعل کرنے لگے۔

اس اثناء میں ادھر تو دارا شکوہ نے بھائیوں کے دکیوں کو آگرے میں نظر بند کر کے ان کے خط و کتابت کے تمام ذرائع مسدود کر دیے اور ادھر اورنگ زیب کو مکمل بھیجا کہ صوبہ برآر (و خاندیس) کو فوراً شہزادہ مراد بخش کے حوالے کر دیا جائے جسے گجرات کا صوبہ خالی کر کے برآر جہانے کے احکام پہنچ گئے تھے ساتھ ہی جسونت سنگھ اور قاسم خاں کو فوج دے کے مالوے بھیجا گیا کہ ضرورت ہو تو جبراً ان احکام کی تعمیل کرائیں۔

دارا شکوہ کی یہ اور اسی قسم کی دوسری کارروائیاں بھائیوں کی علانیہ عداوت اور خود اس کی جلد بازی اور ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھیں۔ ان کا اثر یہ ہوا کہ شجاع نے بنگالے میں اور مراد نے گجرات میں شاہجہاں کی وفات اور اپنی خود مختار بادشاہی کا اعلان کر دیا اور شجاع جسے اپنی جنگی کشتیوں اور توپوں پر بہت ناز تھا، فوراً افواج آراستہ کر کے دہلی کی جانب روانہ ہو گیا کہ بڑے بھائی کو شکست دیکر خود سلطنت پر قبضہ کر لے! اس کے مقابلے کے واسطے دارا نے اپنے بڑے بیٹے سلیمان شکوہ اور راجہ جے سنگھ کو بھیجا جنہوں نے بنارس کے قریب شجاع کو سخت شکست دی (۱۰۶۵ھ) اور منگلپور تک اس کے تعاقب میں آئے تھے کہ

باب

پائے تخت سے انھیں بے حجت واپس آنے کا حکم ملا کیونکہ اس اثنائیں دارا کے جنوبی حریف جسونت سنگھ اور قاسم خاں کو شکست دے کر شمالی مالوے تک بڑھ آئے تھے۔

اورنگ زیب کی فتوحات

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ جب شاہی افواج کے دکن سے واپس جانے کے بعد اورنگ زیب کو بادل ناخواستہ بیجا پور کے علاقے سے ہٹنا پڑا اور ادھر اپنے دکیل دربار کی گرفتاری، اور خط و کتابت کے سد باب کے ساتھ ہی برآر سے دست بردار ہونے کا حکم پہنچا تو وہ نہایت پریشان ہو گیا۔ مراد بخش نے تو گجرات کو خالی کرنے کی بجائے وہاں اپنی خود مختار بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا اور براہ اورنگ زیب کو خط لکھ کر دارا کے خلاف لشکر کشی پر ابھار رہا تھا لیکن خود اورنگ زیب اب بھی باپ کے بیٹے جی علانیہ انحراف یا بادشاہی کا دعوے کرنا نہ چاہتا تھا اور ایک عرصے کے تردد و انتشار کے بعد وہ اپنی فوج لے کر خاندیس تک بڑھا (جمادی الاول ۱۰۹۱ھ) تو اس کا سبب بھی محض یہ تھا کہ اگرے سے نسبتاً قریب رہ کر اپنے خطوں کے جواب کا انتظار کیا جائے۔ اور ”ہموہتر صد داشتند کہ شاید عارضۂ آنحضرت (شاہجہاں) بالکلیہ زائل شدہ صحت کامل حاصل آید تا یہ نظم و نسق مہات خلافت و جہان بینی کہ بہ سبب ضعف و آزار..... خلل پذیرفتہ بود“ پفس نفیس متوجہ گردیدہ کار دولت و سلطنت را از نو نظام و سرانجام بخشند و دست تصرف و استقلال بے شکوہ (یعنی دارا شکوہ) خسران مال از مراتب ملک و مال کو تاہ سازند“ (عالمگیر نامہ صفحہ ۴۹) لیکن یہ آخری خیال غلط نکلا۔ شاہجہاں تندرست ہونے کے بعد بھی دارا شکوہ کے ”دست تصرف“ کو ”کو تاہ“ نہ کر سکا۔ جسونت سنگھ اور قاسم خاں نے دکن کے راستے روک کر گجرات پر فوج کشی کی تیاری کی کہ مراد بخش کا استیصال ہو جائے تو اطمینان سے اورنگ زیب کی طرف متوجہ ہوں، اس وقت

لہذا ناری عبارت کا اردو میں خلاصہ یہ ہے کہ اورنگ زیب کو اس بات کی بھی امید تھی کہ شاید بادشاہ کی صحت بالکل درست ہو جائے گی اور وہ ملکی انتظامات کی جانب، جس میں اتنے دن کی حالت سے خلل پیدا ہونے لگا تھا، پھر خود متوجہ ہو کر دارا شکوہ کی مداخلت کو دور کر دیں گے۔

باب

مراد نے سخت اصرار و منت کے ساتھ بھائی کو امداد و اتحاد کے خط بھیجے اور خود اورنگ زیب کو نظر آنے لگا کہ ”اگر وہ بادشاہ ہونا یا محض آزادی سے زندہ رہنا چاہتا ہے تو اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا غیر ممکن ہے۔“

آخر اس نے مراد بخش کی درخواست قبول کر لی اور معاہدہ ہو گیا کہ ضرورت ہوئی تو دونوں بھائی مل کر داراشکوہ کا مقابلہ کرتے رہیں گے اور اس کے استیصال کی صورت میں کابل و کشمیر، شمالی پنجاب اور سندھ و ملتان کا ملک شہزادہ مراد بخش کے حصے میں آئے گا اور باقی ممالک ہند اورنگ زیب کی ملکیت ہوں گے۔ پھر اس نے برہان پور سے کوچ کیا اور زبداتر کے جسونت سنگھ کے مقابلے کے لیے بڑھا، جو ان دنوں آجین میں مقیم تھا۔ راستے میں مراد بخش اپنی آٹھ دس ہزار فوج لے کر بھائی سے آگے اور اب اورنگ زیب کی کل فوج حریف کے تقریباً مساوی یعنی تیس چالیس ہزار کے درمیان ہو گئی۔ لڑائی سے پہلے اس نے جسونت سنگھ کو کہہ دیا ”میرے ساتھ آؤ، اگرچہ میری پیش قدمی احکام شامی کے خلاف ہے لیکن جب تک اگرے جا کر میں اپنے باپ سے خود نہ مل لوں گا، مجھے اطمینان نہ ہوگا اور واپس دکن نہ جاؤں گا۔ یہ کوئی بغاوت یا بادشاہ سے لڑائی نہیں ہے اور تم کو چاہیے کہ یا تو میرے ہمراہ اگرے چلو یا راستہ چھوڑ کر ہٹ جاؤ۔“

جسونت سنگھ نے ان میں سے کوئی بات نہ مانی، اور جب تک آجین کے قریب سخت شکست نہ کھائی (رجب ۱۰۶۵ھ) راستہ نہ دیا، لڑائی میں اس کے بہت سے راجپوت سپاہی اور سردار مارے گئے اور خود وہ مشکل جان بچا کر میدان سے فرار ہو گیا، فتح کی یادگار میں جو قصبہ اورنگ زیب نے مقام جنگ

۱۔ یہ حادثہ صاحب سرکار کے الفاظ ہیں (جلد اول صفحہ ۳۶۰) جو اورنگ زیب سے نہایت تعصب و بدگمانی رکھتے ہیں۔

۲۔ باب کے نیچے میں اس معاہدے کی نقل شامل کر دی گئی ہے نیز دیکھو واقعات عالمگیری ورق ۳۹۰ ا۔

۳۔ سرکار، جلد دوم صفحہ ۱۱۔

۴۔ عالمگیری نامہ صفحہ ۵۔ غازی خاں ۱۲۔ واقعات عالمگیری ۱۸۔

کے قریب آباد کیا تھا وہ فتح آباد کے نام سے اب تک موجود ہے۔

لیکن اس جنگ برادران کا سب سے بڑا اور فیصلہ کن معرکہ ڈیرہ جہینے کے بعد سموگر ٹھہ کے میدان میں ہوا جو آگرے سے آٹھ دس میل مشرق میں واقع ہے۔ یہیں اورنگ زیب نے اپنے کوہ وقار ثبات قدم اور عمدہ سپہ سالاری کے، اور مراد بخش نے سپاہیانہ تہور کے جوہر دکھائے۔ داراشکوہ نے حریفوں کے مقابلے میں قابلیت ذاتی کی اس کمی کو دگنی فوج اور کثرت ساز و سامان سے پورا کرنا چاہا تھا اور بے شبہ اس کی فوج کے پہلے حملے نے صفوں مقابل میں ہل چل ڈال دی تھی۔ لیکن اورنگ زیب جیسے سپہ سالار کے مقابلے میں یہ غلبہ محض عارضی تھا۔ اس کی صفیں پیچھے ہٹتے ہی پھر جم گئیں اور جس قدر حملہ آوروں کا ابتدائی جوش کم ہوتا گیا ہی قدر مدافعت کی چیرہ دستی بڑھتی گئی۔ اورنگ زیب نے اپنے توپ خانے کو وسط میں برابر بچائے رکھا تھا اور اس کی آتش باری ہی کی وجہ سے دشمن کی پہلی یورش اس کے بازوؤں کی طرف منتشر ہو گئی تھی۔ مگر جب دونوں طرف اس کا ریلا رک گیا تو شہزادہ محمد سلطان باپ کے حکم سے غنیم کے بائیں پہلو پر حملہ آور ہوا۔ واضح رہے کہ اس کا رسالہ اپنی توپوں کی بناء میں پیچھے کھڑا تھا اور دونوں پہلوؤں پر دباؤ پڑنے کے باوجود اورنگ زیب کے قطعی احکام نے اسے اب تک اپنی جگہ سے ہلنے نہ دیا تھا۔ اب یہ تازہ دم سوار گھوڑے اڑاتے ہوئے ایک طرف سے نکلے اور اپنے میمنہ کے ساتھ مل کر انھوں نے غنیم کے میسرہ پر اس جوش و قوت سے حملہ کیا کہ اس کی صفیں سمٹ کر پیچھے ہٹنے لگیں اور ہٹتے ہی پھر اورنگ زیب توپ خانے کی زد میں آ گئیں جس کی چند شلکوں نے ان کے حواس باختہ کر دیئے اور خود داراشکوہ کو جان بچانے کی پٹ گئی، ایک مستقل مزاج سپہ سالار کا جس کے پاس فوجوں کی کچھ کمی نہ تھی اس اچھا دے سے اپنے

لے۔ اورنگ زیب کی تیس بیست ہزار سپاہ کے مقابلے میں، دارا کی کل فوج کا شمار ایک لاکھ کے قریب تھا۔ (واقعات عالمگیری، ورق ۱۰) خانی خاں نے بھی ساٹھ ہزار سے زیادہ صرف سوار بتائے ہیں۔ ایسی صاف اور مربع شہادتوں کے مقابلے میں مرکا رکلا بلا سند پیش کیے بغیر لکھنا کہ دارا کی فوج کی تعداد تقریباً پچاس ہزار تھی (جلد دوم صفحہ ۴۰) عجیب قسم کی دیدہ دلیری ہے!

۱۴۳

یسرہ کو نکال لینا کچھ دشواریاں نہ تھیں اور تھوڑا سا نقصان اٹھا کر غنیمت کی دہری رو پجائی جاسکتی تھی۔ لیکن نازک مزاج دارا کو دھوپ کی تپش اور مضطربانہ ادھر ادھر تک دودھ پینے پریشان کر دیا تھا اب گرد و پیش لوگوں کے گرنے اور گھبرانے کے سہنے، نیز خود اس تک بعض آتش بازی کے ٹٹوؤں کے پھٹنے سے اس کے اوسان بگڑ گئے اور وہ گھوڑے پر سوار ہو کر بے حواسی کے ساتھ فرار ہو گیا۔ اور چونکہ اگر کسی میں دوبارہ کسی فوج کے مرتب کرنے کی امید نہ تھی لہذا راتوں رات پنجاب کے ارادے سے دہلی کی طرف چل دیا۔ یہ خونریز جنگ جس میں صرف دارا کے نقصانات کا اندازہ دس ہزار مقتول کیا جاتا ہے، ۲۹ مئی ۱۶۵۸ء مطابق ۱۰ مئی ۱۰۶۸ھ کے دن ہوئی۔

شاہجہاں اور
مراد کی نظربندی

اورنگ آباد سے روانگی کے وقت سے اب تک اورنگ زیب نے جس قدر افضل شاہجہاں کو ارسال کیں، ان میں سے کسی کا جواب نہ ملا تھا۔ سمو گولہ کی فتح کامل کے بعد جب کہ اسے وقت کے وقت کسی حریف کا خوف نہ تھا، اور نہ صرف دارا شکوہ کی فوج کے اکثر سردار و سپاہی بلکہ خود بادشاہ کے ذی اثر امرا اس کی اطاعت قبول کر رہے تھے، اس نے پھر ایک عرصہ داشت باپ کی خدمت میں بھیجی اور اس میں بھائی کی نا انصافیاں اجسا لاد کر کمال عجز و ذنابت کے ساتھ اپنی پیش قدمی کی معافی مانگی۔ اور تمام جمہوریاں لکھنے کے بعد بھی اپنے ہی تصور کا اعتراف کیا۔ شاہجہاں نے اس کے جواب میں فتح کی مبارک باد اور ایک تلوار ہدیہ ارسال کی جس پر ”عالمگیر“ کا خطاب کندہ تھا اور تین چار دن بعد اسے ملنے کے واسطے بلایا اورنگ زیب نہ صرف باپ کی ملاقات بلکہ اس خیر ظہر کہ دارا شکوہ کو آئندہ معاملات سلطنت میں کوئی دخل نہ دیا جائے اور وہ اپنے شمالی سویلوں میں (ملتان) رہے، مصالحت کے لیے بالکل آمادہ اور باپ کے حکم کے مطابق غالباً واپس دکن جانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے اپنے مشیروں کے شہادت پر بھی چنداں اعتنائے کی تھی لیکن جس وقت خاص شاہجہاں کے ہاتھ کا رقعہ جو دارا شکوہ کے نام دہلی بھیجا گیا تھا، راستے میں پکڑا گیا اور اورنگ زیب کے سامنے پیش ہوا تو بے شبہ وہ حیران رہ گیا ہر گاہ

کیونکہ ”آں مشور ناطق برآں بود کہ دارا شکوہ خاطر خود را جمع کردہ در شاہجہاں آباد ثبات قدم و رز دوازاں جا بیشتر نگذرد کہ مادرین جاہم را فیصل می فرمائیم“ سلطنت کے لیے اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو کمال بے دردی سے قتل یا اندھا کر دینا، اس زمانے کے طبقہ اعلیٰ میں اسی طرح جائز قرار دے لیا گیا تھا، جس طرح آج کل کمزور و مغلوب قوموں کی پامالی میں مصلحت سمجھی جاتی ہے اور اگرچہ اس بات کی صد ہا شہادتیں موجود ہیں کہ بعد میں بھی باپ کے ساتھ اورنگ زیب کی اس فرزندانہ محبت و تعلیم میں فرق نہیں آیا جو اس کی فطری سعادت اور سچی خدا ترسی کا نتیجہ تھی، تاہم وقت کے وقت اس قاتلانہ سازش کے جواب میں اس نے اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ محلات شاہی کو محصور کر کے

۱۔ واقعات عالمگیری ورق ۲۹۔

۲۔ شاہجہاں کی نظر بندی کے زمانے میں جو خط اورنگ زیب نے اسے اور اپنی بیٹی بہن جہاں آرا بیگم کو لکھے ہیں۔ ان کا نمونہ مختلف تاریخ و انشا کی کتابوں میں اور ایک معقول و مستند مجموعہ آداب عالمگیری میں موجود ہے (ورق ۲۱ تا ۲۴) پھر شاہجہاں کے انتقال کے بعد اس کے اپنے بیٹوں کے نام بہت سے خط رقعات عالمگیری میں ملتے ہیں جن میں اپنے مرحوم باپ (شاہجہاں) کے جا بجا حالات لکھے ہیں۔ اور ان خطوں کی ایک ایک سطر سے ایسی مخلصانہ محبت اور عاجزانہ تعلیم پر شکپتی ہے جس کی نظیر بادشاہوں کے کتبوبات درکار شاہی کسی فقیر زادے کی تحریر میں بھی مشکل سے میسر آئیگی۔ اس جگہ یہ ملاحظہ کرنا چاہیے کہ اس زمانے کے انگریزی تاریخ نویس اول تو فارسی تواریخ سے بہت کم واقف ہیں دوسرے انہیں (جوادیت) صاحب سرکار سمیت) فارسی زبان پر اتنا عبور نہیں کہ مذکورہ بالا خطوں کے صحیح مفہوم و فضا کو سمجھ سکیں۔ تیسرے اپنی طبیعت و تربیت کی وجہ سے بھی وہ اس بارے میں معذور ہیں۔ چنانچہ (مثلاً) انہوں نے اورنگ زیب کے بعض خطوط کو ”جن میں وہ حسرت و افسوس کے ساتھ اپنے گناہوں کا اعتراف اور آئندہ محاسبہ کا خوف ظاہر کرتا ہے“ اس کے گزشتہ محالہ و درجہ اٹم کے ثبوت میں پیش کیا ہے اور حقیقت یہ مادہ پرست و صنف اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ایک خدا پرست عابد کا نفس جس قدر زیادہ صاف اور مرکزی ہوتا ہے، وہی قدر اس کی ذمہ داریاں بڑھتی ہیں اور اسے اپنی خفیت ترین بغاوت بلکہ خدا کی یاد سے محض عارضی غفلت بھی سخت صحت اور قابل مواخذہ خطا محسوس ہونے لگتی ہے اور وہ ایسے انفعال و بخت کے دریا میں غرق ہو جاتا ہے جس سے حضور و رحمت الہی کی امید ہی اسے اوپر اٹھا رکھتی ہے۔

ب

شاہجہاں کو اطلاع دیدی جائے کہ اب وہ نظر بند ہیں! اب اوزنگ زیب نے دارا شکوہ کے تعاقب میں اگرے سے پنجاب کی طرف کوچ کیا۔ لیکن اس اثنا میں مراد بخش کی جانب سے اسے تازہ فکر پیدا ہو گیا کہ وہ ابھی سے خود مختار بادشاہی کا دعویٰ کر رہا تھا۔ اس نے بھائی سے ملوہ امرائے شاہی کو ملانا اور نئی فوج مرتب کرنی شروع کر دی تھی اور بھائی کے ساتھ چلنے میں بھی روپیہ نہ ہونے کے غدر برپس و پیش کرنے لگا تھا۔ اوزنگ زیب نے اسے بیس لاکھ روپیہ ارسال کیا اور ”ہر روز مکرر پیغام می فرستادند کہ چوں ہمنوڑ مطلب عمدہ (حسب معاہدہ) در پیش است سرسری قدم توجہ پیش نہاد مصلحت کار تقاضا نمی فرماید“، لیکن مراد بخش طیش و طمع کے جذبات سے جلد مغلوب ہو جاتا تھا اور ہمارے سب موترخ متفق ہیں کہ اس وقت بھی سادہ لوحی سے وہ اپنے خوشامدی مصاحبوں کے کہے میں آگیا تھا جس سے اوزنگ زیب کو آئندہ فساد کا اندیشہ پیدا ہوا اور اس کو مصلحت اسی میں نظر آئی کہ دھوت کے بہانے ایک روز اپنے خیمے میں بلا کر بھائی کو حراست میں لے لیا (شوال ۱۰۶۸ھ) اور پہلے دہلی اور پھر گوالیار کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ جیسا کہ خود اوزنگ زیب نے معذرت کی تھی، درحقیقت وہ عام دستور کے موافق، بھائی کی جان یعنی نہ چاہتا تھا بلکہ نظر بندی کا مدعا محض یہ تھا کہ آئندہ فساد و خانہ جنگی کا پیش از وقت تدارک کر دیا جائے۔ در نہ گوہ السیار میں

۱۔ اوزنگ زیب کی مصلحت پر آمادگی اور شاہجہاں کی اس کے خلاف سازش کے حالات ان مہذخوں نے جن کی نسبت اوزنگ زیب کی طرف داری کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ نہایت وضاحت کے ساتھ لکھے ہیں اور مولوی غنی صاحب نے بھی ”عالمگیر پر ایک نظر“ نامی رسالے میں اس پر بہت خوبی سے بحث کی ہے (صفحہ ۹۳ وغیرہ) مگر ابوجاد و ناقہ سرکار اگرچہ واقعات سے انکار نہیں کر کے تاہم کمال تعصب سے انہیں ایسی صورت میں پیش کرتے ہیں کہ دہلہ دوم باب ہفتم کہ خواہ مخواہ اوزنگ زیب کی نسبت بدگمانی پیدا ہو

۲۔ واقعات۔ ورق ۴۲ نیز دیکھو اثر صفحہ ۸۔

۳۔ واقعات۔ ورق ۴۴۔

آزادی کے سوا مراد بخش کے لیے ہر قسم کی آسائشیں فراہم کر دی گئی تھیں اور بعد میں بھی جب اس پر قتل کا دعویٰ کیا گیا تو اورنگ زیب بذاتہ غالباً خون بہا دے کر اس کی جان بچانی چاہتا تھا۔ لیکن مستغنیث (یعنی مقتول کا بیٹا) قصاص پر مصر تھا اور ثبوت جرم میں کوئی کسر نہ تھی۔ قاضی عدالت نے موت کا قتل دیا اور مراد بخش ۱۶۹۲ء میں اسی قلعہ گوالیار میں قتل کر دیا گیا۔

ب۔ عہد بادشاہی

مذکورہ بالا حالات کو ہم نے خلاف عادت زیادہ تفصیل و وضاحت سے بیان کیا کیونکہ آج کل اورنگ زیب کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں جدید انگریزی تاریخوں کو پڑھنے سے یقین ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ مجسم شیطان تھا جس کی

غلط بیانیوں اور ذاتی اوصاف

۱۔ اس قتل کے متعلق اکثر تاریخوں میں غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن ہم اصلی واقعات کو خود خانی خاں کی تاریخ سے افذ کر سکتے ہیں۔ اس مورخ کا باب مراد بخش کا خاص مہم علیہ اور ملازم تھا اور نظر بندی کے زمانے میں اس شہزادے کو قلعے سے ہٹا لے جانے کی جو کوشش کی گئی ان میں بھی شریک رہا۔ مختصر یہ کہ خانی خاں مراد بخش کی سرکار کا ننگ پر درودہ اور دل سے اس کا طرفدار اور اس شہزادے کے قید و قتل کے معاملے میں اورنگ زیب سے قدرے ہمت ناراض ہے۔ اسی کا یہ بیان ہے کہ علی نقی خاں کا (جسے مراد بخش نے گجرات میں بے گناہ مار ڈالا تھا) بڑا بیٹا قصاص کے دعوے سے دست بردار ہو گیا اور چھوٹے کے استغاثے پر قاضی نے سزائے قصاص تجویز کی۔ لیکن خود اورنگ زیب اس مستغنیث سے بعد میں ملاض رہا اور ”سچوں پسر کلاں از دعوی خون پدر ابا نمودہ بود“ بادشاہ قدردان (یعنی اورنگ زیب) از فرمودہ خدمات حضور دیگر عنایات متوجہ حال او شدند (مختب اللیاب جلد دوم صفحہ ۱۵۶) اس حقیقت کو زچھا سکنے کے باوجود اس مورخ کا یہ کہنا کہ قتل کا دعویٰ بھی اورنگ زیب کے اشارے سے ہوا، قابل یقین نظر نہیں آتا۔

باب

رگ میں ظلم و خو غزاری، کرو خود غرضی بھری ہوئی تھی اور خود ہم عصر فارسی تاریخوں سے اس یقین کی تائیدی شہادتیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہ فارسی تاریخیں جن کے کھنڈے والے بالعموم اور نگ زیب سے ناخوش ہیں، اس بارے میں متفق ہیں کہ یہ بادشاہ ذاتی طور پر نہایت سادگی پسند اور درویش مزاج آدمی تھا۔ ہر قسم کے لہو و لعب اور عیش و طرب سے اسے نفرت تھی۔ قیمتی لباس، عالیشان محلات، زرو جواہرات اور پر تکلف کھانوں کا اسے شوق نہ تھا۔ درباری شوکت و تجمل تزک و احتشام یا ایسے شامانہ مراسم جو بادشاہ کو معمولی انسانوں سے بلند و برتر بنادیتے ہیں، اسے ناپسند تھے۔ اپنی رعایا اور اولاد پر اس کی شفقت، ماتحتوں کے ساتھ اس کی مہربانی، ظلم و رعایت ضرب المثل تھی۔ عمر بھر اس نے کسی کے منہ پر سخت و ست لفظ نہیں کہا۔ بچے بیمار ہوئے تو بعض دفعہ ان کی تیمارداری میں کئی کئی دن ان کے ساتھ بیٹھ کر خود پرہیزی کھانا کھایا۔ لڑکپن سے اس کے تقویٰ اور دینداری میں کسی کو حرف رکھنے کی گنجائش نہیں ہوئی۔ بادشاہ ہو کر اس نے پورا قرآن مجید حفظ کیا اور اکثر اوقات دہراتا رہتا تھا۔ اکثر راتیں عبادت و یاد الہی میں اور دن نقلی روزہ رکھ کر گزار دیئے اور یہ اعمال حسنہ محض تقلید و ضعیف الاعتقادی پر مبنی نہ تھے کیونکہ اورنگ زیب علوم عقلی و نقلی کا نہایت فاضل و ذہین طالب علم تھا اور اس کی علمی مونٹنگائیوں کے بعض دلچسپ قصے اب تک مشہور ہیں، اسی کے ساتھ معاملات سلطنت سے اس کو حیرت انگیز واقفیت تھی۔ ملکی اور فوجی آئین و انتظام کی جزئیات تک سے وہ آگاہ تھا اور ایک ایک قصبے کے ”اخبار“ خود مطالعہ کرتا اور تمام حالات کی خبر رکھتا تھا۔ سیاسی تدبیر اور انتظامی قابلیت کے ساتھ وہ فن حرب کا مانا ہوا ماہر ہے۔ اور چھوڑے برس کی عمر سے، جب اس نے مست ہاتھی کا مقابلہ کیا، اس کی ذاتی شجاعت کی ملک میں دھاک بیٹھ گئی تھی۔ مگر اس جگہ خاص طور پر جتانے کی بات یہ ہے کہ اس کی شجاعت اور کسی جانباز سپاہی کے جوش تہور و دلاوری میں ایک نمایاں فرق تھا۔ وہ یہ کہ اورنگ زیب محض شوق بہادری یا کسی سپاہیانہ آن بان کی خاطر پاؤقتی ہیجان و اشتعال میں جان سے بے پروا نہ ہو جاتا تھا بلکہ وحیقت اسے

بذاتِ رہاں کی کوئی خاص محبت اور خدا کے سوائے کسی شے کی دہشت نہ تھی۔ وہ زندگی کو محض خدا کی امانت سمجھتا تھا اور اسی لیے ہم جا بجا پڑھتے ہیں کہ عین جنگ میں نماز کا وقت آگیا تو وہ اپنی سواری سے اتر پڑا اور ”کمال حضور و جمعیت قلب“ کے ساتھ نماز ادا کی۔ ”و در آں حالت اگر جہان و جہانیاں بہم برآیند در جمعیت قلب و آرام باطن اشرف خلل و فتور نمی رود۔ و بار بار در مواقف صحب این صورت از آں خدیو صورت و معنی رخ نموده و دوست و دشمن آں را معائنہ کردہ اند و بالجملہ بروفق۔“

”هٰنِ اسْتَأْنَسَ بِاللّٰهِ لَمْ يَسْتَوْحِشْ مِنْ عِلَّا اللّٰهَ“

جواہر دو توانا و خالق بے ہمتا (غزوہ جل) ترس و بیم و خوف و ہراس از هیچ چیز و ہتھیار در ذات اقدس نیست۔
ان تمام مسئلہ صفات و عاداتِ اہل کو پیش نظر رکھنے کے بعد بھی اگر کہا جائے کہ اورنگ زیب کی یہ ساری درویشانہ طرز زندگی اور زہد و عبادات محض ریاکاری سے تھیں، تو شاید خلوص و صداقت کا پھر کوئی معیار باقی نہ رہے گا۔ دوسرے یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کے راسخ العقیدہ، ذی علم و سنجیدہ (سنی) مسلمان اورنگ زیب کو اول سے بہترین مسلمان بادشاہ مانتے ہیں اور ان کی رائے کے مقابلے میں مغربی مصنفوں کی رائے جو ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے بہت کم واقف اور اسلام اور مسلمانوں سے بالعموم تعصب رکھتے ہیں، تاریخی اعتبار سے

۱۵۔ اورنگ زیب کے مذکورہ اوصاف کی اس قدر تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ گوان کے بیان کرنے میں فارسی انشا پردازوں نے حسب عادت مبالغہ شاعرانہ سے کام لیا ہو لیکن ان کی اصلیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مثال کے لیے ملاحظہ ہو عالمگیر نامہ صفحہ ۱۰۰۔ الخ آثار عالمگیری ۲۵ تا ۵۳۳۔ واقعات عالمگیری درق ۲۰۱۔ منتخب السلاطین صفحہ ۲۰۵ و ۵۵۰ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن پول صاحب نے اپنے تاریخِ خافسانے ”اورنگ زیب“ میں ان اوصاف پر بحث کی ہے (باب سوم دہارم) اور بابو جادوناٹھ سرکار کو بھی ان سے انکار کرتے نہیں پڑی (تاریخ اورنگ زیب، مقدمہ جلد اول صفحہ ۱۵)۔

ب۔

کوئی وزن نہیں رکھتیں، نظر برائیں ہمیں اور رنگ زیب کے حالات کو مطالعہ کرتے وقت یہ نکتہ دلنشیں رکھنا چاہئے کہ اس بادشاہ کی زندگی درحقیقت اسلامی لائبرٹ کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی اور اس کا حصول سلطنت کے لیے جدوجہد کرنا بھی محض حفاظت خود اختیاری کے واسطے نہ تھا بلکہ جیسا کہ خود وہ اپنے خطوں میں جا بجا اشارہ کرتا ہے۔ اس کی تہ میں اسلام کی خدمت کا جوش تھا جسے وہ اپنی زندگی کا سب سے مقدس فرض اور خدا کی عین عبادت سمجھتا تھا۔

توضیح

سموگرہہ کی فتح کے بعد اسے سلطنت کی خاطر اپنے بڑے بھائیوں سے دو لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ پہلی شجاع سے، جو اورنگ زیب سے معاہدہ صلح کرنے کے باوجود شہار سے فوج کے کرچلا اور دارا کے ملازمین قلعہ داروں کی مدد سے دو آب کے علاقے میں پہنچ گیا تھا۔ اسے خیال تھا کہ اورنگ زیب دارا شکوہ کے تعاقب کی وجہ سے پنجاب و ملتان سے واپس نہ آ سکے گا کہ میں اگر بے پہنچ جاؤں گا۔ لیکن اس کی سہولت پسندی اور آہستہ خرامی کے مقابلے میں اورنگ زیب دودو منزلیں طے کرتا ہوا اتنا تیز بڑھا کہ ابھی شجاع نے موجودہ فتح پور سے کوئی کچیں میل ہی مسافت طے کی ہوگی کہ عالمگیری ہراول نے ایک منزل آگے آکرے کی شجاع عام روک لی اور چند روز بعد جب خود اورنگ زیب وہاں آیا تو اسی نواح میں وہ جنگ ہوئی جو کچھوایا کچھوایہ کے گاؤں سے منسوب ہے۔ (ربیع الثانی ۱۰۶۹ھ مطابق ۱۶۵۹ء) شجاع کو سخت ہزیمت ہوئی اور اس کے فرار ہونے کے بعد اورنگ زیب کے سرداروں نے اس کا بنگلے کے مشرقی سرے تک پیچھا چھڑا حتیٰ کہ وہ ملک اراکان کی غیر آباد پہاڑیوں میں بھاگ کر مفقود انحر ہو گیا۔

دارا شکوہ جسے ایسے بلائے بے درماں حریف کے مقابلے میں کہیں حجم کر لڑنے کی جرأت نہ ہوئی تھی، گجرات دوسطی راجپوتانے کے امر کی مدد سے حمیر آگیا تھا اور یہیں اس نے اورنگ زیب سے دوبارہ مدافعت جنگ کی۔ لیکن

مورچوں پر چند حملوں کے بعد پھر اس کی ہمت نے جواب دیدیا اور وہ سندھ کے راستے فرار ہو کر ایران جانا چاہتا تھا کہ ایک بلوچی رئیس ملک جیوں نے اسے اور اس کے بیٹے سپہر شکوہ کو گرفتار کر لیا (رمضان ۱۰۶۹ھ) اور دو مہینے بعد جب وہ دہلی لائے گئے تو دارا کو شورش و فساد کے ساتھ ”کفر و الحاد کا فتویٰ لے کر قتل کر دیا گیا (ذو حجہ) اور سپہر شکوہ کی زندگی کے باقی دن گوالیار کے شاہی بندی خانے میں بسر ہوئے۔“

اسی سال اجیر کی فتح کے بعد فاتح کا جشن تاجپوشی دہلی میں منعقد ہوا اور ”شاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر“ کے لقب سے خطبہ و سکہ جاری کیا گیا اگرچہ اس کی بادشاہی کو مورخ سال گزشتہ یعنی ۱۰۶۸ھ مطابق ۱۶۵۸ء ہی سے شروع کرتے ہیں۔

اس بادشاہ کا طریق نظم و نسق اور ملکی اصلاحات و آئین بھی ایک مذہبی نوعیت رکھتے ہیں، جشن تاجپوشی ہی کے زمرے میں اس نے جہاں متعدد دیگر شرعی محاصل منسوخ کئے وہیں ایک محکمہ احتساب بھی قائم کیا کہ مسلمانوں کی معاشرت میں جو فواحش و بدعات عام طور پر داخل ہو گئے تھے، ان کا سد باب کیا جائے۔ منسوخ کردہ محاصل کی تعداد اسی کے قریب تھی لیکن غالباً ان میں سے بعض ہنگامی طور پر محض قحط سالی کی وجہ سے موقوف کئے گئے تھے بایں ہمہ جن کی منسوخی مستقلاً عمل میں آئی ان کی آمدنی تیس لاکھ روپے سالانہ کے قریب تھی اور ان میں رابداری، پانداری، (جسے آج کل ”نزدول“ کہتے ہیں) غلے اور کپڑے وغیرہ مختلف اجناس کے محاصل، جن میں تبا کو کا محصول سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا، نیز محصول درآمد قابل ذکر ہیں۔

آمدنی کی ایک مدوہ نذریں اور تحائف تھے جو امر سالانہ درباروں اور

مختلف
اصلاحات

۱۔ عالمگیر نامہ صفحہ ۱۰۸۲۔ ۲۔ آثار ۲۵۴ و ۲۵۵۔ ۳۔ ان متبر تحریروں کا خانی خاں کے اقوال سے (جلد دوم صفحہ ۲۵۴) مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مورخ مستقل منسوخ اور ہنگامی منسوخ میں فرق نہیں کرتا اور اس نے سب کو گنہ مذکور دیا ہے۔

بپ

جشنوں کے موقع پر حضور میں گزرتے تھے۔ اور اس رسم نے رفتہ رفتہ انھیں بھی ایک باقاعدہ محصول بنا دیا تھا جسے نقد وصول نہ ہونے کی صورت میں مقررہ نرخہ میں سے وضع کر لیا جاتا تھا مگر اس رسم کا سب سے بدتر پہلو یہ ہے کہ یہ امر جس طرح خود بادشاہ کو نذریں دیتے تھے اسی طرح اپنے اپنے مقام پر اپنے ماتحتوں زمینداروں اور غریب رعایا سے خود وصول کرتے تھے اور اس میں یقیناً بعض اوقات بڑی سختیاں اور نا انصافیاں ہوتی ہونگی۔ اورنگ زیب نے اس رسم کو بالکل اڑا دیا اور جن امر پر پہلے سے رقوم واجب الادا تھیں انھیں بھی ایک قلم معاف کر دیا۔

سب سے زیادہ دشواری بادشاہ کو دربار کی اندرونی اصلاح کے معاملے میں پیش آئی۔ مغلوں کی نسلی بادشاہ پرستی نے ہندوستان کی آب و ہوا میں پھوٹا ہوا اور یہ دولت و حکومت حاصل کر کے واقعی دربار شاہی کو ”پر تکلف بتکدہ“ بنا لیا تھا اور اس کی آرائش و تکلفات، عیش و طرب کے سامان دیکھ کر ساسانی و رباروں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ اورنگ زیب نے بہت سی رسمیں اور غیر اسلامی بدعات حکماً روک دیں۔ بادشاہ کے سامنے ”سری ٹیک“ یا زمین ہوس کی بجائے محض ”سلام علیک“ کہنا کافی قرار دیا۔ درشن کی رسم موقوف ہوئی مصوری اور موسیقی کے ساتھ شاعری حتیٰ کہ وہ شاعرانہ تالیف نویسی بھی جو ابوالفضل کے زمانے سے نثر میں بادشاہوں کی قصیدہ خوانی اور مداحی کا آلہ بن گئی تھی رخصت کر دی گئی اور بادشاہ کے اس انحسار نے ہمیں بھی تاریخ کے ایک عمدہ ماخذ سے محروم کر دیا!

انگزار

قوانین مالگزاری میں اصولاً اور عملاً اورنگ زیب نے بہت سی مفید اصلاحیں کیں۔ اور اس کا ”دستور العمل“ اب تک مشہور و محفوظ ہے بادشاہ اور بادشاہی دیوان کی نگرانی بڑھانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر خائن عمال کی رشوتیں اور چوریاں پکڑی گئیں اور وہ صد ہا کی تعداد میں برطرف کئے گئے۔ جیسا کہ علامہ شبلی نے جتایا ہے یہ زیادہ تر کاچھ (کالیستا) قوم کے لوگ تھے اور ان کا تغلب شمالی ہند میں اس قدر مشہور تھا کہ اورنگ زیب نے آخر میں یہ اصول مقرر کر دیا تھا کہ آئندہ سے دفتر دیوانی کے آدمے پیشکار ہندو اور آدھے

مسلمان ہوں، اورنگ زیب پر اس بے بنیاد اتہام کی کہ اس نے تمام ہندو عہدہ داروں کو محض نقص مذہبی کی بنا پر موقوف کر دیا تھا، فقط اتنی اہلیت ہے اور یہ بھی محض ایک اصول تھا جس پر کسی خاص اتہام و شدت کے ساتھ کبھی عمل نہیں ہوا۔

عہد اورنگ زیب کی کل مالگزاری کے متعلق اہل تاریخ میں اختلاف ہے لیکن نین پول نے کافی تحقیق و تفصیل سے اس بارے میں بحث کر کے جو نتائج نکالے ہیں، وہ اگر بالکل صحیح نہیں تو قرین صحت ضرور ہیں۔ اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اکبر کے آخری عہد میں سلطنت کی کل مالگزاری کچھ کم دو کروڑ پونڈ تھی۔ شاہجہاں کے آخری سال حکومت میں یہ مقدار تین کروڑ پونڈ اور اورنگ زیب کے آخری زمانے کے قریب چار کروڑ پینتیس لاکھ پونڈ سے کچھ زیادہ ہو گئی جس کے قدیم اکبری روپے کے حساب سے کوئی ساڑھے چالیس کروڑ روپے ہوئے۔ اس مناسبات اضافے کی سب سے بڑی وجہ تودکن کی فتوحات اور بیجا پور و گولکنڈہ کا احاطہ ہے۔ لیکن خوبی انتظام کے ساتھ بعض اور اقتصادي اسباب کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے اول تو یہ کہ اس ایک صدی میں ہندوستان کی حرفہ الحال آبادی کم و بیش گنی ہو گئی ہوگی۔ اور اسی نسبت سے فزوعہ رقبے میں اضافہ ہوا ہوگا۔ اگرچہ یہ ظاہر ہے نئی زمینیں ان اراضی کے برابر حاصل نہیں ہوئی جنہیں آبادکاروں نے پہلے سے انتخاب کر لیا تھا، دوسرے اتنی مدت تک ایک خاندان کی مستقل و نظم حکومت نے لازمی طور پر سکڑ رائج الوقت میں کثرت پیدا کر دی ہوگی جس کے سبب سے اجناس میں قدرے گرائی کا ہونا اور اسی مناسبت سے روپے کی قوت خرید کا گھٹ جانا لازمی ہے۔ پس قرینہ کہنا ہے کہ اسی پیداوار پر جس کی پہلے بازار میں

۱۵۔ دیکھئے منتخب الباب۔ جلد دوم صفحہ ۲۵۲۔ مولوی شبلی صاحب مرحوم نے اس بارے میں مفصل بحث کے بعد ایک طویل فہرست خاص اورنگ زیب کے بڑے بڑے ہندو عہدہ داروں کی درج کی ہے (دعا لیکر پر ایک نظر ۷۸ تا ۷۲) جو مذکورہ بالا اتہام کی صریح و سکت تردید ہے۔
۱۶۔ اورنگ زیب، باب ہفتم۔

۳

قیمت کم اور اس لیے شرح مالگزاری بھی کم تھی، اب سرکاری محصول ایک حد تک بڑھا دیا گیا ہوگا۔

دیکھو محل
اور جزئیہ

غرض بظاہر یہی اسباب ہیں جنہوں نے اورنگ زیب کے زمانے میں صرف زرعی مالگزاری کو عہد اکبری کی نسبت دو چند سے بھی زیادہ کر دیا تھا۔ ورنہ طبعاً و اصولاً وہ رعایا کے ساتھ تا امکان رعایت و فیاضی کا برتاؤ کرتا تھا اور ماتحت عہدہ داروں پر اس قسم کی تاکید و تنبیہ کی بہت سی مثالیں ہم عصر تواریخ اور اس کے رقعات و خطوط میں محفوظ ہیں۔ البتہ غیر شرعی محاصل کو منسوخ کرنے اور نیز بہت سی اندرونی اصلاحات کے بعد جب نظم و نسق اسلامی قوانین حکومت کے مطابق ہو گیا تو اس نے مسلمانوں سے زکوٰۃ فرضی کی وصول یا بی کی طرح غیر مسلموں پر جزیہ عاید کیا (۹۹۱ھ) جو اکبر کے زمانے سے موقوف تھا۔ اس محصول سے ہر قسم کے سرکاری ملازمین محتاج و غیر پیشہ ور (ہندو) نیز بعض مذہبی اور غیر ملکی لوگ مستثنیٰ تھے۔ اور اس کی شرح صرف $\frac{1}{3}$ روپے سے $\frac{1}{4}$ روپے سالانہ تک تھی جو حسب حیثیت ہر غیر مسلم مرد (بالغ) کو ادا کرنی پڑتی تھی۔ بالفاظ دیگر دولتمند سے دولتمند ذمہ کو زیادہ سے زیادہ سے صرف ایک روپیہ اور دو آنے ہمینہ سرکار کو ادا کرنا پڑتا تھا اور معمولی درجے کے لوگوں سے فقط چند آنے (ماہوار) وصول کئے جاتے تھے جس کے معاوضے میں فوجی خدمت سے مستثنیٰ کر کے حکومت ان کی حفاظت جان و مال کا ذمہ لیتی اور اسلامی قواعد کے مطابق مذہبی آزادی دیتی تھی۔

۱۵۔ دیکھو سرکار کی تاریخ اورنگ زیب جلد سوم صفحہ ۳۰۵ و ۳۰۶ وغیرہ۔ نیز لیں پول کی کتاب اورنگ زیب صفحہ ۱۱۱۔ یہی وہ محصول ہے جس کے اجرا و تجدید پر اورنگ زیب کو آج کل مدد ملو ات میں ملانی جاتی ہیں اور اس جو ش تعصب میں اس بات کو بھی یہ محقق بھول جاتے ہیں کہ اس نے بہت سے محاصل معاف کر دیے تھے!

۱۶۔ اورنگ زیب کے مذہبی تعصبات اور جو ش برت شکنی کے متعلق انگریزی تاریخوں میں عجیب عجیب افسانے شائع کر دیے گئے ہیں اور بعض ہندوستانی اہل الرائے اس افترا پردازی کو سیاسی مصالح پر

بائبل
بعض
اندرونی
خوشیں

اورنگ زیب کے طویل اور قریبی عہد حکومت کی خاصی مفصل تاریخیں موجود ہیں، اور چونکہ یہ مورخ خاص درباری یا بادشاہ کے مقرب اور اعلیٰ عہدہ دار نہیں ہیں اس لیے ان میں آج کل کے اخبارات کی طرح بعض عام جزئی اور ملکی خبریں بھی تحریر ہیں جن سے اس عہد کے ہندوستان اور اسن و انتظام کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن ہمیں ان مورخوں کے پیرائے بیان سے دھوکا نہ کھانا چھوٹے اور نہایت احتیاط سے اصلی واقعات کو مورخ کے ذاتی جذبات و آرا کے خلاف سے باہر لانے کی کوشش کرنی چاہئے ورنہ سخت مغالطہ ہوگا۔ مثلاً اورنگ زیب و شاہجہاں

بہتیمہ حاشہ صفحہ گزشتہ یعنی سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے الزامات کا سووی شیلی صاحب نے اپنے رسالے ”اورنگ زیب پر ایک نظر“ میں محققانہ رد لکھا ہے۔ ہماری کتاب میں اس بحث کو چھیڑنے کا موقع نہیں مگر مختصر طور پر اتنا لکھنا مناسب ہوگا کہ اورنگ زیب ایک عالم باعمل مسلمان تھا اور اس معاملے میں بھی اس کا طرز عمل اسلامی تعلیم کے مطابق تھا۔ اس تعلیم کے بارے میں ہم گزشتہ اوراق میں اجمالاً بیان کر چکے ہیں کہ مضحکہ انگیز الزام محض نادانیت یا مراسرور و غوی ہے کہ اسلام غیر ملوں کو جبراً مسلمان بنانے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے برعکس، اسلامی حکومت اگرچہ بت پرستی کی علانیہ تبلیغ و ترویج کو جائز نہیں رکھتی۔ لیکن اسن و صلح کے بعد ہرگز اپنی رعایا کے معتقدات سے تعرض نہیں کرتی اور انہیں اپنے گھروں میں یا پہلے سے جو معبد موجود ہیں ان میں جس طرح وہ چاہیں عبادت و پرستش کی بالکل آزادی دیتی ہے۔ ٹھیک یہی احکام اورنگ زیب کے اس مشہور فرمان میں درج ہیں جو اس نے بنارس کے حاکم کے نام بھیجا تھا اور وہاں کے ہجاری برہمنوں کے قدیم حقوق و آزادی کو بحال رکھنے کی تاکید کی تھی؛ اس فرمان کی عکسی تصویر چند سال ہوئے کامریڈ کے لائق ڈیڑنے شائع کی تھی۔ اس کے انگریزی ترجمے کا اقتباس بابو جادونا تھہرکار نے بھی اپنی تاریخ اورنگ زیب میں نقل کیا ہے (جلد سوم صفحہ ۳۱۹) البتہ یہ بالکل صحیح ہے کہ حالت جنگ میں اس قسم کی مذہبی دل آزاریوں کی کہیں کہیں مثالیں محفوظ ہیں۔ زیر نظر عہد میں بھی راجپوتانے یا دکن کی لڑائیوں میں اکثر اچھے ہندو حریفوں کی اسی قسم کی زیادتیوں کے جواب میں مند توڑے گئے اور اگر کسی علاقے میں مسلمانوں کی قلت آبادی کی وجہ سے ان کی دو چار مسجدیں منہدم ہوئی تھیں تو اس کے بدلے میں عرف و دہاں کے بہت سے مند مسلمانوں کے جوش انتقام کی نذر ہوئے۔

۳

نیز جہانگیر کے مہد حکومت کی تاریخوں میں ہم جا بجا ایسی مقامی شورشوں اور ہنگاموں کا حال پڑھتے ہیں جن کے بیان کرنے میں تاریخ لکھنے والوں نے ورق کے ورق سیاہ کر دیئے ہیں حالانکہ ان کی وقعت ایسے ہنگاموں سے کچھ زیادہ نہ تھی جیسے کہ آج کل کسی عید یا محرم کی لڑائی یا سیاسی شور و شغب اور ہڑتال کی صورت میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ یہ فرق ضرور ہے کہ ان دنوں اہل ہند عام طور پر اسلحہ رکھتے اور ان کا استعمال جانتے تھے اور اس زمانے کی نسبت زیادہ جنگجو اور باغیرت تھے۔ ان کے خاندانوں یا برادریوں میں بھی بہت اتحاد اور پیوستگی تھی لہذا کسی معمولی غلط فہمی یا جھوٹی سی بات پر ایسے جھگڑے جن کا آج کل نتیجہ فوجداری تاش ہوا کرتا ہے، ان دنوں زیادہ نکلین معاملے بن جاتے تھے۔ چنانچہ تمہارے جاتوں (۱۶۱۶ء) نارنول کے ستنامیوں (۱۶۱۶ء) اور برہانپور کے تغزیلے نکالنے والوں کے ہنگامے اسی قسم کے تھے جن میں بعض اوقات مقامی پولس یا ضلع کی متعینہ جمعیت سے کام نہ چل سکا اور دوسرے شہروں سے فوج بھیج کر انھیں فرو کیا گیا، البتہ سرحد کابل کے افغانوں اور میواڑ و ماڑ و وار کے راجپوتوں کی بغاوتیں ان سے مختلف نوعیت رکھتی ہیں اور ان کے فرو کرنے کے واسطے خود شہنشاہ کو مقام شورش کے قریب رہ کر چند روز تک خود نگرانی رکھنی پڑی۔ واضح رہے کہ یہ دونوں قومیں آزادی پسند، جنگجو اور سپاہی پیشہ تھیں۔ ان کے ملک دغوار گزار تھے اور بالخصوص افغانی قبائل اکبر کے زمانے سے اب تک برابر اپنی خود مختاری کے لیے لڑتے اور کبھی کبھی شاہی علاقوں پر بھی ہاتھ مار جاتے تھے چنانچہ ان کی اس شور و شبہی میں آج تک کوئی نایاں تغیر نہیں ہوا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ان کی یہ خصوصیات خود اس ملک کی معاشرت اور آب و ہوا کا نتیجہ ہیں اور بغاوت ہر جب تک یہ قدرتی اسباب نہ ہد لیں گے ان کی جو خصلت بھی نہ بدلے گی۔ ہاں ہمہ اور نگ زیب جیسے مستقل مزاج و منظم فرماں روا کے مقابلے میں ان کی شورش کچھ زیادہ وسعت و پائنداری نہ حاصل کر سکی اور اس نے حسن ابدال میں خود پہنچ کر (۱۶۱۶ء) جا بجا ایسی فوجی چوکیاں اور ٹھکانے قائم کئے کہ پھر مدت دراز تک ان قبائل کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ بادشاہی سردار

افغان و راجپوت

آغز خاں نے انھیں گھیر گھیر کر اس بڑی طرح مارا تھا کہ مشہور ہے کہ مدتوں تک افغان عورتیں بچوں کو اس کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔

راجپوتانے کی شورش اس سے چند سال بعد کا قضیہ ہے جسے انگریزی تاریخوں میں مفتاحہ انگریز مبالغوں کے ساتھ ہندو مسلمانوں کی ایک مذہبی لڑائی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ معمولی غلط فہمیوں کی بنا پر پیدا ہوئی اور حسب دستور سال دو سال کی جنگ و جدال کے بعد فرد ہو گئی، شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ ۱۱۹۷ھ کے اواخر میں مارواڑ (جو دھپور) کے راجہ جسونت سنگھ نے کابل میں وفات پائی۔ اور اس خبر نے اس کی ریاست (مارواڑ) میں تلامذہ ڈال دیا۔ چونکہ وفات کے وقت اس کا کوئی بیٹا یا جانشین نہ تھا، لہذا معلوم ہوتا ہے اب ہر راجپوت رئیس اس کی جگہ لینے کا مدعی اور ایک ہندو مورخ کے الفاظ میں حصول اقتدار کی خاطر دو شورش و فساد بپا کرنے پر آمادہ تھا،، نظر بریں اورنگ زیب نے جانشینی کا فیصلہ ہونے تک بعض شاہی عہدہ داروں کو جو دھپور بھیجا کہ ان مفسدوں کو قابو میں رکھیں اور کچھ روز بعد (ربیع الآخر ۱۱۹۷ھ) جسونت سنگھ کے جیتے اندر سنگھ کو خطاب راجگی و خلعت خاصہ و شمشیر با ساز مرصع..... و علم و طوغ و نقارہ..... دیکر مارواڑ روانہ کیا۔

اس اثنا میں جسونت سنگھ کے ماتحت سردار اس کی فوج اور اہل خاندان کو لے کر بادشاہی اجازت کے بغیر کابل سے چل دیے اور دریائے سندھ پر ان سے پروانہ عبور مانگا گیا تو لڑکر زبردستی پار ہو گئے تھے۔ پھر اسی زمانے میں معلوم ہوا کہ متوفی راجہ کی دو رانیاں حاملہ ہیں اور ابھور پہنچ کر ان کے دو بیٹے ہوئے،

۱۔ مہاراجہ سوم صفحہ ۲۷۲ بحوالہ ایشور داس

۲۔ آثار عالمگیری صفحہ ۷۶، یہ مسئلہ واقعات ہیں لیکن بابو جادو ناتھ سرکار نے انھی کو حیرت انگیز طریق پر مسخ کیا ہے اور بعض مقامات پر معلوم ہوتا ہے تعصب ذاتی کی رو میں ابو صاحب منانت و عقل کی حدود سے باہر نکل گئے ہیں۔

باری

اور وہاں سے یہ قافلہ دہلی پہنچا۔ اب راجپوت سردار جن میں سب سے پر جوش و فتنہ انگریز درگاہ داس (یا درگ داس) راٹھور تھا، اصرار کر رہے تھے کہ ان میں سے کسی بچے کو جو دھپور کا راجہ تسلیم کر لیا جائے اور بادشاہ جوان کی نائنہ احکامات سے ناخوش تھا، ایسے چھوٹے بچوں کو راجہ بنانے میں قدرۃً متاثر تھا جس کے معنی یہ ہوتے کہ درحقیقت درگاہ داس اور اس کے شورہ پشت ساتھیوں کے ہاتھ میں ریاست کی باگ آجائے۔ باری ہمہ اس نے حکم دیا کہ دستور کے مطابق یہ بچہ شاہی نگرانی میں پرورش و تربیت کئے جائیں اور جب دو برس تک خوارہند رسید بہ عنایت منصب دراج نواز شخوہند یافت۔ لیکن اس فیصلے نے درگاہ داس وغیرہ کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور اب وہ محض سرکشی اور خود غرضی سے اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ ایک بچے کو (دوسرا غنی دنوں میں مر گیا تھا) جس طرح بننے لے کر جو دھپور فرار ہو جائے اس سازش کی خبر سن کر ان کی قیام گاہ پر پہرہ قائم کر دیا گیا تھا لیکن اہل سازش نے رانیوں کو جو ساتھ نہ چلیں یا نہ چل سکتی تھیں بید روی سے قتل کر ڈالا اور بچے کو لے کر جس طرح ہو سکا فرار ہو گئے، تاثر عالمگیری کی روایت یہ ہے کہ وہ اصلی بچہ نہ لے جاسکے تھے بلکہ جو دھپور پہنچ کر انھوں نے ایک اور بچے کو پیش کیا کہ جو نت ننگہ کا بیٹا اور اس کے راج کا اصلی وارث یہ ہے۔

اب درگاہ داس حکومت سے علانیہ منحرف تھا۔ (۱۱۹۷ھ) بہت سے راجپوت سپاہی جنھیں معمولی تحریک جوش دلانے اور لڑا دینے کے لیے کافی تھی اس کے ساتھ ہو گئے تھے اور جب مارواڑ میں انھیں پیہم شکستیں ہوئیں تو مہارانا اودے پوران کا حامی و مددگار بن گیا اور اسی ضمن میں اس نے جزیہ کے جدید مطالبے کو ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ یہی واقعہ ہے جس کی بنا پر انگریزی "محققین" نے اسے ایک مذہبی جنگ بنا دیا ہے خاص کر ٹاؤن نے تو اس جوش و خروش سے اس جنگ کے افسانے لکھے ہیں گویا یہ خود اس کی قوم کی صلیبی لڑائیاں تھیں!

مگر افسوس ہے کہ ایک ہی واقعہ اس تمام طلسم خیالی کو باطل کرنے کے لیے کافی ہے اور وہ یہ کہ بغاوت کے سب سے بڑے سرغنہ یعنی درگاداس اور مہارانا اودے پور چند ہی ماہ کی لڑائیوں کے بعد شہزادہ اکبر سے ساز باز کرنے لگے اور اپنے باپ سے انحراف کرنے کی شرط پر انہوں نے کمال گرجویشی کے ساتھ اس کی اطاعت کا پختہ عہد و پیمان کیا کہ جب تک جان میں جان ہے تمہارے (یعنی شہزادہ اکبر کے) حلقہ بگوش و فرماں بردار رہیں گے اور سلطنت حاصل کرنے کے لیے تمہاری طرف سے حریفوں سے جنگ کریں گے۔ یہ الفاظ دیگر یہ مسلمانوں سے مذہبی لڑائی نہ تھی بلکہ محض بغاوت کی سزا سے بچنے کے لیے، حکومت وقت کو بدلنے کی کوشش تھی جس سے لڑائی چھیڑنے کا سبب بھی خود انہی کی سرکشی اور ہوس حکومت کو سمجھنا چاہیے۔

نوجوان اکبر اور نگ زیب کا سمجھلا بیٹا اور باغی راجپوتوں کے استیصال کے لیے جو ہم روانہ کی گئی اس کا سپہ سالار تھا لیکن جب میواڑ میں اسے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی اور کسی قدر معتبوب ہو کر وہ مارواڑ کے علاقے میں متعین کیا گیا تو یہاں اس نے درگاداس وغیرہ کے اغوا اور سلطنت کے لالچ میں باپ سے بغاوت کی اور اپنی بادشاہی کا اعلان کر کے خود اور نگ زیب کے خلاف بڑھا جو ان دنوں اجمیر میں مقیم تھا (۱۵۹۱ء) بادشاہ کے پاس بہت کم فوج تھی اور اکبر کی بغاوت نے رفقاء شاہی میں سخت انتشار ڈال دیا تھا لیکن اور نگ زیب ان سب مشکلات پر غالب آیا اور باغی شہزادے نے شکست کھائی۔ پھر وہ دو سال تک راجپوتانہ اور دکن میں منہ چھپاتا پھرا اور آخر ایران کے علاقے میں فرار ہو گیا (۱۵۹۲ء) اور وہیں وفات پائی۔

باغی راجپوتوں کو چند مہینے کی مزید جنگ و جدال نے مایوس و مجبور کر دیا

۱۲

مارواڑ کے علاقے پر جا بجا شاہی دستے قابض ہو گئے اور آخر میں اودے پور کے مہارانا نے بھی کمال ندامت و لجاجت کے ساتھ معافی مانگی اور محصول جزیہ کو نقد ادا کرنے کے عوض اپنے دو پرگنے بادشاہی حکام کے حوالے کر دیئے۔ (جمادی الآخر ۱۰۹۲ھ) غرض یہ شورش و بغاوت دو سال کے اندر فرو ہو گئی، اور آئندہ نہ صرف یہ کہ راجپوتانے میں کوئی قابل ذکر شورش و فساد نہ برپا ہوا بلکہ بہت سے راجپوت سردار و سپاہی اپنی پہلی سی اطاعت و سرفروخی کے ساتھ اورنگ زیب کے محاربات دکن میں اس کے ماتحت لڑتے اور بادشاہی انعام و اکرام حاصل کرتے رہے۔

شہزادہ اکبر نے اول دکن میں مہنصاجی کی پناہ دلی اور دکن کی اسلامی ریاستوں سے بھی ساز باز میں مصروف تھا۔ یوں بھی دکن کے معاملات بہت دن سے الجھے ہوئے تھے۔ سرحدی تنازع پیش کش سالانہ کے ادا کرنے میں لیت و لعل اور اسی قسم کے دیگر معمولی اسباب مخاصمت کے علاوہ پونا میں ساہو جی بھونسلہ کے مشہور فرزند سیواجی کی نوخیز قوت نے سیاسیات دکن میں

۱۔ آثار مالگیری - صفحہ ۲۰۸ وغیرہ نیز دیکھو سرکار (جو منع کرنے کے باوجود مسئلہ واقعات سے ٹاؤ کی طرح نکال نہیں کر سکا) جلد سوم صفحہ ۲۲۱۔

۲۔ مولوی شبلی صاحب مرحوم نے اورنگ زیب کے جن ہندو سرداروں کی فہرست اور مختلف کیفیت اپنے رسالے میں درج کی ہے (صفحہ ۷۰) ان میں سب سے اوپر اودے پور کے رانا کے بیٹے راجہ بھیکم سنگھ کا نام ہے جو مرتے دم (یعنی سن ۱۱۱۰ھ) تک دکن کی لڑائیوں میں شریک رہا اور پھر پوری کے منصب تک ترقی کی (آثار مالگیری صفحہ ۲۶۹ وغیرہ) اسی طرح اودے پور ہی کے اور کسی راجا کیوں کے ملازمت شاہی میں کارگزاری دکھانے اور ترقی پانے کا ذکر آتا ہے۔ لیکن ان صریح شواہد وہ واقعات کے باوجود دوسرے اگرمز مورخوں کا تو کیا ذکر ہے بالخصوص سرکار صاحب تک کمال دیدہ دلیری سے غصہ یہ کرتے ہیں (جلد سوم ۴۲۵) کہ باڑا، کچھوا، اور متدی قوم کے راجپوتوں کے سوا اور کسی راجپوت سردار نے مذکورہ بالا جنگ کے بعد اورنگ زیب کی رفاقت نہیں کی!

مزید پیچیدگیاں ڈال دی تھیں اور ان سب تفتیشوں کے انفصال کی بہترین صورت یہی تھی کہ خود بادشاہ نے راجپوتانے کی شورش رفع دفع ہونے کے بعد، ادھر کا رخ کیا اور کچھ عرصے براہِ پُور ٹھہر کر ۱۰۹۳ھ کے اواخر میں اورنگ آباد پہنچ گیا۔

اورنگ زیب کو دکن کے معاملات سے نہایت عمدہ واقفیت تھی اور جوانی کا اکثر حصہ یہاں گزارنے کی وجہ سے اس کو بالخصوص اپنے آباد کردہ شہر (اورنگ آباد) سے بہت انس ہو گیا تھا۔ کشور کشائی کے موروثی جذبات اور عہد اکبری سے الحاق دکن کی جو تمہید پڑ چکی تھی اس کی تکمیل کے شوق سے بھی وہ معرا نہ تھا اور اس کی نسبت بجا پور اور گولکنڈے سے تعصب و عداوت کا جو الزام لگایا جاتا ہے وہ بھی بے بنیاد نہیں ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تعصب درد مندی اور غیرتِ اسلامی پر مبنی تھا کہ حکومت بجا پور کی بد نظمی اور قطب شاہی دربار کے فسق و فجور کا حال سن کر اسے سخت طیش آتا تھا کہ یہ خوش منظر و حاصل خیز ملک ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو نظم و نسق کی مطلق صلاحیت نہیں رکھتے اور اپنی بدعنوانیوں سے اسلام اور مسلمانوں کو خراب و رسوا کر رہے ہیں، انھیں کی کمزوری اور نااہلی کا ایک نتیجہ یہ ہوا تھا کہ پونا کی نئی مرہٹہ ریاست روز افزوں قوت و استقلال حاصل کرتی جاتی تھی اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سیوا جی کو خود مغلوں کی فتح دکن کے منصوبوں سے بھی بالواسطہ مدد اور تقویت پہنچتی رہی اور جب کبھی حکومت بجا پور نے اسے پامال کرنے کا سامان کیا، وہ مغلوں کی پناہ میں آگیا۔

یہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ساہو جی بھوسلہ کی دولت آباد کی نظام شاہی حکومت کے احیا میں ناکامی کے بعد آخر کار بجا پور میں ملازمت کی اجازت مل گئی تھی اور اب وہ اسی دربار کا ایک معزز جاگیر دار تھا۔ لیکن اس کی زندگی ہی میں اس کے چھوٹے بیٹے سیوا جی نے (ولادت ۱۰۹۲ھ) باپ کی پہاڑی اور ووردست جاگیر (واقع گوکن) میں جو ان ہو کر بجا پور کے اکثر

باب

دیہات لوٹے اور قریب کے بعض چھوٹے قلعوں پر قابض ہو گیا بیجا پور کے حکام اول اول کچھ اپنی بے پردائی کچھ اس کے باپ کے رسوخ و اثر کی وجہ سے اسے طرح دیتے رہے لیکن اورنگ زیب شروع سے اس کے مزاج و میلان کا صحیح اندازہ کر چکا تھا اور جب اس نے مغلوں کے علاقے میں بھی فتہ آقا نہ چھاپے مارے تو اورنگ زیب نے اس کا فوری تدارک کیا اور ایک فوجی دستہ بھیج کر سیوا جی کو قبول اطاعت پر مجبور کیا تھا۔ پھر بیجا پور سے صلح (۱۶۶۶ء) کے وقت بھی اس نے عادل شاہی دربار کو تاکید کی تھی کہ سیوا جی کو سزا دی جائے یا کم سے کم اسے کوکن سے ہٹا کر سرحد مغلیہ سے کسی بعید علاقے میں جاگیر دیدی جائے۔

اس قسم کی ہدایتوں پر فوری توجہ کرنے کی تو اہل بیجا پور میں صلاحیت نہ تھی لیکن جب اورنگ زیبی انتظامات نے سیوا جی کو مغلوں کے علاقے میں بڑھنے سے روک دیا اور بیجا پور کے اضلاع ہی میں اس نے وسیع پیمانے پر تاخت و تاراج شروع کی نیز بیجا پوری سپہ سالار افضل خاں کو جو اس کے استیصال کے لیے مامور ہوا تھا، قریب سے قتل کر دیا تو خود علی عادل شاہ ثانی کو اس پر فوج کشی کرنی پڑی (۱۶۶۶ء) اور سیوا جی نے بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لی پھر کچھ حکومت کے اندرونی خلفشار کچھ ساتھ جی کی سبب سناٹوں سے اسے معافی مل گئی تو اس نے دوبارہ پہلے سے کہیں زیادہ قوت و جمعیت کے ساتھ مغلوں کے علاقے پر چھاپے مارنے شروع کئے اور اس نے ملنے کی شہر مغربی بندرگاہ سورت کو بھی یکا یک حملہ کر کے لوٹ لیا۔ (۱۶۶۶ء)۔

اس سے کچھ پہلے ساتھ جی بھوئلہ وفات پا چکا تھا اور اب سیوا جی کو خود مختاری کا دعویٰ تھا۔ کم سے کم وہ ریاست بیجا پور کے قابو سے بالکل باہر ہو چکا تھا۔ لہذا اورنگ زیب نے اسے سزا دینے کے لیے دربار کے معزز امیر

ب۔

راجہ جے سنگھ اور مشہور سپہ سالار دلیہ خاں کو دکن بھیجا جنہوں نے چند
 مہینے میں سیوا جی کا قریب قریب تمام علاقہ اور قلعے چھین لیے اور یہ محض
 راجہ جے سنگھ کی مروت و رعایت تھی کہ اسے دوبارہ قبول اطاعت اور
 تقریباً دو تہائی علاقہ حوالے کر دینے کے عوض میں معافی دیدی گئی۔ اور آپندہ
 بیجا پور کے خلاف لڑائیوں میں وہ مغلوں کا مدد و معاون بن گیا۔ اس کے
 صلے میں سیوا جی کے فرزند سنبھا جی کو جو باپ کی طرف سے خود شریک جنگ
 تھا دربار مغلیہ سے پنچہزاری منصب عطا ہوا اور آئندہ سالانہ دربار میں
 شرکت کی غرض سے دونوں باپ بیٹے آکر آئے اور نذر پیش کرنے کا
 شرف حاصل کیا (۱۶۶۵ء) لیکن معلوم ہوتا ہے یہاں سیوا جی کی اتنی خاطر ملازمت
 نہیں ہوئی جس کی اسے توقع تھی لہذا وہ چھپکر آکر اسے فرار ہو گیا۔ باپ بہ
 سلطنت مغلیہ کی قوت و عظمت دیکھ کر اب وہ اس بات کو سمجھ گیا تھا کہ
 اگر محض قزاقی کی بجائے کوئی مستقل حکومت دریا ست قائم کرنی ہے تو
 مغلوں کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو مصالحت سے کام لینا چاہیے چنانچہ
 اس نے دکن پہنچ کر دکن کے مغل صوبہ دار کی وساطت سے بادشاہ سے
 معافی مانگ لی اور چند سال تک خاموشی سے اپنی ریاست کا اندرونی انتظام
 کرتا رہا۔

سیوا جی نے کچھ عرصے بعد پھر عہد و پیمان کی خلاف ورزی کی تھی اور
 مغلیہ علاقوں کی تاخت و تاراج کا سلسلہ اس کی وفات (۱۶۶۹ء) کے بعد
 بھی جاری رہا۔ دوسرے اس کے بانشین سنبھا جی نے شہزادہ اکبر کو اپنے ہاں
 پناہ دی جس سے اندیشہ ناک پیچیدگیاں پیدا ہونے کا امکان تھا۔ پس

نقبات
دکن۔

۱۔ سرکار جلد چہارم صفحہ ۹۷ وغیرہ۔ مغلیہ دربار میں جانے اور وہاں سے فرار ہونے کے متعلق بھی
 انگریزی تاریخوں میں عجیب عجیب افسانے اور بادشاہ پر لغو الزامات تراشے گئے ہیں جن کی
 مولوی شبلی صاحب نے اپنے رسالے میں تردید کی ہے اس جگہ ان واقعات پر مفصل بحث کرنا
 بے محل اور موجب طوالت ہوگا۔

باب

بیجا پور و گولکنڈہ کے معاملات طے کرنے کے علاوہ اورنگ زیب کے دکن آئیکا
تیسرا مقصد یہ تھا کہ مرہٹوں کی اس سرکشی اور لوٹ مار کا خاطر خواہ تدارک
کر دیا جائے۔

جب ۱۶۸۲ء میں شہنشاہ دکن آگئے تو مرہٹوں کے خلاف سخت معرکے
شروع ہو گئے۔ کوکن میں جہاں مرہٹوں کے قلعے تھے یورشیں ہونے لگیں۔
ایک فوج شاہزادہ اعظم اور دوسرے نامی سپہ سالاروں کے ساتھ شمالی کوکن
بھیجی گئی اور قلعہ رام سیج کا محاصرہ ہوا جو ناسک کے قریب ہے اور دوسری فوج
شاہزادہ اعظم کے ماتحت مغربی کوکن کے قلعوں پر حملہ آور ہوئی۔ لیکن کوکن
کے دشوار گزار اجڑاؤ کی وجہ سے یہ دونوں مہمیں ناکام ہوئیں اور ناچار
یہ فوجیں احمد نگر ہٹ آئیں۔ ایک سال شہنشاہ نے سکوت اختیار کیا اور
۱۶۸۴ء میں پھر فوجی تیاریاں شروع ہوئیں لیکن اس وقت مرہٹوں کی فرحت
کے بجائے شہنشاہ نے بیجا پور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں پر پہلے حملہ کرنا ضروری سمجھا
شہنشاہ کو یہ محسوس ہوا کہ جب تک ان سلطنتوں کا خاتمہ نہ ہو جائے مرہٹوں کی
سرکوبی ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ سلطنتیں اپنے بچاؤ کے لیے مرہٹوں کی تائید کرتی
تھیں اور مرہٹوں کا بھی اس میں بہت فائدہ تھا اس لیے جو فوجیں مرہٹوں
کی مفاومت میں مصروف تھیں وہ بیجا پور اور گولکنڈہ پر حملہ کرنے کے لیے
بھیجی گئیں شاہزادہ اعظم بیجا پور کے لیے اور اعظم گولکنڈہ کے لیے مقرر ہوا۔
اگرچہ یہ دونوں سلطنتیں بہت کچھ فرسودہ ہو چکی تھیں لیکن ان کی قوت
مدافعت میں فرق نہیں آیا تھا۔ اور مرہٹوں کی تائید جلدی صورت حال
پیچیدہ بنائی تھی اس طرح ان سلطنتوں کی تسخیر آسان نہ تھی۔ جب بیجا پور کا محاصرہ
شروع ہوا تو ایک طرف بیجا پوری فوج نے حملہ کیا تو دوسری طرف سے
مرہٹوں نے تاخت و تاراج شروع کر دی اور مختل فوجوں کے لیے سخت
دشواریوں کا سامنا تھا اور بروقت امداد نہ پہنچتی تو مختل فوجوں کا بالکل خاتمہ
ہو جاتا۔ دو مہینے بارہ روز کے محاصرے کے بعد بیجا پور کا قلعہ فتح ہوا اور
عادل شاہی خاندان کا آخری تاجدار سکندر عادل شاہ قتل اور اس میں

داخل ہو گیا ۱۶۸۶ء

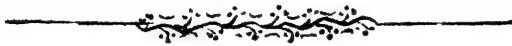
کچھ دنوں کے وقفے سے گولکنڈے کی ہم روانہ ہوئی تھی۔ گولکنڈے کی تسخیر بیجاپور سے بھی زیادہ کٹھن ثابت ہوئی۔ بیجاپور تو خانہ جنگیوں کا شکار ہو چکا تھا اور اس کی قوت مدافعت اندرونی خلفشار کے نذر ہو چکی تھی اس لیے صرف دو مہینے کے محاصرے میں اس کا خاتمہ ہو گیا لیکن گولکنڈے کی حالت دوسری تھی اس کے پرسکون حالات کی وجہ سے اس میں لڑنے کا کافی دم خم تھا۔ لکھنیر پہلا مقابلہ ہوا لیکن یہاں قطب شاہی فوجوں کو شکست ہو گئی اور مغلوں نے حیدر آباد کی طرف پیش قدمی کی۔ چونکہ شہر بالکل کھلا ہوا تھا اس لیے ابوالحسن قطب شاہ شہر کو مغل حملہ آوروں کے حوالے کر کے قلعہ گولکنڈہ میں محصور ہو گیا اور شہزادہ اعظم سے صلح کی سلسلہ جنابانی شروع کی۔ شہزادہ صلح کی طرف مائل تھا لیکن شہنشاہ صلح کے بہت مخالف تھے بیجاپور کی تسخیر سے فارغ ہو کر حیدر آباد پہنچ گئے اور قلعے کا محاصرہ شروع کر دیا۔ جو بہت کٹھن ثابت ہوا۔ اس میں مغلوں کی بڑی بڑی فوجیں اور پڑے سپہ سالار کام آئے۔ پورے آٹھ مہینے اس محاصرے میں صرف ہوئے اور تسخیر بھی اس طرح ہوئی کہ چند میوٹاؤں نے قلعے کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس طرح گولکنڈے کا محاصرہ مغل تاریخ کے اہم واقعات میں سے ہے ہندوستان کی تاریخ میں ایسے واقعات بہت کم ہوئے۔ ابوالحسن قطب شاہ نے جس اولوالعزمی کے ساتھ اپنے کو مغلوں کے حوالے کیا تھا اس کی بھی مثال نہیں ملتی یہ دولت آباد کے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔ اسی وجہ سے گولکنڈے میں بیجاپور کے ساتھ ۱۶۸۶ء میں مغل سلطنت میں ضم کر لیا گیا۔

گولکنڈے کی تسخیر کے بعد مغل فوجیں مرہٹوں کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہوئیں شہنشاہ حیدر آباد سے بیدر اور اس کے بعد بیجاپور پہنچ گئے۔ فیروز جنگ کو قلعہ ادھونی کے لیے اور شہزادہ اعظم کو سنبھاجی کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ قلعہ ادھونی تو اسی سال فتح ہو گیا لیکن سنبھاجی کی گرفتاری میں دو سال لگ گئے اس کی عیش پسندی اور تساہل کی وجہ سے مغلوں کو موقع مل گیا۔ شیخ نظام حیدر آبادی نے جو قلعہ پر نالہ کی تسخیر میں مصروف تھا اس کے ٹھکانے کا پتا لگایا۔ معلوم ہوا کہ

بج

یہ قلعہ کھیلنا میں ہے۔ مثل فوجوں نے دھاوا کر دیا۔ اسی قلعے کے قریب یہ اور اس کے تمام اہل و عیال گرفتار ہوئے ۱۶۸۹ء اس کے پس ماندگان کے ساتھ تو نہایت اچھا سلوک کیا گیا لیکن سنبھاجی کو اس کی بیگمڑی اور بدزبانی کی سزا میں قتل کر دیا گیا۔ لیکن اس کے قتل سے خاطر خواہ اطمینان نہیں ہوا کیونکہ مرہٹوں نے اس کے سوتیلے بھائی راجہ رام کو جو قید میں تھا رہا کر کے اپنا راجہ بنا لیا۔ اس نے قلعہ راہری میں اپنا قدم جما دیا تھا۔ اور نگ زیب کے مشہور جنرل ذوالفقار خاں نے اس قلعے پر حملہ کر دیا لیکن راجہ رام جو گویا کالباس پہنکر فرار ہو گیا۔ دریائے تنگبھدرا پر ایک لڑائی ہوئی لیکن وہاں سے بھی نکل بھاگا اور ساحل کارو منڈل کے قلعہ مشہور قلعہ جنجی میں قدم جمایا۔ اس کے مقابلے کے لیے ذوالفقار خاں اور اس کا باپ اسد خاں اور شاہزادہ کام بخش مامور ہوئے تھے۔ ۱۶۹۰ء میں یہ قلعہ جنجی پہنچ گئے۔ لیکن اس قلعے کی تسخیر بہت دشوار گزار ثابت ہوئی پے در پے دارو گیر کے بعد بڑی مشکل سے یہ قلعہ ۱۶۹۶ء میں فتح ہوا لیکن راجہ رام یہاں سے بھی بچ کر نکل گیا اور یہ کئی سال کے بعد برار کی بادیہ نوردی میں مرا۔ قلعہ جنجی کی تسخیر کے بعد مرہٹوں کے دوسرے قلعے یعنی ستارا پر نال بھوسان گڈ اور پری وغیرہ فتح ہو گئے اور مرہٹوں کے مشہور جنرل سنبھاجی اور دھنا جی قتل ہو گئے۔ ۱۶۹۸ء میں شہنشاہ اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ اس کے انتقال سے دو سال پہلے دکن کا سیاسی مطلع بہت کچھ صاف معلوم ہوتا تھا۔ دکنی سلطنتوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مرہٹوں کے تمام قلعے مفتوح اور ان کے تمام سردار تہ تیغ ہو چکے تھے۔ اور جب شہنشاہی کیمپ دریائے کرشنا کے کنارے قائم ہوا تو جنوبی راج دھانیوں نے بھی اطاعت اختیار کر لی لیکن یہ صورت حال کچھ امید افزا نہیں ثابت ہوئی۔ یوں دیکھنے کو تو دریائے کاویری تک مغل عداوت قائم ہو گئی تھی لیکن غور سے دیکھا جائے تو وہ طاقتیں جن کو زیر کرنے کے لیے شہنشاہ دکن آئے اور یہیں پیوند خاک ہو گئے صحیح معنوں میں مغلوب نہیں ہوئی تھیں خود یہ مسئلہ اب تک زیر بحث ہے کہ دکن کی اسلامی سلطنتوں کا خاتمہ کہاں تک

مغل سلطنت کے لیے مفید مطلب تھا۔ مگر ان سلطنتوں کے خاتمے سے یہ مطلب تھا کہ مرہٹوں کا کوئی سہارا باقی نہیں رہے اور مرہٹے بے دست و پا ہو جائیں تو وہ بھی پورا نہیں ہوا کیونکہ ان سلطنتوں کے ٹوٹنے کے بعد ان کے لیے روزگار سیاہی مرہٹوں سے مل گئے اور مرہٹوں سے زیادہ مغل سلطنت کے دشمن ہو گئے۔ نیز سیوا جی کے عہد میں مرہٹوں میں جو قومی روح پھونک دی گئی تھی وہ فنا ہونے والی نہیں تھی۔ اگرچہ شہنشاہ نے ان کے تمام سردار قتل کر دیے اور ان کے تمام قلعے مسخر کر لیے لیکن قوم باقی تھی اور اس کو بروقت کوئی نہ کوئی ہٹا ملتا تھا راجہ رام مر گیا تو اس کی بیوی تارا بائی نے قوم کی عنان اپنے ہاتھ میں لے لی اور مغل سلطنت کا مقابلہ کیا گو ان کی متحد قوت باقی نہ تھی لیکن ان کی منتشر ٹولیاں جگہ جگہ حملہ کرتی تھیں اور مغل فوجوں کو دق کرتی تھیں۔ اورنگ زیب کے انتقال تک یہ صورت حال رہی اور اس کے بعد جب اس قوم کو اچھے پیشوا مل گئے تو یہ پھر غیر معمولی طاقت بن گئی اور بالآخر مغل سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اس طریقے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اورنگ زیب کا تمام دکھنی منصوبہ ناکام ثابت ہوا گو اس کی کچھ ذمہ داری اس کے کمزور جانشینوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔



ضمیمہ باب ۳

نقل ”عہد نامہ کہ بموجب التماس پادشاہ زادہ محمد مراد بخش قلی شہ“

(آداب عالمگیری ورق ۱۳۳ و ۱۳۴)

چوں دریں ہنگام خجستہ آغاز فرخندہ انجام کہ آوان طلوع نیر سعادت و اقبال
وزمان سلطی صبح عظمت و اجلال است و شاہباز بلند پرواز ہمت جہاں کشا
دہوائے صید مقصود بال کشادہ اعدائے اعلام دین متین سید المرسلین علیہم السلام
ایماہا و من التحيات از کاہا . وجہ قصد گردیدہ و تمامی نیت حق طوبیت مصروف آنست
کہ بمساعی غازیان ظفر لواز و زور بازوئے محابدان نصرت انتما خارا الحاد و زندقہ
از گلشن ہمیشہ بہار دیار اسلام برافتد و رئیس الملاحدہ با اتباع و اجزای خویش
نیست و نابود شود و گرد تفرقہ بر ساکنان عرصہ وسعت آباد ہندوستان
بہشت نشان کہ از میاں جد و اجتہاد اجداد عظام گردوں مقام و آیائے کرام
فلک اعظام جہا ہم اللہ تعالیٰ عن المسلمین خیر الجزاء از لوث کفر و شرک مصفا گشت

مخوزه درآمده بنشینند برادر بجاں برابر اعزاز شد ارجمند کارمگار نامدار عالی تبار
 بمقتضائے رائے صواب نمائے خرد آرائے دولت افزا که اجل مواهب الهی است
 عمل نموده دریں بهم عاقبت محمود توفیق موافقت و مراقت یافته بود مواخات
 و موالات را که بر دایم عهد و موافقت استحکام پذیرفته بود محمد و اچنانچه باید بایمان
 کثیر الایقان موسس ساخته باخود مقرر کرده که بعد استیصال آن دشمن دین و دولت
 و استقرار و انتظام امور سلطنت سر بر جاده تویم وفاق و اتفاق و رزیدہ ہمیں
 و تیرہ ہمہ وقت و ہمہ جا در ہمہ کار رفیق بوده شریک باشند و بادوست و دوست
 و بادشمن و دشمن بوده در هیچ حال از مرضیات خاطر عاقل بیرون نروند و از جملہ ممالک محروسہ
 آنچه حسب الاتماس آن درۃ التاج حشمت و کامکاری بایشان و اگر از اشتہ شود
 قانع و خورند گشتہ افزول طلبی نہ نمایند بنا بر آن از روستے و فور شفت و دعا و طفت
 و نظر بمراتبی کہ پاس عہد آن نموده اند مرقوم قلم و الارقم می گردود کہ انشاء اللہ تعالیٰ
 تا آن زمان کہ از آن برادر ارجمند خجستہ اطوار بیکو خصال خلاف اخلاص و بیکرنگی
 و حق شناسی بوقوع نیاید اشفاق و مهربانی نمائے مادر بارہ ایشان بر و زخواہد بود
 و نفع و ضرر جانبین را یکے دانستہ در جمیع اوقات استخاور و ابالغ و جہ
 مرغی خواہیم داشت و الطاف و مراحیم کہ امروز نسبت بہ آن
 عزیز از جاں میندول است پس از حصول مامل و بر اقتادان لمحہ نامقبول
 بہمان خط بلکہ بہتر از آن معمول گشتہ دقیقہ از دقائق آن نہل نخواہیم گذاشت بوفائے وعدہ
 و نخستہ چنانچہ سابق مقرر شدہ بود صوبہ لاہور و کابل و کشمیر و ملتان و بھکر و
 تمام آن ضلع را تا ساحل خلیج عمان بآں نامدار و الاتبار و اگر از اشتہ دریں باب
 مضائقہ را بحال نخواہیم داد و بعد فراغ از استیصال لمحہ کہ مہیدہ افعال و قمع غایب شروضا
 از چہار چمن دولت خدا داد و ایدہ اتصال کہ رفاقت و مہربانی آن تازہ نہال بوستان
 سلطنت و اقبال دہاں کار لازم و ناگزیر است بے توقف ایشان را بد آن حدود روانہ
 نمودہ اصلا و مطلقاً بتاخیر خصمت را منعی نخواہیم شد و شرف عدت محبت و مودت و صداقت
 و نفقت را از غبار نفاس ارباب غرض کہ اکثر اتناس انداز صفائنداختہ جز بہرہ داریں و
 کامیابی نشائیں آن عین الانسان و انسان العین نخواہیم اندیشید و در صدق این دعویٰ

۱۶۹

خدا و رسول خدا را گواه گرفته ایم و ثبوت را بجهت مزید اطمینان و استظهار خاطر آن گرامی برادر بهر دو
نقش پیغمبر مبارک خاص مزین گزرا نیدم باید که ایشان نیز منطوق آیه کریمه "وَفُؤَا بِالْعَهْدِ
إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا" را بطالع نظر سعادت اثر داشته در پاس لوازم معاشرت که مورد
نیکنامی دنیا و آخرت است باقصی الغایه کوشیده برین منبج صیاب مستقیم باشند و از ضایع
پندیده خود را از وصمت بغیر و جبهی که شاید صیانت نموده گفته تا بخردان کینه اندیش را که از و
خایت و ناست بهمت و رکاکت فطرت طلب منافع روده و تحصیل اغراض فاسده خویش
بر صلاح حال و آل دلی نعمت می دارند و از انواع طرق درآمده با قایل باطله نموده بهنگامه
شورش و فساد را گرم می سازند و از آن دست اشرار درین جزو زماں بسیار و بی شمار اند
بسمع رضا اصفا نه کنند و پیوسته بنیر شمع سعادت افروز خود دور بین و عقل صلاح گزین در
مسالک معاشرت سلوک نموده این مشعل خورشید ضیاء را از بادوم سرد آن بگماهدارند
وَفَقْنَا لِلَّهِ تَعَالَىٰ وَاَيُّكُمْ بِمَا حَبَّبَ وَيَرْضَىٰ "وَاللَّهُ يَحْكُمُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ"



باب

آخری مغل بادشاہ

پہلی فصل مغلیہ تمدن

نور الدین جہانگیر (۱۵۶۹ء - ۱۶۰۵ء) سے معزالدین جہاندار شاہ (۱۱۲۳ھ - ۱۱۶۱ھ) تک جس قدر تیموری سلاطین تخت ہندوستان کے وارث ہوئے سب کے سرکاری القاب میں دنیا کی فرماں رواؤں کا ادعا پایا جاتا ہے۔ اور اگر اس مبالغہ شاعرانہ سے محض ان بادشاہوں کی عظمت و اقبال کا اظہار مقصود ہو تو یہ بالکل صحیح ہے کہ ٹھیک یہی زمانہ ان کے انتہائی عروج و اقتدار کا زمانہ ہے جس میں کل (دبئی) دنیا کا ایک خمس اور متمدن دنیا کا ایک تہ کے قریب حصہ ان کے زیر نگین تھا!

یہ ہم ادب پر پڑھ چکے ہیں کہ شاہ اور رنگ زیب عالمگیر کے آخری زمانے تک اس سلطنت کی وسعت و قوت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن

باب

جس وقت اس درویش مزاج فرماں روا نے وفات پائی تو معلوم ہوتا تھا کہ سلاطین مغلیہ کا آفتاب سلطوت و اقبال نصف النہار پر پہنچ کر عظم گریہ اور چند سال بعد سے اس میں مہیوٹ و زوال کے آثار نظر آتے ہیں۔ مگر اس انقلاب کے اسباب و واقعات لکھنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم بیچ کے چھ سال کے مختصر حالات بیان کرنے کے بعد اس عہد کے تمدن پر ایک سرسری نگاہ ڈال جائیں جسے بعض اعتبار سے ہندوستان کا بہترین زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اورنگ زیب نے اپنی زندگی میں بڑے میٹے شہزادہ محمد معظم کو شمالی ہند اور کابل کی حکومت سونپ دی تھی۔ وسط ہند و مہجرات باب کے چاہیے بیٹے محمد اعظم کے زیر انتظام تھے اور جنوبی ہندوستان شہزادہ کاؤم بخش کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اسی انتظام کے مطابق وہ سلطنت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کرنا چاہتا تھا اور بیٹا ہر شہزادہ محمد معظم کا بھی منشا یہی تھا کہ ممکن ہو تو اپنے ولیہ و جنگجو بھائی کو کچھ اور ملک دیکر جنگ سے بچا جائے لیکن باب کی تہمید و تحقیر سے فرصت پاتے ہی محمد اعظم نے بڑے بھائی پر فوج کشی کی اور اگرے کے قریب ایک خونریز جنگ میں مارا گیا (جنگ سرانے جلیو ربیع الاول ۱۰۱۱ھ) پھر معظم نے چھوٹے بھائی سے اطاعت و خراج گزاری کا مطالبہ کیا اور اس کے انکار پر لشکر لے کر حیدر آباد تک بڑھا۔ بد مزاج کاؤم بخش سے مزاحمت کی کوئی خاطر خواہ تدبیر نہ بن پڑی اور وہ کمال بے سروسامانی کے باوجود محض جوش تہور میں لڑ کر زخمی ہوا اور اسی زخم سے وفات پائی (ذوقعدہ ۱۰۱۱ھ) ہندوستان کے تمام ممالک پھر ایک مطلق العنان شہنشاہ کے زیر نگیں آئے جو تاریخ میں شاہ عالم بہادر شاہ (اول) کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

دکن کی اسی لشکر کشی کے زمانے میں بعض مرہٹہ سرداروں نے بھی بادشاہ کی رفاقت کے صلے میں جاگیر و مناصب حاصل کئے۔ سنبھاجی کے فرزند ساہوجی (ثانی) کو حواورنگ زیب کے انتقال کے بعد ناکرد گیا تھا پہلے ہی ایک باجوہاری کی حیثیت سے پونا کا راجہ تسلیم کر لیا گیا تھا اور لکڑس کے چچا رام راجا کی میوہ تارا بانی جھٹکانہ کرتی تو

شاہ عالم
بہادر شاہ

بہادر شاہ اس بات پر آمادہ تھا کہ دکن میں وصول مانگڑاری کا ٹھیکہ بھی ساہو کے نام منتظر کر لے اور اس کے معاوضے میں اسے کل سرکاری جمع کا چوتھائی حصہ دیدیا جائے اور گو اس وقت مرہٹوں کے اندرونی تنازعات کی وجہ سے یہ معاملہ ملتوی رہ گیا تاہم یہی زمانہ ہے جس میں کچھ تو بادشاہ کے ذاتی علم و برداری کے اثر سے اور کچھ مرہٹوں کے پچھلے نقصانات کی تلافی اور دمجی کے خیال سے حکومت نے ان کے ساتھ رعایت و مہاشتی کا طریق عمل اختیار کیا اور انھیں دوبارہ اطمینان سے سانس لینے کا موقع ملا۔

مرہٹوں کے برخلاف راجپوتانے کے بعض سرداروں نے شہزادہ کامیش کی حمایت کے حیلے سے جنگ و بغاوت پر کمر باندھ ہی تھی، اور پنجاب کے سکھ سرہند و سلطانپور میں فتنہ و فساد برپا کر رہے تھے۔ لیکن وہ بادشاہی فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور یہ مفسدے بزورِ فرد گرد دیے گئے۔ چار سال کی حکومت کے بعد ضعیف العمر بہادر شاہ نے ستر سال چند ماہ کی عمر میں وفات پائی (محم ۱۱۳۳ھ) تو ملک میں ہر طرف امن و امان تھا۔

بہادر شاہ کی اولاد میں سب سے لائق شہزادہ عظیم الشان تھا لیکن وہ اپنے بڑے بھائی معز الدین کے ساتھ لڑائی میں مارا گیا اور باقی دو بیٹوں کو مغلوب کرنے کے بعد یہی فتح مند شہزادہ جہاندار شاہ کے لقب سے تخت ہندوستان کا مالک ہوا۔ مگر یہ کامیابی عارضی تھی اور سال کے ختم ہوتے ہوتے وہ اپنے بھتیجے فرخ سیر کے مقابلے میں شکست کھا کے قتل کر دیا گیا جس کا حال آگے آتا ہے۔ لیکن جہاندار شاہ کی اسی شکست اور فرخ سیر کی تخت نشینی سے مغلوں کی سیاسی قوت میں اس انحطاط کے آثار نمایاں ہوتے ہیں جو درحقیقت ان کے سیاسی نظام حکومت اور نیز طرز معاشرت کا لازمی نتیجہ تھا۔

ہندوستان کی اسلامی حکومتوں کے عیب و صواب پر ہم نے اس کتاب کے گزشتہ اوراق میں کہیں کہیں اجمالی بحث کی ہے حقیقت میں موروثی بادشاہی کے اصول نقائص اس قدر آشکارا و مسلم ہیں کہ ان پر

اب

زیادہ بحث و گفتگو کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ خیال کہ ممالک ایشیا میں لوگوں کو ان خرابیوں کا احساس نہ تھا یا یہ کہ یہاں کے باشندے طبعاً غلامی پسند اور اہل یورپ سے زیادہ بادشاہ پرست ہیں، محض لغو اور جدید یورپ کے خود پسند مصنفوں کا مشترکہ کردہ ہے۔ اس کے برعکس تاریخی واقعات سے یہ ثابت کرنا کہ یورپ کے لوگ اس قسم کی غلامانہ اشخاص پرستی کے مرض میں اہل مشرق سے بھی زیادہ مبتلا رہے ہیں، کچھ دشوار نہیں مگر یہاں ہم کو صرف ہندوستان کے حالات سے غرض رکھنی ہے کہ گو سلاطین منلیہ کے عہد میں اس موروثی مطلق العنان بادشاہی کو پہلے سے بھی زیادہ تقویت حاصل ہوئی لیکن اس کا سبب محض لوگوں کی بے بسی کو قرار دینا سخت نا انصافی اور ان مغل بادشاہوں کی بڑی قدر ناشناسی ہے جو باہر سے شاہ عالم (اول) کے زمانے تک حکمرانی کے بہترین اوصاف سے متصف تھے۔ ملک میں عدل و انصاف کے ساتھ امن و انتظام قائم کرنے اور مختلف عناصر و طبائع کو خدمت سلطنت کے لیے متحد کر لینے کی ان میں کامل اہلیت و استعداد موجود تھی اور حکومت کی پابنداری کی حقیقی اور بنیادی شرائط یہی ہیں۔ ورنہ فروعی اصلاحات، تمدنی ترقی یا بیرونی فتوحات کو ایک صحیح و قوی حکومت کے ضمنی لوازم سمجھنا چاہئے! اب غبر سے دیکھئے تو خود یہ امر کہ شاہ عالم کے بعد نالائق بادشاہوں کے تحت نشیں ہوتے ہی تیموری خاندان کی حکمرانی میں زوال آگیا، اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ کم سے کم ہندوستان کا طبقہ امرا محض موروثی بادشاہ کے سامنے سرطاعت ختم کرنے پر آمادہ نہ تھا بلکہ اس کی ”بادشاہ پرستی“ بھی اسی وقت تک تھی جب تک کہ خود بادشاہ لائق و منظم اور اطاعت گزاری کے سزاوار تھے!

لیکن یہ جتانے کے بعد کہ اتنے عرصے کی شخصی حکومت اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اہل ہندوستان سیاسی آزادی اور انسانی حقوق کے خیالات سے عاری ہو گئے تھے، یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ مذکورہ بالا طرز بادشاہی نے ان میں کسی ایک مطلق العنان اور بالادست فرما کے بغیر باہم مل کر

حکومت کرنے کی قابلیت باقی نہ چھوڑی تھی۔ اور وہ بالعموم خود غرض اور تنگ نظر ہو گئے تھے۔ دوسرے تیموری خاندان کے بادشاہوں کی اطاعت نے ان کے حوصلے پست کر دیے تھے اور اس خاندان کے انحطاط کے بعد ان میں کوئی ایسا اولوالعزم نہ پیدا ہوا کہ پھر مالک ہند کو ایک مرکزی حکومت کے ماتحت متحد کر دیتا۔

طبقہ امرا کے قواعد اخلاقی و سیاسی کو ضعیف کرنے کا ایک اور گہرا سبب کثرت مال اور عیش پسندی کو سمجھنا چاہئے۔ مگر اس میں اہل ہند یا مغلوں کی کچھ خصوصیت نہیں۔ نفس انسانی کے لیے دولت و حکومت سخت آزمائش ہیں۔ انھیں پا کر اپنے جذبات و افعال پر قابو رکھنا کوئی سہل بات نہیں۔ مگر یہ دولت برسی، مسست نہ گردی، مردی، قدیم فلاسفہ اور اہل مذہب نے بالعموم دولت کی بے اعتباری اور برے نتائج بتا کر لوگوں کو اس سے نفرت سکھائی ہے۔ اسلامی تعلیم اس میں یہ ترمیم و اضافہ کرتی ہے کہ دولت محض خدا کی دی ہوئی امانت ہے اور ایک دیانت دار خدا شناس بندے کا فرض ہے کہ وہ اسے محض دینے والے (خدا) کی رضا جوئی میں صرف کرے۔ مگر مسلمان من حیث القوم ان اخلاقی موانع و حکم کو مدت سے فراموش کر چکے تھے۔ عیش پسندی اور لہو لعب مغل سلاطین کی سرشت میں داخل تھے۔ جنگ کے وقت وہ جیسے مدبر سپہ سالار، منجھے سپاہی اور دلدادہ رزم و قتال تھے، حالت امن و فراغت میں اسی قدر انھیں بزم عیش و طرب سے دلچسپی تھی اور تمام طبقہ امرا پر یہی رنگ چڑھا ہوا تھا؛ اور رنگ زیب کی بچاہ سالہ بادشاہی اس عشرت پسندی کے خلاف ایک عظیم الشان جدوجہد تھی اور اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی ذاتی مثال اور سرکاری ضوابط کے زور سے اہل دربار کی حالت میں انقلاب پیدا کر دیا تھا اس کے اکثر عمال و امرائے خاندان شاہی کے افراد نہایت سادگی پسند تھے پرہیزگار نظر آتے ہیں۔ لیکن دراصل یہ ”کامیابی“ عارضی اور ایک حد تک جبری کامیابی تھی بلکہ سچ پوچھئے تو اسی نے بہت سے امیر گھرانوں کو بادشاہ سے ناخوش کر دیا۔ انھیں تو لاؤ غلا

باب

یا عقلاً و اخلاقاً تو بادشاہ سے مخالفت کی کوئی گنجائش ملتی نہ تھی لیکن مدتوں کی عادتیں اور سامان عیش و عشرت چھوڑنے سے بھی دل میں سخت جھڑپ ہوتے تھے اور ان کا نفس بادشاہ پر اعتراض و حرف گیری کے نئے نئے چیلے سمجھاتا تھا۔ چنانچہ اس زمانے کی اکثر کتابوں میں اس درپردہ ناراضی اور بدگمانی کے شواہد موجود ہیں۔

اورنگ زیب اپنے خطوط میں بیٹوں یا امرا کو جا بجا یہودہ مراسم اور سرفانہ تکلفات پر ٹوکتا ہے۔ یہ رسمیں اکبر کے آخری عہد یا کہنا چلے ہوئے کا استقلال حکومت و غرور کے ہم قدم شاہی درباروں اور امیرانہ محلات میں داخل ہوئی تھیں، ان بادشاہوں کے جشن یا خاص خاص درباروں کے حالات پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ ہندوستان میں اس وقت دولت کی کوئی حد بھی تھی؟ دربار کی تزئین و آرائش، فیاضانہ داد و بخش اور بے حساب خیرات و صدقات میں بلا مبالغہ کروڑوں روپیہ خرچ ہو جاتا تھا امرائے شاہی جو نذرین یا ہدیے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے تھے وہ علحدہ علحدہ لاکھوں روپے کے ہوتے تھے۔ بیش قیمت سے بیش قیمت جواہرات، نادر سے نادر قدرتی اور مصنوعی اشیا اور بے مثل مصنوعات اور ظروف و اسباب ساری دنیا سے کچھ کچھ ہندوستان آتے اور یہاں کی سرکاروں میں منہ مانگی قیمتوں پر خرید لیے جاتے تھے۔ دراصل یہی تاریخی زمانہ ہے جس میں ہند کی دولت و اعتشام کے قہقہے ملک ملک مشہور ہوئے اور یہاں کے شاہانہ جاہ و جلال نے ساسانی درباروں کی داستان عظمت کو ماند کر دیا، مغل بادشاہوں کے یہ حالات جن میں جنگی جہات اور اہم انتظامات سے لے کر ان کے طعام و لباس نشست و برخاست وغیرہ ذاتی شواغل و عادات کی جزئیات تک داخل ہیں، اس زمانے کی تاریخوں میں بہت تفصیل سے مرقوم ہیں۔ انہیں یہاں بیان کرنے کی گنجائش نہیں مگر یہ بات یاد دلانے کے قابل ہے کہ بادشاہوں کی اسی طرز معاشرت کا ملک یا کم سے کم اعلیٰ طبقے پر اثر پڑتا تھا اور ہر امیر و رئیس اپنی اپنی جگہ بے در و وسعت

ایرانی عہد
و معاشرت

وبصاعت شاہی و صنایع و اطوار کی تقلید کرنی چاہتا تھا۔ اگر بادشاہوں کے جنگی ساز و اسلحہ، ظروف و اسباب آرائش، نئے نئے لباس اور کھانے پینے کے یامحلات کی تعمیر باغات کی تیاری لہ کے بڑے بڑے محلے اور کارخانے تھے تو امرا کی سرکاریں بھی اس سے خالی نہ تھیں۔ جس طرح بادشاہوں کی دیکھپی یا راحت رسانی کے واسطے ہزاروں ملازم، مصاحب، شاعر، داستان گو، مختلف فنون کے باکمال استاد، داروغہ، چیراہی، برقداز، کھار، فراش، مشعلچی، مہرے مقرر ہوتے تھے اسی طرح امیروں کے پاس بھی نوکروں کی فوج کی فوج رہتی تھی۔ البتہ انفرادی ذوق کے مطابق بعض امیروں کے ہاں علما، فضلا، انشا پرداز، شعر کا مجمع، رہتا تھا، بعض فنون سپہگری کے قدردان تھے اور بعض سرکاریں صنعت و حرفت کی قدردانی میں مشہور تھیں۔

اس میں کچھ کلام نہیں کہ عیش دوستی کے ساتھ مغل امرا نہایت زہد و دل خوش مذاق اور سلیقہ مند حاکم تھے اور گزشتہ سو ڈیڑھ سو برس کی حکومت و سکونت میں انھوں نے ہندوستان کو گلزار بنا دیا تھا۔ ہر قسم کے فنون و صناعات اور لوازم معیشت و مسرت کو جو اس زمانے کا تسکین فراہم کر سکتا تھا، انھوں نے ترقی دی۔ مصوری، موسیقی اور شعر گوئی کو اسلامی تعلیم مخرب اخلاق نہیں تو بے کار لہو و لعب میں ضریر داخل کرتی ہے

فنون و صناعات

لہ۔ اس زمانے میں عام طور پر ہر محل میں پائیں باغ مزدور ہوتے تھے۔ مکانات کی طرز بالعموم دیہی تھی جس کے بعض نمونے قدیم غبروں میں اب تک کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ یعنی صدر میں شمال رو بہ و سجہ اور عالی شان دہرے دالان، شمشین، سامنے چبوترہ، مہتابیاں، اور ادھر ادھر نوکروں کے مکانات، جدید قسم کے کمروں کا بہت کم رواج تھا اور کواڑوں کے کمروں یا کونٹھروں سے زیادہ تر اسباب رکھنے کا کام لیا جاتا تھا۔ سردی کے زمانے میں دالانوں کے پر تکلف گرم پردوں اور انگلیشیوں سے گرم رکھتے تھے۔ گرمیوں میں دن کا زیادہ حصہ ترخانوں اور خنوں میں گزارا جاتا تھا۔

باب

اس زمانے میں انھیں ”فنون لطیفہ“ کا دلاویز خطاب دیا گیا ہے اور اس لیے یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ ان فنون کو دسویں اور گیارھویں صدی ہجری میں نہایت فروغ حاصل ہوا، اور عہد اکبر و جہانگیر کی بعض تصاویر کی اب تک یورپ میں تعریف و قدر کی جاتی ہے۔ انگریزی سفیر طامس روکی یہ دلچسپ شہادت محفوظ ہے کہ دیگر تحالفت کے ساتھ اس نے جو بہترین تصویر نذر کی تھی چند ہی روز میں شاہی مصوڑوں نے اس کی چند ایسی نقلیں تیار کر دیں کہ طامس روکی اپنی اصلی تصویر کے پہچاننے میں بہت دشواری پیش آئی۔ لفظ فنون لطیفہ سے

لفظ الفنشن، صفحہ ۵۴ وغیرہ وغیرہ ان تحالفت میں ایک گھوڑا گاڑی یا کبھی بھی طامس روکی نے پیش کی تھی اور شاہی کارکنوں نے اسی طرز پر کہیں بہتر گاڑیاں تیار کر دیں۔ انھی ”فرنگی طرزی کی گاڑیوں کا ہم عصر فارسی تواریخ میں کہیں کہیں ذکر آتے سے طامس روکی دوبار جہانگیری میں آنا ثابت ہوتا ہے (دیکھو ایٹ جلد ششم حاشیہ صفحہ ۳۴) درنہ بادشاہ سے اپنی بے تکلف ملاقاتوں کے متعلق یا دوبار کے جو کچھ حالات سفیر مذکور نے تحریر کئے ہیں وہ بالکل ناقابل اعتبار ہیں۔ نزدیک جہانگیری، واقعات جہانگیری، اقبال نامہ جہانگیری وغیرہ مستند فارسی تواریخ ایسی موجود ہیں جن میں جہانگیر کے روزانہ شاعری کا تفصیل ذکر کیا ہے اور بہت معمولی سی نئی بات بھی قلم انداز نہیں ہوئی ہے۔ اگر طامس روکی واقعی ایسی ہی تکرم و تواضع ہوتی ہوتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ ان کتابوں میں اس کی سفارت کا مطلق ذکر اور اس کا کہیں نام تک نہ آتا اور ہرے روجن تجارتی مراعات کی درخواست کرتا تھا، وہ خود اس کے بیان کے مطابق کالی تین سال کی لنگ درد کے بعد بھی اراکین حکومت نے تمام و کمال منظور نہیں کی۔ حالانکہ بادشاہ کی معمولی نظر عنایت بہت جلد اس کو امیر وزیر کی استمداد سے مستغنی کر سکتی تھی، غرض درایت انگریزی سفیر کی اکثر تحریریں محض فرضی معلوم ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ جو پادری پیری آیا تھا وہ اس سے بھی کہیں زیادہ بے باک دروغ گو ہے، چند سال پہلے ملک انگلستان کے ”اہل تحقیق“ اس قسم کی تحریروں کو بحسنہ شائع کرنے سے بظاہر شرماتے تھے لیکن اب جبکہ بریتیر اور متوکی جیسے مبتذل مفتری تاریخ ہند کے مستند مصنف اپنے جانے لگے ہیں تو کیا عجب ہے کہ رفتہ رفتہ پیری اور چرند و زل کے ”موشیانہ اور بیہودہ جھوٹ“ بھی کچھ دن بعد تاریخ کے ماخذ قرار دے دیئے جائیں جس کا رینٹنٹ اسمتھ جیسے نامور و محقق نے اپنی سب سے ”تازہ اور مستند تاریخ“ میں راستہ تیار کر دیا ہے۔

قطع نظر۔ فن عمارت کے ہر شعبے نے عہد مغلیہ میں جو حیرت انگیز ترقی کی تھی وہ فی الواقع تعجب انگیز ہے۔ بعض مغل سلاطین خاص کر شاہجہاں اس فن کے بے مثل ماہر تھے اور ان کے شاہانہ شوق و ذوق نے اپنی پر شکوہ عمارات میں جو استحکام و حسن پیدا کیا ہے اس کے بعض نمونے آج تک دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتے ہیں۔

اس بات کی بہت سی دلچسپ شہادتیں پیش کی جاسکتی ہیں مگر گیارہویں صدی ہجری یا سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان صنعت و حرفت کے اعتبار سے دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ممالک میں داخل تھا۔ مورکینڈ کو جس کے نتائج تحقیقات زیادہ تر فرنگی سیاحوں کے اقوال پر مبنی ہیں، اپنی تازہ ترین کتاب میں تسلیم کرنا پڑا کہ ”یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ صنعت و حرفت میں ہندوستان موجودہ زمانے کی نسبت اس وقت مغربی یورپ سے کہیں زیادہ ترقی کر چکا تھا، لیکن ہم کو مغربی یورپ کے موجودہ فروغ اور لا جواب مصنوعات کی کثرت دیکھ کر دھوکے میں پڑنا نہ چاہئے۔ بے شبہ عظیم الشان خانی کلیں اور انجن جدید یورپ کا سرمایہ امتیاز ہیں جن کی بدولت وہ لاج دنیا پر مسلط نظر آتا ہے۔ بایں ہمہ وہاں کے دستکاریوں کو ایشیا کے صاحب ذوق صنایعوں پر غالباً کسی زمانے میں بھی فضیلت حاصل نہیں ہوئی اور آج بھی ممالک ایشیا میں جو قدیم صنعتیں بحالت کس پیرسی باقی رہ گئی ہیں، ان کے باکمال استاد اس قسم کی چیزیں تیار کر دیتے ہیں کہ حسن و خوبی کے اعتبار سے اہل یورپ ان کا مثل پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ ان صناعات کے علاوہ علاوہ حالات بیان کرنے کا یہ عمل نہیں۔ اجمالی طور پر اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں بہترین قسم کا ریشمی، اونی اور سوئی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ لوہا تانبا، ہیرا وغیرہ مختلف معدنیات خاصے وسیع پیمانے پر کانوں سے نکالی جاتی تھیں اور گوام استعمالی دھاتوں کی یہ کثرت نہ تھی اور نہ ان کی اس قدر اچھی اور

ای

ستی چیزیں تیار ہوتی تھیں جیسی کہ اس زمانے میں عام طور پر دستیاب ہو جاتی ہیں، بایں ہمہ خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ توپ و تفنگ سے لے کر سوئی اور انگشتانے تک ضرورت کی ہر شے خود ہندوستان میں بن سکتی تھی اور یہ بالکل مسلم ہے کہ اس زمانے میں اہل ہند اپنے کثیر اسباب معاشرت کے لیے کسی بیرونی ملک کے دست نگر نہ تھے۔

بیرونی تجارت
درآمد و
برآمد

بعض قیمتی اور نادر اشیاء جیسے ترکی قالین، قائم و سحاب، چینی یا شیشے کے بیش بہا ظروف کے علاوہ، چھجی دھاتیں خاص کر سونا چاندی، نیز مہتی دانت بیرونی ممالک سے ہندوستان میں آتا تھا مگر یہ درآمد بھی حقیقت میں بہانگی دولت مندی کا ثبوت ہے۔ ورنہ مہتی دانت کے کام اور قیمتی معادن کے زیورات یا زربانی وغیرہ صنعتوں میں خود اہل ہند کسی سے کمتر نہ تھے اور یہاں کے مختلف شہروں میں ان مصنوعات کے بڑے بڑے کارخانے قائم تھے۔ چنانچہ اس زمانے کی مشکلات تجارت و سفر پر نظر کیجئے تو خود ہندوستان سے جو مصنوعات باہر دساور جاتی تھیں ان کی مقدار حیرت انگیز تھی۔

سواہل سندھ و گجرات سے کوہین تک اور دوسری جانب مچھلی پٹم سے چاٹ گام تک بہت سی بارونق بندرگاہیں بحری تجارت کا مرکز تھیں، جس پر دسویں صدی ہجری (سولہویں عیسوی) میں عربی المنسل مسلمان تاجروں کا قبضہ تھا۔ گیارہویں صدی سے اہل یورپ کے تجارتی جہازوں کی آمد و رفت شروع ہوئی اور ہندوستان کی بحری تجارت میں روز بروز ان کا دخل بڑھنے لگا۔ مگر اس تغیر سے بھی مجموعی طور پر تجارت ہند کو ترقی ہوئی اور بہت سی اجناس مقدار کثیر میں ہندوستان سے براہ راست یورپ کو دساور جانے لگیں۔

۱۔ انڈیا ایٹ ڈی ڈیچہ او ف اکبر صفحہ ۴۲ و ۴۳۔

۲۔ دیکھو مورینڈ کی تازہ ترین کتاب انڈیا ایٹ ڈی ڈیچہ او ف اکبر صفحہ ۱۹۸ وغیرہ

لیکن واضح رہے کہ دفاعی جہاز کے رواج سے پہلے تجارت زیادہ تر ”بری“ ہوا کرتی تھی۔ اور گزشتہ اوراق میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ عربوں کی حکومت مندھ کے وقت سے غیر ممالک کے ساتھ ہند کی اس بڑی تجارت میں ایک انقلاب سا پیدا ہو گیا اور یورپ و افریقہ کے بعید ممالک سے تجارتی قافلے بلاد ہندوستان تک آنے جانے لگے تھے۔ ترک و مغل سلاطین ہند کے زمانے میں اس کو اور ترقی ہوئی اور دور دور کی مصنوعات ہندوستان کی منڈیوں میں پہنچنے لگیں، کیونکہ ملکی امن و انتظام کے ساتھ آب آمد و رفت کے راستے اور وسائل سفر بھی پہلے کی بنسبت بہتر ہو گئے تھے اور شیر شاہ سوری کے زمانے سے اورنگ زیب کے عہد تک حکومت ہندوستان برابر سفر میں مزید سہولتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی، آجکل ریل اور موٹر سے قطع مسافت میں جس قسم کی آسانیاں ہو گئی ہیں، ان کا تو عشر عشر بھی کہیں دنیا میں آج سے ایک صدی قبل تک میسر نہ تھا۔ بایں ہمہ اس عصر کے معیار تمدن کی رو سے ہندوستان کے تمام شہروں تک صاف اور محفوظ راستوں کا تیار کر لیا جانا اور ہر منزل پر قیام اور سواری و بار برداری کا وسیع پیمانے پر انتظام ہی کچھ کم بات نہ تھی، نہایت گرم اور خشک سالی کے ایام کو چھوڑ کر سال کے کئی مہینے تک ہزار ہا لاکھوں کے قافلے دور دور تک ہزاروں من مال لاتے لیجاتے رہتے تھے جن کی حکومت نہایت فیاضی سے حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ اور مورخین کے الفاظ میں ”اہل ہندوستان نے اپنی بحری تجارت کی طرح بڑی تجارت و سفر کا بھی ایسا انتظام کر لیا تھا کہ اس عہد میں یقیناً اسے ان کا بڑا کارنامہ سمجھنا چاہئے“

پکی سڑک اور لوہے کے پلکے پیول کی گاڑی کا ان دنوں رواج نہ تھا لیکن سرعت سفر کے لیے نہایت صبار رفتار و دور دم گھوڑے اور اونٹ خاص طور پر سدھائے جاتے تھے۔ آرام اور تکلف کی سواریاں مختلف قسم کے

باب

سنگھاسن، پالکی، ہوادار اور ڈولیاں تھیں جنھیں کئی کئی کہار لیکر چلتے اور بارہ پندرہ میل روزانہ کے حساب سے بہت دور تک لیجا سکتے تھے۔ سفر کی سام سواریاں رتھیں اور نیل گاڑیاں تھیں جو ہندوستان کے بعض حصوں میں اب تک کام دیتی ہیں۔ اکثر راستوں پر دورویہ سایہ دار درخت نصب کر دئے جاتے کہ گرمیوں میں مسافر کو تکلیف نہ ہو۔ ہر منزل پر بلکہ ہر دو میل پر ٹھہرنے کے لیے وسیع دپختہ سرائیں ہوتی تھیں جنھیں بجائے خود ایک چھوٹا سا قلعہ سمجھنا چاہئے جہاں مسافروں کی ضروریات پوری کرنے کے واسطے ایک مختصر بازار اور ایک وقت میں صد ہا آدمیوں کے ٹھہرانے کا انتظام ہوتا تھا۔ اس قسم کی سرائیں بنانے پر جن کے ٹوٹے پھوٹے آثار اب بھی ہر جگہ نظر آ جاتے ہیں، سب سے اول شیر شاہ سوری نے خاص توجہ مبذول کی تھی لیکن کیا صدیوں صدی جبری میں یہ کام اس وسعت کے ساتھ تکمیل کو پہنچا کہ شاید دنیا کے تین بڑے ملک میں اور کہیں اس قدر سرائیں راستوں پر نہ ہوں گی جتنی ہندوستان میں بن گئی تھیں۔ اصل میں اورنگ زیب اپنے اجداد کی طرح عالیشان قصور و ایوان کی تعمیر کو اسراف و خود نمائی سمجھتا تھا اور فقط ذاتی آرام اور خوشی کے لیے خزانہ عامہ کا روپیہ خرچ کرنا نہ چاہتا تھا لہذا بادشاہ کی کثیر آمدنی بیشتر خیر و رفاه عام کے کاموں میں صرف ہوتی جس میں تعمیر، آس و سہارا کی مدد سب سے مقدم و اہم تھی۔ چنانچہ تخت نشینی کے کچھ عرصے بعد ہی اس نے احکام صادر کئے تھے کہ ”در جمیع طرق و شوارع این ممالک کثیر المسالک ہر جا کہ سرادر باطنہ باشد از سرکار خالصہ شریفہ سرائے وسیع الفضل از سنگ و خشت و آہک و گچ در کمال متانت و استحکام مشتمل بر بازار و مسجد و چاد پختہ و حمام بسازند۔۔۔۔۔۔“ وچینیں حکم والا صادر شد کہ ہر سرائے قدیم البنیان کہ ممکن مرمت باشد بہ ترسیم آل پردازند و در ہر موضع کہ پل درکار باشد بہ استحکام تام بسازند۔ چنانچہ از خزائن جو دو اکرام بادشاہی پر مصارف میں اہنیہ چنداں از خرچہ شدہ وہی شود کہ مستوفی خیال۔۔۔۔۔۔ از تخمین آں عاجز است۔“

ایک
ڈاک
اعظم

ان سراؤں سے قطع مسافت اور ڈاک لائے لیجانے میں بھی بہت آسانی ہو گئی تھی۔ ”ڈاک چوکی“ کا مستقل انتظام جسے عہد اکبری سے منوب کرنے لگے ہیں، حقیقت شیر شاہ سوری کا رواج دادہ مقابلہ لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ اس کے بعد اس میں بہت کچھ وسعت و اصلاح ہوتی رہی، اس کی صورت یہ تھی کہ کم سے کم ہر آٹھ دس میل کی منزل پر چند سوار اور ہر کارے متعین ہوتے جو بادشاہی ڈاک کو جلد سے جلد اگلی منزل تک پہنچا دیتے تھے اور گو بعض روایات مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس انتظام کی بدولت افغانستان و بنگال گجرات و دکن غرض بعید ترین حصص ملک سے پائے تخت اکبر آباد میں ہر دس گیارہ دن میں بادشاہ کو باقاعدہ ڈاک مل جاتی تھی۔ بادشاہ کی طرف سے زیادہ ضروری فرامین و احکام معمولی ہر کاروں کی بحالے ”گزر برداروں“ کے ہاتھ بھیجے جاتے تھے جنہیں اس زمانے کی اصطلاح میں ”سارجنٹ“ کہنا غلط نہ ہوگا۔

شاہی ہر کاروں کے ذریعے اور لوگ بھی ہر مقام پر اپنے اعزاء اور احباب کو خط بھیج سکتے تھے۔ لیکن امرا، حکام اور بڑے تاجروں کو ڈاک کا خود علیحدہ انتظام کرنا پڑتا تھا۔ اور بہت سی شہادتیں محفوظ ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دنوں ایک مقام سے دوسرے مقام کے لوگوں میں خط و کتابت کا سلسلہ بخوبی جاری تھا۔ کم سے کم پائے تخت یا شاہی لشکر گاہ اور بڑے بڑے شہروں کی خیر میں اور خطوط بہت جلد ملک کے ہر گوشے میں پہنچ جاتے تھے۔

مگر اس زمانے کی تمدنی ترقی کا بہترین اندازہ کثرت آبادی اور مدنیت کے حالات پڑھنے سے ہوتا ہے۔ یہ حالات اس کثرت سے اگرچہ نہایت مندرجہ ذیل میں موجود ہیں کہ ہندوستان کے ایک ایک بڑے شہر کی

آبادی اور
بے شمار

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ بنائے گئے جن کے طلبہ اہل علمین کے تمام مسافر سرکار ادا کرتی تھی۔

۱۔ تاریخ شیر شاہی۔ ایٹم جلد چارم صفحہ ۴۱۸۔

بایں

گزشتہ عظمت و آسودگی پر ضخیم کتابیں لکھی جاسکتی ہیں اور لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن مردم شماری کا رواج نہ ہونے سے لوگوں کی تعداد کے متعلق کوئی قطعی اور تحریری سند میسر نہیں آتی۔ بیرونی سیاحوں کے بیانات اور بعض فارسی تواریخ کو محنت اور غور سے مطالعہ کرنے کے بعد مورکینڈ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دسویں صدی ہجری کے خاتمے پر ہندوستان کی کل آبادی دس کروڑ اور بڑے بڑے شہروں کے باشندوں کا شمار تخمیناً ڈھائی لاکھ سے پانچ لاکھ تک تھا۔

شہروں کی آبادی کے اس تخمینے کے متعلق ہمیں اختلاف ہے اور خود یہ مؤلف بھی تسلیم کرتا ہے کہ بیشی آبادی کے ثبوت میں بہت سی دلائل پیش کی جاسکتی ہیں مگر اس بحث کو چھوڑ کر اگر مذکورہ بالا نتائج ہی کو تسلیم کر لیا جائے تو بھی ماننا ہوگا کہ آئندہ ایک صدی میں یہ آبادی کم سے کم دہائی ہو گئی تھی کیونکہ کلیہ عام کے مطابق ہر خوش حال ملک کی آبادی نصف صدی میں گنی ہو جاتی ہے اور اہل ہند میں افزائش نسل کی صلاحیت مشہور ہے۔ غرض یہ کہنا کہ اورنگ زیب کے اواخر عہد حکومت میں سلطنت مغلیہ کی کل آبادی بیس کروڑ سے کم نہ تھی، بظاہر کسی طرح غلط نہیں ہو سکتا۔

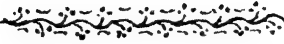
بڑے شہروں کی آبادی کا اشارہ گزشتہ کتاب میں ذکر آچکا ہے کہ دسویں صدی ہجری سے کچھ پہلے ہندوستان کے بعض شہر جو خود مختار سلطنتوں کے پائے تخت بنے نہایت آباد و بارونق تھے۔ ان سلطنتوں کی خود مختاری سننے کے بعد ان میں سے بعض میں یقیناً زوال آ گیا لیکن جہاں تجارت یا صنعت و حرفت کی گرم بازاری تھی یا جو شہر منغل صوبہ داروں کے مستقر بن گئے تھے، وہ اپنی حالت پر قائم رہے بلکہ بعض نے ترقی کی۔ مثلاً احمد آباد کی آبادی کا تخمینہ نویں سے گیارہویں صدی ہجری کے اخیر تک نو لاکھ کیا جاتا ہے۔ سیلاطین مغلیہ کے پائے تخت اکبر آباد، ودہلی رونق و آبادی میں کسی طرح احمد آباد سے کم نہ تھے۔ لاہور کو جو عروج اس گیارہویں صدی

۱۲

ہر صوبہ دار کے ساتھ جو فوج اور ملازمین و متعلقین کا گروہ کثیر صوبے کے مستقر پر رہتا تھا خود اس کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار سے کم نہ ہوتی تھی اور ایک صوبہ دار کے رخصت ہونے کے بعد لازمی طور پر دوسرا اس کی جگہ آجاتا تھا۔ لہذا گو یہ لوگ شہر کے اصلی باشندے نہ ہوں تاہم ان کی تعداد کم و بیش برابر شہر میں موجود رہتی تھی۔ پس ان شہروں کی آبادی کا قیامی تخمینہ ایک لاکھ کرنا بیجا نہ ہوگا۔ اسی طرح سرکاروں کے مرکزی مقامات کی آبادی کا کم سے کم اندازہ پچیس تا پچاس ہزار کیا جاسکتا ہے اور مجموعی طور پر اس بیان کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غالباً اس وقت ہندوستان میں شہروں کی تعداد اور آبادی موجودہ زمانے سے زیادہ تھی۔ کیونکہ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ گزشتہ صدی کے اندر مغربی مصنوعات کی روز افزوں برآمد نے ہندوستان کے قریب قریب تمام قدیم صنعتوں کو فنا کر دیا اور لاکھوں دستکار و کاری گرا ایسے بیکار و محتاج رہ گئے کہ انہیں مجبوراً شہروں کی سکونت چھوڑ کر دیہات میں جانا اور زرعی پیشے اختیار کرنے پڑے۔ اب تیس چالیس سال سے نئے کارخانوں اور تجارتی سرگرمی کی بدولت دیہات کے مزدور پھر بڑے شہروں میں آنے لگے ہیں بایں ہمہ قرینہ کہتا ہے کہ ہندوستان کی اقتصادی دولت اور مدنیت کو یورپ کی تجارت سے جو نقصان عظیم پہنچ چکا ہے اگر اس کی تلافی ہوتی رہی تو بھی اس نقصان کے پورے ہونے میں ابھی نصف صدی اور درکار ہوگی۔

۱۔ گزشتہ مردم شماری (۱۹۲۶ء) میں ہندوستان کے (جس میں برآ بھی داخل ہے) ایسے شہروں کی تعداد جن کی آبادی پچاس ہزار یا اس سے زیادہ ہے، کل ۷۷ تھی اور پانچ ہزار یا زیادہ آبادی کے کل ۲۲۷ تھیں! (سینس رپورٹ سلاٹ ۲۰ صفحہ ۲۰ ضمیمہ کی جدول ۷)۔

دوسری فصل۔ نااہل بادشاہ



شاہ عالم بہادر شاہ نے اپنے بھائی کے مقابلے میں جن بہادر جاں نثاروں کی مدد سے تخت سلطنت جیتا تھا، ان میں سادات بابرہ کے تین بھائی پیش پیش تھے۔ چھوٹا سید نور الدین علی اسی خونریز معرکے میں کام آیا لیکن باقی دو یعنی سید حسن علی (عبداللہ) اور حسین علی مورد اعزاز واکرام ہوئے اور چار ہزاری منصب پا کر الہ آباد و بہار کی صوبہ داری پر سرفراز کر دیے گئے تھے۔ اہل میں بہار و بنگال کی حکومت پر شہزادہ عظیم الشان نامزد ہوا تھا لیکن وہ باپ کے ساتھ دربار میں رہا اور سید حسین علی اس کے نائب کی حیثیت سے پٹنہ بھیجا گیا۔ جہاں ان دنوں عظیم الشان کا بھلا بیٹا فرخ سیرجی سکونت گزیرا تھا۔ اس شہزادے کے پٹنہ میں قیام کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ جب اسے باپ کی نیابت سے علیحدہ کر کے بنگالے سے طلب کیا گیا تو چونکہ اپنے دوسرے بھائیوں کی نسبت دادا (شاہ عالم اول) کے حضور میں اس کی کچھ قدر نہ تھی، لہذا کافی زرا و سفر نہ ہونے کے حیلے سے وہ پٹنہ میں ٹھہر گیا اور شاہ عالم کی وفات کے وقت تک امیرانہ مشاغل میں اپنا وقت ضائع کرتا رہا۔

دادا کے انتقال کی خبر سن کر اس سے پہلے کہ وراثت سلطنت کا کوئی یقینی فیصلہ ہو، فرخ سیر نے پٹنہ میں اپنے باپ عظیم الشان کی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور جب عظیم الشان کے لڑائی میں مارے جانے کے ساتھ یہ اطلاع ملی کہ

۱۔ منتخب اللباب جلد دوم صفحہ ۷۰۷۔ ۲۔ تاتہ الامر جلد اول صفحہ ۲۲۳۔ سیر المتاخرین میں کسی قدر مختلف روایت تحریر ہے جلد دوم صفحہ ۷۰۷۔

باب

جہاندار شاہ اپنے بھائیوں پر غالب آگیا اور اب ان کی اولاد کے قتل و قید کی فکر میں ہے تو اس وقت فرخ سیر نے مقتول باپ کی جائیگی کے دعویٰ سے خود اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور سید حسین علی کو معاون بنا کر پائے تخت دہلی پر فوج کشی کی۔

جہاندار شاہ کی فوج سے پہلا مقابلہ کھجورہ (ضلع فتحپور) کے میدان میں ہوا تھا (شوال ۱۱۲۳ھ) لیکن بادشاہی سپاہ اپنے سرداروں کی نا اتفاقی اور نااہلی سے بہت جلد متفرق ہو گئی اور اہلی معرکہ اگرے کے قریب انھی میدانوں میں ہوا جہاں تلوار پہلے بھی شہزادگان تیموری کے حق فرمان روائی کا فیصلہ کر چکی تھی، داراشکوہ کی طرح جہاندار شاہ بھی اس موقع پر وہ تمام جنگی ساز و سامان لے کر لڑنے آیا تھا جو اس کے اقبال مند اجداد نے دہلی اور اگرے کے پائے تخت میں فراہم کر دیا تھا۔ تعداد میں اس کی فوج حریفوں سے چار پانچ گنی زیادہ تھی اور آغاز جنگ میں اس کا غلبہ یقینی نظر آتا تھا۔ لیکن فریق مخالف کے تمام سردار جان سے ہاتھ دھو کر بادشاہ وقت کے خلاف شیریک جنگ ہوئے تھے۔ شکست و فراری میں بھی انھیں سلامتی کی امید نہ تھی۔ لہذا مایوسانہ جانیازی سے جم کر لڑے اور شام تک ہٹ ہٹ کر حملہ آور ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ عیش دوست بادشاہ مرعوب و مضطرب ہو کر میدان سے بھاگا اور جیتی جتانی لڑائی ہار گیا۔ (ذو الحجہ ۱۱۲۳ھ)

جہاندار شاہ دہلی میں صیغہ سلامت پہنچ گیا اور چاہتا تھا کہ اپنے وزیر بلا مختار کل سپہ سالار ذوالفقار خاں کے ساتھ پنجاب کی طرف نکل جائے اور دوبارہ سلطنت کے لیے قسمت آزمائی کرے لیکن ذوالفقار خاں کے باپ اسد خاں نے بیٹے کو اس فعل سے باز رکھا اور جہاندار شاہ کو قلعے میں

۱۸۔ امیر لاراجہ الملک آصف الدولہ اسد خاں عہد عالمگیری کا نہایت ممتاز امیر تھا جس کا بہادر شاہ کے زمانے تک سلاطین تیموری نہایت اعزاز و اکرام کرتے رہے، تفصیلی حالات کے لیے دیکھو آثار الامرا جلد اول صفحہ ۳۱۰۔

نظر بند کرادیا۔ فرخ سیر کے سپاہیوں نے یہیں اسے بھانسی دی اور گو خود اسد خاں کی سخت ذلت و خواری کے بعد جان بخش دی گئی لیکن اس کا بیٹا حافیہ اقرار و عہد کے باوجود قتل کرادیا گیا اور جہاندار شاہ کے اور بہت سے رفیقوں کا بھی یہی جشہ ہوا بلکہ بعض لوگ محض شبہ پر بے گناہ مارے گئے۔

فتح محمد بادشاہ کی حکومت سال نو (۱۱۲۲ھ) سے شروع ہوتی ہے۔

فرخ سیر کی بادشاہی

اسی اعلان تاجپوشی کے موقع پر سید حسن (یا عبداللہ خاں) کو خطاب قطب الملک اور وزارت کا عہدہ عنایت ہوا اور اس کا چھوٹا بھائی امیر الامرا کے خطاب سے ”سیر بخشی“ یعنی وزارت جنگ کی خدمت پر مامور ہوا۔ انھی بھائیوں کے طفیل فرخ سیر کو بادشاہی نصیب ہوئی تھی اور اب وہ قدرتی طور پر اپنے آپ کو سلطنت کے مراتب جلیلہ کا حقدار سمجھتے تھے۔ لیکن قاعدہ ہے کہ مطلق العنان بادشاہ اپنے کسی امیر یا تحت کا زیادہ قوی ہو جانا پسند نہیں کرتے۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ وہ اس کے شرمندہ احسان ہوں، انھیں اس کا اقتدار حاصل کرنا اپنی سبکی نظر آتے لگتا ہے، فرخ سیر نے بھی اگرچہ اپنے محسنوں کو سلطنت کے سب سے بڑے عہدے دے دیئے تھے لیکن ان کی اعانت و دستگیری کا عار اس کے دل میں غلش پیدا کر رہا تھا اور سیدوں کے خلاف بدظن کرنے والوں کی بھی دربار میں کمی نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی سال میں بادشاہ در پردہ اپنے سابق مددگاروں کا دشمن ہو گیا اور اس کی بدسلوکیاں اس قدر بڑھیں کہ قطب الملک نے تاکید کی خط بھیج کر اپنے بھائی کو مہم جو دھپور سے واپس بلا لیا۔

اس جگہ مختصر طور پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مذکورہ بالا اہم راجہ اجیت سنگھ (راٹھور) کے خلاف بھیجی گئی تھی اور یہ راجہ جس کی بہادری اور حمیت قومی کی تعریف میں بابو جادونا تھہر سرکار نے کرنل ٹاؤ کی دیچھا دیچھی قابل مضحکہ مبالغے سے کام لیا ہے، جنونیت سنگھ کا وہی بیٹا تھا جسے درگاداس وینو پتیہ میں شاہ اورنگ زیب کے خلاف منشا چھپا کر لے بھاگا اور راجپوتانے میں

باب

شورش و جنگ کا سبب ہوا تھا صفحہ (۲۱۵) بے شبہہ اور نگ زریب کی وفات کے بعد اسے جو دھپور پر خود مختارانہ قبضہ کرنے کا موقع مل گیا تھا لیکن اول تو شاہ عالم بہادر شاہ نے جب اس پر فوج کشی کی تو اس کو عاجزانہ اطاعت و خراج گزاری کا اقرار کرنا پڑا دوسرے اب امیر الامرا حسین علی کے مقابلے میں بھی اس نے کوئی خاص جواغردی نہیں دکھائی بلکہ چند ہی شکستیں کھا کر خراج کی رقوم حاضر کر دیں اور ڈولے میں اپنی بیٹی بادشاہ کو بیاہ دی۔ (۱۱۲۳ھ)۔

سیدوں سے مخالفت۔

امیر الامرا نے ان شرائط صلح کو صرف اس لیے قبول کیا کہ اسے دلی واپس پہنچنے کی جلدی تھی جہاں اس کا بھائی بادشاہ کی بدسلوکی سے دربار میں جانا قریب قریب ترک کر چکا تھا۔ شاہ و وزیر کی اس مخالفت میں حق یہ ہے کہ ابتداً زیادتی فرخ سیر کی تھی۔ بے شبہہ سیدوں کے دل میں اس کا قرار واقعی رعب نہ تھا اور نیز یہ کہ وہ اپنے حقوق جتانے میں بھی کسی قدر اپنی حد سے نکل جاتے تھے لیکن اگر بادشاہ میں حکمرانی کی حقیقی قابلیت ہوتی تو ان کے اس غرور کی خود بخود اصلاح ہو جاتی۔ یا دوسری صورت یہ تھی کہ فرخ سیر علانیہ ان سیدوں کے استیصال کی کوشش کرتا جس میں غالباً اسے تھوڑی سی لڑائی کے بعد کامیابی ہو جاتی۔ جس طرح ہرام خاں ترکمان کے مقابلے میں نوجوان اکبر کو ہو گئی تھی؛ لیکن فرخ سیر شجاعت ذاتی کے وصف سے عاری تھا اور اس کی عداوت و ناراضی میں بھی بڑا لائے سازش کی شان تھی جو آخر تک ناکام رہی اور بادشاہ کی بے رحمی کے ساتھ سیدوں کی قوت بڑھتی گئی اور وہ آہستہ آہستہ بادشاہ کے قابو سے بالکل باہر ہو گئے۔ امیر الامرا سید حسین علی کے فوج سمیت پائے تخت واپس آجائے کے بعد فرخ سیر اپنی جگہ پر اور بھی مضطرب ہو گیا اور اب اس نے غاہری مدارات و تواضع سے پھر کوشش کی کہ کسی طرح ان بھائیوں کو جدا کر دے

بج

آخر ۱۲۵۵ھ میں امیر الامرا پھر اس بات پر رضامند ہو گیا کہ دکن کی صوبہ داری پر اورنگ آباد چلا جائے۔ مگر اس نے بادشاہ سے بعض شرطیں کرنے کے علاوہ اپنے بڑے بھائی کی قوت بھی کافی مضبوط کر دی اور جو امیر سیدوں کے ساتھ نہ تھے انھیں کمزور کر کے پائے تخت دہلی سے دور بھجوا دیا اور چلتے وقت بادشاہ کو صاف صاف سنا گیا کہ اگر قطب الملک کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی ہوئی تو اس حقیر کو تین ہفتے کے اندر دہلی میں پہنچا سمجھئے گا۔

اب فرخ میر نے راستے کے ان حکام کو جو سیدوں کے رفیق نہ تھے درپردہ امیر الامرا کا راستہ روکنے اور استیصال کرنے پر آمادہ کیا۔ لیکن سید ان سازشوں سے غافل نہ تھے اور یوں بھی دوسرے امیروں کو ایسے ناقابل اعتبار و بزدل بادشاہ کے واسطے سیدوں سے لڑائی مول لینے میں تامل تھا۔ صرف داؤد خان حاکم گجرات نے بادشاہ کے خفیہ احکام کی تعمیل کی اور جان پر کھیل کر برہان پور کے قریب امیر الامرا کی فوج کا مقابلہ کیا (رمضان ۱۲۵۵ھ) لیکن وہ اس لڑائی میں مارا گیا اور اس جاں نثار کی شکست و موت کا حال سکر بادشاہ کو بھی نہایت صدمہ اور مایوسی ہوئی۔

آئندہ پانچ سال کے عرصہ میں ہندوستان کے چند اندرونی مفسدوں کا بھی ذکر آتا ہے۔ مثلاً عیسیٰ خاں نامی سردار نے پنجاب میں اور جاٹوں نے اکبر آباد کے قریب شورش برپا کی۔ سکھوں نے مشرقی پنجاب میں سر اٹھایا اور لاہور تک صدمہ دیہات کو تاراج و پامال کر کے لوگوں پر خوفناک ظلم کئے۔ اور احمد آباد میں ہوئی پر ہندو مسلمانوں میں سخت تنازعہ ہوا۔ ان میں سے سکھوں کی شورش و شکست کا حال آئندہ ہماری نظر سے گزرے گا لیکن حقیقت یہ سب عارضی یا مقامی ہنگامے تھے جنھیں بادشاہی فوجوں نے

لے غائی خاں کی روایت ہے کہ فرخ میر نے اس رنج و ملال کا قطب الملک کے سامنے بھی اظہار کیا اور کہنے لگا کہ ایسے باوقار نامی سردار کو ناحق قتل کیا! قطب الملک نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور کی خوشی تو یہ تھی کہ میرا بھائی اس پٹوان کے ہاتھ سے مارا جائے! (منتخب جلد دوم ۵۵)

باب

تھوڑے تھوڑے دن کے بعد رفع دفع کرویا ورنہ سلطنت میں اصلی خلل بادشاہ اور سیدوں کی اسی مخالفت سے پیدا ہوا کہ قریب قریب ساری فوج اور خزانے پر تو سیدوں کا عمل دخل تھا اور ان کے خلاف منشا بادشاہ خود حکومت کرنی چاہتا تھا۔ یعنی جب موقع ملتا ان کے احکام منسوخ کر دیتا اور اندرونی طور پر انھیں زک دینے کی کوشش کرتا تھا۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ان کوششوں میں فرخ سیر کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی مگر صدر حکومت کی اس اندرونی کشمکش کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عمال سلطنت میں بے دلی اور بے اطمینانی پیدا ہو گئی اور حکومت کی کل چلنے میں جا بجائے بگڑنے اور اٹکنے لگی۔

صاحب مآثر الامرا کا یہ قول غلط نہیں ہے کہ اگر یہ ”بادشاہ گر“ سید اپنے اقتدار کے وقت خود بادشاہ بن جاتے تو سلطنت تیموریوں کے ہاتھ سے نکل کر غالباً عرصہ دراز تک سادات بارہہ کے خاندان میں رہتی۔ اور اس بات کے تمام قرائن بھی پیدا ہو گئے تھے کہ مغل سلاطین پر سیدوں کے کامل تسلط کا عنقریب یہی نتیجہ ہوگا، لیکن بڑی حکومتوں کے انقلاب ظاہر کارکنان قضا و قدر کی ایسی پوشیدہ مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں، جن تک انسانی سعی و فکر کی رسائی نہیں۔ سیدوں کو بھی عین عروج کے زمانے میں زوال کا منہ دیکھنا پڑا اور ان کی تباہی کے اسباب اس قدر تیزی سے رونما ہوئے کہ چند ہی مہینے میں ان کی تمام قوت و شوکت اور امیدیں خاک میں مل گئیں۔ شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ جب قطب الملک نے بادشاہ کی عداوت سے تنگ آکر اپنے بھائی کو دکن سے طلب کیا اور وہ ۱۳۱۱ھ کے شروع میں فوج کشی کے ساتھ پائے تخت میں پہنچ گیا تو اس وقت فرخ سیر کچھ بزدلی اور کچھ اپنی بے بسی کی وجہ سے بالکل ان بھائیوں کے قبضے میں آگیا اور چونکہ انھیں اس سے اپنے منشا کے موافق چلنے کی امید نہ رہی تھی لہذا انھوں نے اسے معزول و محبوس کر کے آخر میں کمال زلت و حقارت کے ساتھ

قتل کر دیا اور شاہ عالم بہادر شاہ کے ایک مدقوق پوتے رفیع الدرجات کی بادشاہی کا اعلان کر دیا جو محض نام کا بادشاہ تھا۔ (۱۱۱۹ھ)۔

سیدوں کی اس ظالمانہ حرکت نے یقیناً ملک میں سناٹا ڈال دیا ہوگا۔ کم سے کم دہلی کے لوگ تو انھیں علانیہ گالیاں دیتے تھے اور سادات بارہہ کا بے ہتھیار تنہا شہر میں نکلنا محذو ش ہو گیا تھا۔ سیدوں کے رفیقوں میں اجیت سنگھ (راٹھور) جس نے اپنی بیٹی فریح سیر کو دی اور اب اس کے قاتلوں کا معین و مددگار بن گیا تھا، سب سے زیادہ مطعون ہوا۔ بایں ہمہ سلطنت کی باگ اور اصلی قوت سیدوں کے ہاتھ میں تھی۔ دکن میں امیر الامرا نے حقوڑی مدت پہلے مرہٹوں سے اتحاد کا جدید معاہدہ کیا اور دس لاکھ روپے سالانہ خراج اور دہزار امدادی فوج کے معاوضے میں انھیں (دکن میں) چوتھ اور سولیس کمھی کا حق عطا کر دیا گیا تھا (۱۱۲۰ھ) جس کی عہد محمد شاہی میں باضابطہ تصدیق و توثیق ہوئی۔ دوسرے رفیع الدرجات کی تخت نشینی کے پہلے ہی روز دیوان وزارت سے جزیہ کی منوخی کا اعلان شائع کیا گیا تھا کہ میواڑ و ماروار کے راجپوت نیز شہروں کی ہندو رعایا کے دل میں جگہ ہو جائے اور اگر مسلمان رعایا سیدوں کی مخالفت میں بلوہ کرے تو ہندوان کا ساتھ نہ دیں۔

الغرض، گوچرم کی اندرونی خلش اور لوگوں کی ناراضی نے قطب الملک اور امیر الامرا کے قلبی سکون و اطمینان کو مٹا دیا ہو، جس کا حال لکھنے میں ہمارے فارسی مورخوں نے شاعرانہ انشا پردازی کا حق ادا کر دیا ہے، بایں ہمہ سیدوں کی ظاہری قوت و اقتدار میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا تھا اور جب

۱۔ اس معاہدے کی شرائط کو گرانٹ ڈف نے مرہٹوں کے سرکاری کاغذات کی بنیاد پر تفصیل سے بیان کیا ہے (جلد اول صفحہ ۶۹ و ۳۶۸) نیز دیکھئے منتخب اللہاب جلد دوم (صفحہ ۸۳ تا ۸۶) فرخ سیر نے اس معاہدے کو منظور نہیں کیا اور اس کی دو سال بعد عہد محمد شاہی میں باضابطہ تصدیق ہوئی۔

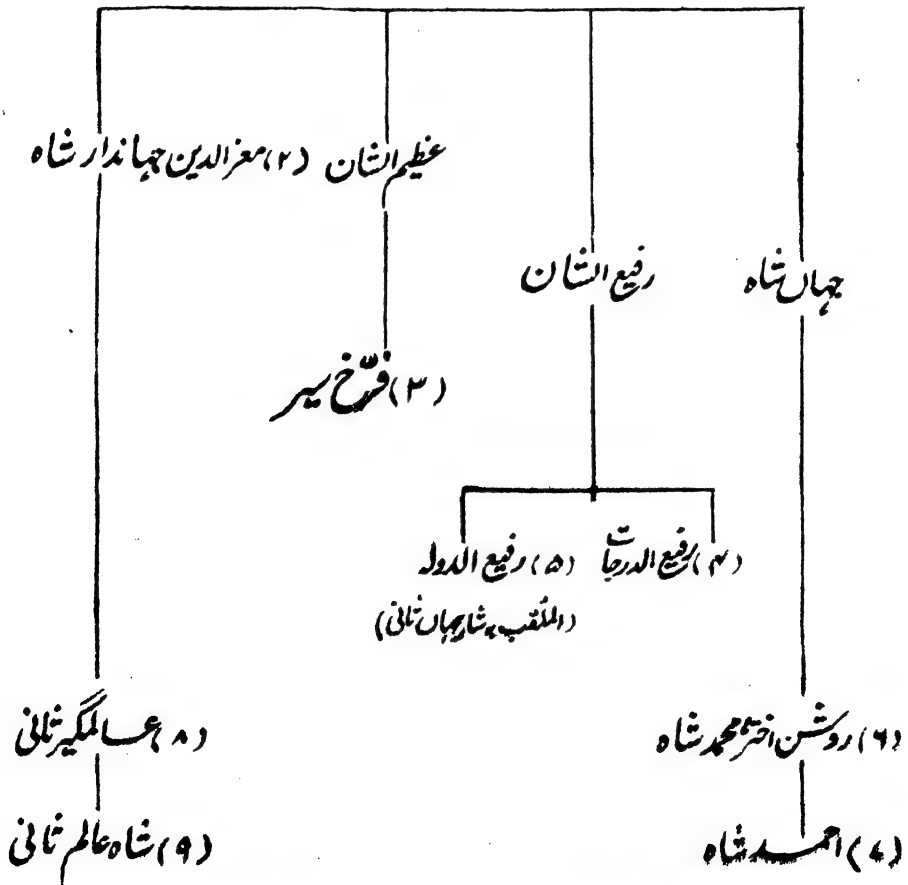
۲۔ منتخب اللہاب جلد دوم صفحہ ۸۱۷ وغیرہ وغیرہ۔

بای

رفیع الدرجات نے چند ہی ماہ میں وفات پائی تو انھوں نے اس کے دوسرے بھائی رفیع الدولہ کو جو پہلے سے بھی زیادہ مریض و کمزور تھا، شاہجہاں ثانی کے لقب سے بادشاہ بنادیا اور وہ بھی دو مہینے کے اندر تمام ہو گیا تو انھوں نے خاندان تیموری کے ایک اور شہزادے کی بادشاہی کا اعلان کر دیا جو تاریخ میں ابوالمظفر ناصر الدین محمد شاہ کے لقب سے مشہور ہے۔ (ذوقعدہ ۱۱۳۱ھ)

لہ۔ ان آخری سلاطین تیموریہ کا نسب ذہن نشین کرنے کے لیے ذیل کا شجرہ سامنے رکھنا مفید ہوگا:-

(۱) شاہ عالم بہادر شاہ اول



سلطنت کے بڑے امیروں میں اب سیدوں کو سب سے زیادہ دو کی طرف سے خطرہ تھا۔ ایک تو نواب نظام الملک فتح جنگ سے اور دوسرے جے پور کے راجہ جے سنگھ سے جس نے علانیان کی مخالفت پر کمر باندھی اور شہزادہ نیکو تیر کی حمایت کرنی شروع کی۔ اس تیموری شہزادے کو بعض لوگوں نے قید سے محال کر آگرے میں بادشاہی کا مدعی بنادیا تھا اور شاہ رفیع الدولہ کی وفات کے وقت بادشاہ گریڈ اسی فتنے کو فرو کرنے میں مصروف تھے۔ آخر کچھ جنگی قوت کے رعب اور کچھ دوستانہ خط و کتابت سے جے سنگھ نے دب کر سیدوں کی رفاقت قبول کر لی اور اسی کے چند روز بعد نیکو تیر بھی گرفتار ہو گیا (رمضان ۱۱۱۹ھ) سیدوں نے نواب نظام الملک کے استیصال کی تدبیر شروع کی۔

سلطنت مغلیہ کے اس نامور امیر کے حالات کسی قدر تفصیل سے آئندہ ہماری نظر سے گزریں گے۔ یہاں یہ لکھنا کافی ہے کہ نواب موصوف نے گزشتہ سیاسی انقلابات میں کمال احتیاط و دوراندیشی سے کام لیا اور سیدوں کو اپنی مخالفت کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ لیکن دربار شاہی کے قدیم اور خاندانی امرا اب نظام الملک ہی کو اپنا سردار سمجھتے تھے اور یہی رسوخ و اثر سیدوں کی نگاہ میں خار تھا۔ فرخ سیر کے قتل کے زمانے سے انھوں نے نواب موصوف کو پائے تخت سے دور، مالوے کی صوبہ داری پر بھیجا تھا لیکن جب دوسرے خرخشوں سے فرصت ہوئی اور معلوم ہوا کہ اس چھوٹے سے صوبے میں بھی نظام الملک نے اپنی لیاقت و محنت سے خاصی قوت بہم پہنچائی ہے، تو وہ جاویدجا اعتراضات کے پردے میں مخالفت کے لیے چلے تلاش کرنے لگے۔

آخر دربار کے امرا اور خود بادشاہ کے خفیہ خطوط سے نواب نظام الملک کو یقین ہو گیا کہ نہ صرف سلاطین تیموری کی خیر خواہی بلکہ خود اپنی مدافعت کے لیے میان سے تلوار نکالنا ناگزیر ہے۔ قسمت آزمائی کے واسطے دکن سے بہتر کوئی میدان نہ تھا جہاں امیر الامرا کے عزیز اور نائب حکمران تھے۔

بج

مرہٹوں کی مدد اور حکومت کے زور سے ان کی قوت بھی نسبتاً بہت زیادہ تھی لیکن نظام الملک کی علانیہ مخالفت کی خیر نے سلطنت کے بہت سے نامداریوں کو جو ان بادشاہ گرسادات کی غاصبانہ حکومت سے بیزار تھے، بلامنت رفیق و مددگار بنادیا چنانچہ اجین سے کوچ ہوتے ہی (جسب ۱۱۳۲ھ) چند روز میں اسیر گڑھ اور برہانپور کے قلعے دار بغیر جنگ نواب نظام الملک سے آئے اور ان مستحکم قلعوں پر نواب نظام الملک کا قبضہ ہو گیا۔

پھر اس باتذیر سرزدار نے حیرت انگیز شجاعت و کار دانی کے ساتھ پہلے سید دلاور علی خاں کی فوج کو شکست دی (جنگ حسن پور - قریب برہانپور) شعبان ۱۱۳۲ھ) اور پھر دکن کے نائب صوبہ دار سید عالم علی خاں کا مقابلہ کیا جو اورنگ آباد سے لشکر جہار کے ساتھ پیش قدمی کر رہا تھا۔ بالاپور (برار) کے قریب فریقین میں نہایت خونریز جنگ واقع ہوئی (شوال ۱۱۳۲ھ) سادات بارہہ اور ان کے حلیف بڑی بہادری سے لڑے لیکن تقدیر نے نواب نظام الملک کی قلیل تعداد سپاہ کے حق میں فیصلہ صادر کیا۔ سیدوں کو سخت ہزیمت نصیب ہوئی اور ملک دکن ان کے قبضے سے نکل گیا۔

امیر الامرا اور قطب الملک بادشاہ کے ساتھ آگرے میں مقیم تھے کہ ان شکستوں کی سراسیمہ کن اطلاع ملی۔ مالک دکن کے ہاتھ سے نکلنے کے علاوہ ان لڑائیوں میں ان کے بہت سے عزیز اور بہادر سردار کام آئے تھے۔ ملک میں عام طور پر بلکہ خود دربار میں لوگوں کو ان سے دلی نفرت تھی اور دل ہی دل میں ان کی شکست و زوال کی دعائیں مانگتے تھے بعض سپاہی دکن جانے سے بعد و مصائب سفر کے چیلے سے احتار کرنے لگے۔ غرض امیر الامرا کو تنہا نواب نظام الملک کے مقابلے میں فوج کشی کی جرأت نہ ہوئی اور آخر میں یہ فیصلہ قرار پایا کہ وہ بادشاہ کو ساتھ لے کر دکن جائے اور قطب الملک پائے تخت میں رہ کر ملک کا انتظام کرے۔

اس تجویز کے مطابق قطب الملک دلی روانہ ہوا اور لشکر شاہی نے

”بادشاہ گرو“
سیدوں کا
خاتمہ۔

دکن کی جانب کوچ کیا تھا کہ راستے میں توپب اعتماد الدولہ محمد امین خاں کے اشارے سے (جو نواب نظام الملک کا قریبی عزیز اور سیدوں کی جانب سے اندیشہ مند رہتا تھا) امیر الامرا حسین علی خاں پر قاتلانہ حملہ ہوا اور ایک محل امیر زادے نے عرضی دکھائے گئے یہاں قریب آکر خنجر کے ایک ہی بھر پور وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ (ذو حجہ ۱۱۱۱ھ) مقتول کے رفیقوں نے اس نصیبت ناگہانی پر شاہی لشکر گاہ میں سخت بلوہ مچا دیا تھا لیکن دو تین دن کی خونریزی میں ان کے بعض سردار قتل و قید ہوئے۔ اکثر نے ساتھ چھوڑ کر بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی اور جو باقی بچے تھے وہ بھاگ کر دلی چلے آئے۔ لشکر بادشاہی نے اب علانیہ قطب الملک اور ان باقی ماندہ سادات کے قلع قمع کے ارادے سے پائے تخت کی طرف مراجعت کی۔

ان یاس انگیز حالات میں بھی قطب الملک نے ہمت نہ ہاری اور میدان جنگ میں ایک مرتبہ اور قسمت آزمانے پر تیار ہو گیا۔ اول تو اس نے ایک اور تیموری شہزادے (سلطان ابراہیم بن رفیع الشان) کو کسی طرح رضا مند کر کے تخت شاہی پر بٹھا دیا پھر نئی فوج بھرتی کرنے میں خزانوں کے منہ کھول دئے اور بے دریغ روپیہ خرچ کر کے ایک بیٹے کے اندر نوے ہزار سوار فراہم کر لئے اور دلی سے باہر نکل کر بادشاہی فوج کا مقابلہ کیا، لڑائی پلٹ سے چند میل آگے موضع صن پور کے میدان میں ہوئی (ماہ محرم ۱۱۱۲ھ) سادات بارہ نے سپہ گری اور جان بازی کا جو کمال دکھایا اس کے صراحتاً بیان کرنے کی گنجائش نہیں۔ ان کی نئی بھرتی کی ہوئی فوج تو پہلے ہی دن کی زد و خور میں متفرق ہو گئی لہذا لڑائی کا سارا بار سادات بارہ اور ان کے سچے مددگاروں پر پڑا جن کی کل تعداد بیس ہزار بھی نہ تھی۔ مقابلے میں کہیں زیادہ فوج اور سلطنت مغلیہ کا بہترین توپ خانہ تھا اور اس نے دن بھر کی شدید خونریزی

۱۔ منتخب التواریخ جلد دوم ۹۱۸۔ مورخ اس وقت پائے تخت دہلی میں موجود تھا اور جہاں تک ممکن ہے اس قسم کی معلومات کو سرکاری دفاتر سے حاصل کرتا ہے۔

باب

اور پرشفت بھاگ دوڑ کے بعد رات کو بھی سیدوں کو چین نہیں لینے دیا بلکہ چودھویں رات کی چاندنی میں برابر ان پر گولے چلاتا رہا۔

آخر دوسرے دن وہ دلیر سردار جو میدان جنگ سے قدم ہٹانا گوارا نہ کرتے تھے چند گھنٹے کی مزید کشمکش میں یا تو مارے گئے یا زخمی اور بیکار ہو کر قید ہو گئے۔ قطب الملک اور نام نہاد بادشاہ سلطان ابراہیم بھی زندہ اسیر ہوئے تھے۔ محمد شاہ نے ان کی جاں بخشی کی لیکن عام روایت کے بموجب سید حسن علی قطب الملک کو آئندہ سال (۱۱۲۱ھ) زہر دلوادیا گیا۔

محمد شاہ کی نااہلی

بادشاہ گرسادات کے خاتمے اور محمد شاہ کے قوت و اختیار حاصل کرنے کی ملک میں عام طور پر خوشی منائی گئی۔ لیکن یہ خوشی اگرچہ بادشاہ پرستی پر نہیں بلکہ آئندہ نظم و نسق کی بہتری اور ملکی رفاه و بہبود کی امیدوں پر مبنی تھی تو اس کا انجام برنج و مایوسی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کیونکہ کسب و اورنگ زیب کا نیا جانشین درحقیقت اپنے اقبالند اجداد کی شاہانہ صفات سے عاری تھا۔ اسے اپنے عیش و عشرت کے مشغلوں میں معاملات ملک پر توجہ کرنے کی فرصت نہ تھی۔ وہ مجلس رائے شاہی کی بیگمات سے بھی زیادہ سلطنت کے حالات سے بے خبر اور اس کی خرابی کی طرف سے بے پروا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی دادی (شاہ عالم بہادر شاہ کی ملکہ) مہر پرور کی نسبت ہم جا بجا پڑھتے ہیں کہ وہ بھی اپنے مد موش پوتے کو بار بار اس خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتی تھی جس کا صریح نتیجہ زوال وادوار تھا۔

بہت سی ہمعصر تصانیف و تواریخ کے دیکھنے سے یہ توصیف ظاہر

۱۔ اس عہد کی بہت سی تاریخیں کامل یا ناقص حالت میں اب تک محفوظ ہیں اگرچہ ان کی بڑی تعداد یورپ کے کتب خانوں کے سوا ہندوستان میں نہیں ملتی۔ ایسٹ اینڈی نے اس قسم کی ساٹھ سے زیادہ ہمعصر تواریخ جمع کی تھیں جن میں زیر نظر عہد کے متعلق تاریخ ہندوستانی، تاریخ ہندی، اجوہر مہمام

ہے کہ اہل ہند بادشاہ کی اس نااہلی کا پوری طرح احساس رکھتے تھے اور نادر شاہ کے حملے نے یقیناً انہیں اس کے بُرے انجام سے بھی گویا پیش از پیش آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن ان کے ہاں جس شخصی بادشاہی کا صدیوں سے رواج پڑ گیا تھا یہ اسی کا خمیازہ تھا کہ وہ اس خرابی کا کوئی علاج نہ کر سکتے تھے۔

لیڈا امر

جیسا کہ بار بار پہلے بیان ہو چکا ہے، درحقیقت اس خرابی کا چارہ کار صرف یہی ہو سکتا تھا کہ طبقہ امرا میں سے کوئی ایک یا چند اولوالعزم امیر مل کر ایسے نااہل بادشاہ یا اس کے خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیں۔ لیکن ہم اجمالاً پہلی فصل میں لکھ چکے ہیں کہ ہندوستان کی دولت و ثروت نے خود اس طبقہ امرا کو نہایت عیش پسند اور تن آسان بنا دیا تھا اور اگر ان میں اس قسم کا انقلاب حکومت پیدا کرنے کی قابلیت تھی بھی تو کچھ باہمی رقابت اور زیادہ ترسادات کی گزشتہ ناکامی ارادوں کو پست کر دینے کے واسطے کافی تھی۔ دوسرے محمد شاہ کو کبھی کبھی سطوت بادشاہی دکھانے کا جوش آجاتا تھا اور ہم دو چار مرتبہ اس کی سیاست اور خود فوج کشی کرنے کا حال بھی پڑھتے ہیں۔ بہر حال آئندہ تیس چالیس برس تک ہمارے امیروں کی ساری کوشش و قابلیت ادنیٰ اغراض کے لیے سازش و ریشہ دوانی میں صرف ہوتے دیکھتے ہیں، اور فقط عہدہ وزارت یا سپہ سالاری ان کا بطن نظر رہ جاتا ہے حتیٰ کہ محمد شاہ کے ستائیس اٹھائیس برس (۱۱۱۱ھ) تک تخت نشین رہنے کے طویل زمانے میں، انقلاب سلطنت اور حصول بادشاہی درکنار کسی مسلمان امیر کو اپنے مقام پر علانیہ خود مختاری کا اعلان کرنے کی بھی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ تذکرہ اندرام، تاریخ احمد شاہ، بیان واقع قابل ذکر ہیں (البٹ جلد ہفتم) خاص کہ ملاحظہ ہوں صفحات ۲۱ تا ۱۴۰ ایک اور قلمی رسالہ ”واقعہ خرابی دہلی“ بھی رقم الخروف کے سامنے ہے جس میں ایک ہم عصر راوی نے نادر شاہ کے حملے کے حالات بیان کئے ہیں۔

ایک

جسارت نہ ہوئی اور اس عرصے میں ادھر تو نظم و نسق کی اندرونی حسرتیں
برپا تھیں اور ادھر حکمران طبقے کے افراد سے انتظام حکومت اور اختراک
عمل کی صلاحیت ہی رفتہ رفتہ مفقود ہو گئی۔

بادشاہ
کا محلہ

مگر غالباً ایل ہند کی اس داستان زوال وادبار کا سبب سے عبرتناک
واقعہ یہ ہے کہ اسی زمانے میں نادر شاہ کے حملے اور پائے تخت دہلی کی بربادی
نے بھی ان کے ارباب حل و عقد کو ان خرابیوں کی اصلاح پر متوجہ نہ کیا جن کی
بدولت انھیں یہ روز بد دیکھنا پڑا تھا!

ہمارے بعض ہم عصر مؤرخ اس حملے کو دربار محمد شاہی کے ایرانی امرا
کی سازش و غداری کا نتیجہ بتاتے ہیں لیکن مضموم ہوتا ہے دہلی کے لوگوں میں
اس قسم کے شبہات بہت بعد میں اس وقت پیدا ہوئے تھے جب کہ
بیرہاں الملک سعادت خاں حملہ آوروں سے جا ملا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ
ہندوستان کی سرحدوں تک نادر شاہ کے آنے کا سبب سلطنت ایران کی
اندرونی لڑائیاں تھیں۔ ان لڑائیوں کے متعلق اجمالاً اس قدر بیان کرنا
ضروری ہے کہ بارہویں صدی بھری کے آغاز میں مغربی افغانستان کے ان
قبائل میں جو مدت سے ایرانیوں کے حلقہ بگوش تھے حریت و خود مختاری
کی ایک نئی روح سرایت کر گئی تھی اور یہاں پہلے میں ان کے مشہور سردار
میرولیس نے قندھار چین کرغلزیوں کی ایک آزاد حکومت قائم کر لی تھی۔
پھر ایرانیوں کے پیہم حملوں کی ناکامی نے افغانوں کی جرات اس قدر
بڑھائی کہ انھوں نے نہ صرف ہرات و خراسان کے علاقے چین لیے بلکہ
ایران خاص کے اقطاع پر حملہ کیا اور میرولیس کے بہادر فرزند محمدود نے
تھوڑی سی فوج سے چند سخت شکستیں دے کر پائے تخت صفہان کو تسخیر کر لیا
(۱۱۲۲ھ) ایرانیوں کی ہمت بستی کے آخری مدارج تک پہنچ گئی تھی اور ان کی
اس سے زیادہ ذلت شاید کبھی نہ ہوئی ہوگی کہ شاہان صفوی کے تخت پر
آئندہ چھ سال تک غلزی چرواہے بادشاہی کرتے رہے!

آخر ملک ایران کے دن پھرے نادر قلی جو ابتدا میں نیم قزاقانہ زندگی

برسر کرتا تھا شہزادہ طہماسپ بن حسین صفوی کامعین و مددگار ہو گیا اور اسی نے اپنے ہموطنوں میں دوبارہ قومی جوش پیدا کیا۔ پھر چند سال کی مسلسل جدوجہد اور جنگی کامیابیوں سے نہ صرف ایران کو اختیار کی محکومی سے نجات دلائی بلکہ خراسان و ہرات کو بھی دوبارہ داخل سلطنت کیا اور یہی جنگی کارنامے تھے جن کے صلے میں طہماسپ کی معزولی کے کچھ عرصے بعد حکام اور فوجی سرداروں نے ایک جلسہ عام میں اسے اپنا بادشاہ منتخب کر لیا (۱۱۴۹ھ)۔

اب نادر شاہ نے اپنے قدیم دشمنوں کے سب سے پہلے اور نیز سب سے آخری مرکز پر فوج کشی کی اور ریٹے سازو سامان کے ساتھ قندھار پر حملہ آور ہوا۔ ہرات کے ابدالی یا درانی قبائل بھی جن کی اپنے ہموطن غلزیوں سے ان بن رہتی تھی اس موقع پر ایرانیوں کے ساتھ ہو گئے تھے بایں ہمہ غلزیوں نے ہمت نہ ہاری بلکہ تقریباً ایک سال تک قندھار میں قلعہ بند ہو کر نہایت سرفروشی سے جنگ کرتے رہے۔ اور ۱۱۴۹ھ میں جب یہ مستحکم قلعہ فتح ہوا تو اس وقت بھی نادر شاہ نے ایسے بہادر دشمنوں پر کوئی خاص تشدد کرنا پسند نہ کیا بلکہ تا اسکان کوشش کی کہ وہ گزشتہ عداوتوں کو بھول کر پھر ایران کے ماتحت و مددگار بن جائیں۔

لیکن غلزیوں کی یہ دلیرانہ مداخلت سلطنت مغلیہ کے حق میں نہایت ناسازگار ثابت ہوئی کیونکہ بظاہر قندھار کے اسی طویل محاصرے کے زمانے میں نادر شاہ حکومت دہلی کی خرابی اور کمزوری معلوم کرنے کا موقع ملا۔ اس نے دربار دہلی سے خط و کتابت بھی کی تھی کہ بعض افغان سردار جو مغلوں کے علاقے میں پناہ گزیں ہوئے ہیں وہاں سے نکال دئے جائیں یا گرفتار کر لیے جائیں۔ لیکن یہاں کسی نے اس کے مراسلے پر توجہ نہیں کی اور تسخیر قندھار سے فرصت ملتے ہی نادر شاہ نے اسی جیلے سے غزنی اور کابل کو بلا وقت فتح کر لیا جہاں مغلوں کی تھوڑی سی فوج رہتی تھی۔

اسی موقع پر جب ہم یاد کرتے ہیں کہ شاہ اورنگ زیب کے

باج

آخری عہد تک اس کے فرزند اور امرانہ صرف قندھار بلکہ ہرات و بدخشان کو بھی دوبارہ فتح کرنے کی آرزو اور تیاریاں کیا کرتے تھے تو اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ پچاس برس نے ہندوستان کے حکمران طبقے میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا کہ آج انہی اجداد کے جانشینوں کے دیکھتے دیکھتے خود سلطنت کا ایک صوبہ بیر دنی دشمنوں کے قبضے میں آگیا اور انہوں نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی! پھر یہ کہ صوبہ کابل درحقیقت ان دنوں سلطنت ہند کا سب سے ضروری اور مضبوط مورچہ تھا اور اس کا ہاتھ سے نکل جانا گویا آئندہ بیر دنی حملوں کا دروازہ کھل جانا تھا۔ مگر کمال حیرت و عجز کی بات ہے کہ محمد شاہی دربار میں ایک امیر نواب نظام الملک آصف جاہ کے سوائے کوئی شخص بھی اس نقصان کی اہمیت کو نہ سمجھتا اور نہ سمجھنا چاہتا تھا۔ اور گو سیدوں کے قلع قمع ہونے کے بعد نواب نظام الملک کو خطاب ”آصف جاہ“ اور پھر عہدہ وزارت دے کر بادشاہ نے قدر افزائی نیز اظہار احسان مندی میں کوتاہی نہ کی تھی، لیکن دراصل وہ اور اس کے نو دولت امیر یا خوشامدی مصاحب نواب نظام الملک سے بالطبع کجگہاتے تھے ”و در مجلس ادب باشی خود ذات معزالہ را محل می دانستند“ حتیٰ کہ اول اول جب خاندان صفوی کی مشکلات و پریشانی کا حال سنا کر آصف جاہ نے مشورہ دیا کہ یہ وقت ہے کہ حکومت ہندوستان شاہ ایران کی مدد کرے تاکہ بابر و ہمایون پر اس خاندان کے بادشاہوں کے جو احسانات ہیں ان کا عوض ہو، تو کسی نے اس قول پر اعتنا نہ کیا اور دوسری مرتبہ جب نادر شاہ کے قندھار بدخیش قادی کی اطلاع ملی اور نواب موصوف نے بادشاہ سے امر کیا کہ احتیاط کا مقتضی یہ ہے کہ اس وقت ہندوستانی افواج آراستہ اور سرحدوں کے قریب رکھی جائیں تو بادشاہی مصاحبوں نے طرح طرح سے اس کی تردید کی اور بعض نے علانیہ کہا کہ بادشاہ کو پائے تخت دہلی سے

باہر لے جانے میں آصف جاہ کی کچھ دغا نظر آتی ہے ورنہ وائی ایران کی یہ مجال کب ہے کہ ہندوستان کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔

کابل کی فتح کے بعد پھر آصف جاہ نے محض سلطنت کی رفاقت و خیر خواہی سے بادشاہ کو سمجھایا تھا کہ جب تک خود بادشاہ اس مہم پر متوجہ نہ ہوں گے کوئی امیر یا سردار ایرانیوں سے لڑنے نہ جاسکے گا اور بادشاہ نے بھی جوش میں آکر فوج کے کوچ کا حکم صادر کیا اور جنگی علم شہر کے باہر نصب کر دئے گئے تھے لیکن یہ سب جو (۱۷۵۷ء) کی گرمی کا زمانہ تھا (بیچ الاول ادا) شاہی امرا جنہیں دن کے وقت خسانوں سے باہر نکلنا ناگوار ہوتا تھا جنگی سفر کے نام سے لرز گئے اور انہوں نے بادشاہ کو جو ان سے بھی زیادہ آرام طلب تھا، پھر سمجھا بھگا کر سفر سے باز رکھا، جھنڈے تین چار چھینے تک بادی کے میدانوں میں کھڑے ہی رہے اور نادر شاہ دریائے سندھ کو عبور کر کے لاہور پہنچ گیا! اب محمد شاہ کو واقعی تردد و انتشار ہوا اور جہاں پناہ شہر سے ایک دو منزل باہر بھی لشرف لے آئے۔ لیکن پھر مصاحبوں نے اطمینان دلادیا اور جب تک لاہور فتح ہو کر نادر شاہ کے خاص درباری پر بڑھنے کی خبر نہ ملی، افواج شاہی پائے تخت ہی کی نواح میں مقیم رہیں۔

جنگ
کرنا

آخر محمد شاہ کو خطرے کا بخوبی احساس ہو گیا اور اب ہندوستانی فوج منزل بہ منزل بڑھ کر کرنال کے قریب خیمہ زن ہوئی جس سے چند میل فاصلے پر نادر شاہی لشکر آ پہنچا تھا۔ اس موقع پر جنگ کی بہترین تدبیر وہ تھی جسے آزمودہ کار آصف جاہ نے اختیار کیا۔ یعنی نہایت مستحکم مورچے بنا کر ایک دائرے میں اپنی فوجیں اتار دیں کہ توپ خانے کی آڑ میں مدافعت جنگ کریں جو یقیناً چند روز میں ایرانی حملہ آوروں کو مایوس و ناکام واپسی پر مجبور کر دیتی۔ لیکن اس طرح خود محصور ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ لشکر شاہی میں رسد رسانی کی دقت اور اجناس کی گرانی زیادہ ہو گئی۔

ب

اجتہاد سپاہی اور آصف جاہ کے دشمن امرا اسے بزدلی اور غلط رائی کا الزام دینے لگے اور آخر میں برہان الملک سعادت خاں (والی اودھ) نے پہنچکر جنگ کا یہ نقشہ ہی الٹ پلٹ کر دیا۔ یہ سردار وسط ذوقعدہ میں اپنی فوج لے کر شاہی لشکر سے آ ملا تھا اور آتے ہی اسی روز مصر تھا کہ مورچوں سے نکل کر ایرانیوں پر حملہ کیا جائے لیکن آصف جاہ نے اس کی اجازت نہ دی اور محمد شاہ بھی اتنی سمجھ رکھتا تھا کہ اس موقع پر اس نے تمام اختیارات نواب نظام الملک آصف جاہ کے حوالے کر دیئے تھے۔ بایں ہمہ دوسرے دن برہان الملک نے بلا اجازت خود ہی ایرانیوں پر حملہ کر دیا اور فوج بادشاہی کا نادان و ناتجربہ کاریہ سالار صمصام الملک بھی اپنی جمعیت لے کر اس کی مدد کو پہنچ گیا اور گھر کر مارا گیا۔ خود برہان الملک نے ہتھیار رکھ کر گرفتار ہونا قبول کر لیا۔ اس واقعے سے جیسا کہ بعض معاصر مورخ بیان کرتے ہیں اکثر لوگ اور خود بادشاہ یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ برہان الملک پہلے سے دشمن سے ملا ہوا تھا اور حقیقت میں اس طرح بادشاہی اجازت کے بغیر آتے ہی اپنے مورچوں سے نکل کر غنیم کی صفوں میں ایسے مقام پر پہنچ جانا کہ بلا وقت زخمی میں آگیا اور پھر بہت جلد ہتھیار ڈال دینا اس قیاس کو کافی تقویت پہنچاتے ہیں برہان الملک ایک ایرانی نژاد خود مطلب آدمی تھا اور بہت ممکن ہے کہ اس نے اپنے ہم وطن ہم مذہبوں کے مقابلے میں ہندوستان کے سنی بادشاہ سے بے وفائی کرنے میں تامل نہ کیا ہو لیکن اگر اس حملے اور گرفتاری کو صرف اس کے جوش تہوؤر و جلد بازی کا نتیجہ سمجھا جائے تو بھی اس میں کچھ کلام نہیں کہ گرفتار ہونے کے بعد اس نے اپنے ولی نعمت اور سلطنت ہند کے حق میں سخت بے وفائی کی اور علانیہ نادر شاہ کے ساتھ ہو گیا۔

بایں ہمہ جنگ کا ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ لشکر شاہی اپنے مستحکم

مساحت
دور فانی

مورچوں میں اسی طرح توپیں نصب کئے مقیم تھا اور ان استحکامات پر نادر شاہ کو یورش کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی اور تعویق فریقین کے لیے کمزوری اور پریشانی کا موجب تھی لہذا وہ ان شرائط پر آمادہ مصالحت ہو گئے کہ حملہ آوروں کو دریائے سندھ کے پار کا ملک اور دو کروڑ روپیہ تاوان دے کر صلح کر لی جائے۔ یہ بات صاف طور پر نہیں معلوم ہوتی کہ نادر شاہ نے برہان الملک کی اغول سے فریب کا ارادہ کس وقت کیا۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ مذکورہ بالا قرارداد کے بعد جب محمد شاہ اور اکثر ہندوستانی امیر اس کے لشکر میں دوستانہ طریق پر ملاقات کے واسطے آئے تو اس نے انھیں دغا بازی سے حراست میں لے لیا اور قزلباشوں کے چند دستوں کو لشکر شاہی، نیز دہلی بھیج کر قلعے کے شاہی کارخانوں پر اپنے پہرے لگا دیئے۔ ان قزلباشوں کی رہنمائی اور سرداری کی خدمت برہان الملک نے انجام دی۔

پھر نادر شاہ، بادشاہ اور امراء دہلی کو ساتھ لیے ہوئے پائے تخت میں آیا (ذو الحجہ ۱۱۳۹ھ) اور قلعہ شاہی میں جس قدر زر و جواہر قیمتی ساز و سامان اور تادرو بے بہا اشیاء صدیوں سے جمع تھیں قریب قریب سب پر قبضہ کر لیا۔ اتفاق سے ابھی دنوں اس کے ایرانی سپاہیوں اور اہل شہر میں ہنگامہ ہو گیا جس میں بہت سے قزلباش مارے گئے اور نادر شاہ کو قتل عام اور شہر کی تاخت و تاراج کا خداداد حیلہ مل گیا۔ یہ ظالمانہ قتل جس میں ”مردوزن، جوان و پیر، تندرست و بیمار، بچہ و معصوم“ کسی کی رعایت نہیں کی گئی کامل ”دو پہر“ یعنی آٹھ نو گھنٹے تک جاری رہا اور اس میں کام آنے والوں کا کم سے کم اندازہ تیس ہزار نفوس کیا گیا ہے۔ پھر شہر کے

۱۔ واقعہ خرابی دہلی، صفحہ ۷۳۔

۲۔ یہ خود نادر شاہ کے ملازم مرزا مہدی مؤلف نادر نامہ کا اندازہ ہے۔ بعض مصنفوں نے مقتولین کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ بتائی ہے۔ لیکن ”واقعہ خرابی دہلی“ اور دیگر قرائن سے بھی مذکورہ بالا قول قریب صحت معلوم ہوتا ہے۔

بے

ہر مکان کی تلاشی لی گئی اور جو کچھ زر نقد، زیورات یا قیمتی ساز و سامان ملا سب ایرانیوں نے لوٹ لیا۔ اس خانہ تلاشی اور زرستانی میں نہایت اہتمام دے دیے دردی سے کام لیا گیا کیونکہ نادر شاہ کو ہندوستان میں ملکی مقبوضات یا مستقل قیام کی امید نہ تھی۔ وہ ڈیڑھ دو مہینے کے بعد ہی دہلی سے واپس ایران چلا گیا (صفر ۱۱۵۲ھ) البتہ ہندوستان کے دو تہہ پائے تخت سے وہ اور اس کے سپاہی بے حساب دولت لوٹ کر لے گئے جس میں کروڑ ہا روپے کے لاثانی جواہرات، گراں بہا کپڑے اور ظروف و زیورات، ہاتھی، گھوڑے اور مختلف ساز و سامان کے علاوہ کم سے کم پندرہ کروڑ روپیہ نقد تھا۔

تیسری فصل۔ زوالِ سلطنت

نادر شاہ کے حملے نے نعل بادشاہ کی نااہلی اور مرکزی حکومت کی کمزوری کو عالم آشکارا کر دیا تھا بایں ہمہ اس وسیع سلطنت کا شیرازہ بکھرنے میں بہت دیر لگی اور اس گئی گزری حالت میں بھی، کم سے کم محمد شاہ کے جیتے جی کسی ہندوستانی امیر یا صوبہ دار کو علانیہ سلطنت معلیہ سے انحراف یا خود مختاری کا دعویٰ کرنے کی جسارت نہ ہوئی تھی کہ بعض دوسرے صوبہ داروں یا رئیسوں کی طرح نادر شاہ کے جانے کے بعد خود مرہٹوں نے، جو سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سب سے زیادہ قوی اور سرکش ہوتے جاتے تھے، بادشاہ کو باضابطہ اپنی اطاعت و ہوا خواہی کا یقین دلایا۔

۱۔ نامہ نامہ مرزا ہدی۔

۲۔ گرانٹ ڈن، تاریخ مرہٹہ، جلد اول صفحہ ۲۵۰۔

مذکورہ بالا حالات کو خاص طور پر ذہن نشین کرانے کی ضرورت ہے کیونکہ اس زمانے کے انگریز تاریخ نویس اور نگ زیب کے بعد ہی مغلیہ سلطنت کا خاتمہ منانے لگتے ہیں جو محض ان کی نافرمانی یا رقیبانہ تعصب کی ذیل ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا یہ بالکل سچ ہے کہ احمد شاہ کی نااہلی سے مرکزی حکومت میں کمزوری اور امرا کی باہمی عداوت و سازش سے نہایت بے استقلالیت پیدا ہو گئی تھی لیکن تمام تاریخی شہادتیں متفق ہیں کہ احمد شاہ کے انتقال تک (ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ) سلطنت کی ظاہری وسعت و شان میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا تھا۔ نادر شاہ کے جانے کے بعد ہی مختلف حصص ملک سے رئیس و راجا، حکام و ظہانڈرانے اور پیش کش ارسال کر رہے تھے۔ جنگی نادر شاہی تاخت و تاراج کے بعد دربار دہلی کو سخت ضرورت تھی کہ ہنگامے کے سب سے بعید صوبے میں علی وردی خاں (بہاوت جنگ) نے لڑکر سر فراز خاں سے حکومت چھین لی تھی (ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ) لیکن خود برابر بادشاہ کی اطاعت و ماتحتی کا اقرار کرتا اور کئی سال تک مقررہ مالگزاری بھی حضور میں بھیجتا رہا۔ بالفاظ دیگر اگرچہ مرکزی حکومت اسے بزور اپنا ماتحت نہ رکھ سکتی تھی لیکن خود اس نے ماتحتی سے علانیہ انحراف نہیں کیا۔ اسی طرح دکن کے صوبے محمد شاہ کی وفات تک نظام الملک آصف جاہ اول کی حکومت میں رہے اور نواب موصوف نے بادشاہ کی رفاقت و نمک حلائی میں کبھی کمی نہیں کی حالانکہ دربار میں اکثر اس کے ساتھ ناقدر شناسی کا برتاؤ ہوا۔

برہان الملک سعادت خاں نادر شاہ کے دہلی پہنچنے کے بعد ہی مر گیا تھا، اور اب اس کا بھتیجا صفدر جنگ والی اودھ مقرر ہوا تھا۔ وہ بھی احمد شاہ کے زمانے تک دربار دہلی کا امیر اور یہاں کی اندرونی سازشوں میں برابر کا حصہ دار رہا اور اس کی زندگی تک حکومت اودھ

۱۔ دیکھو ایٹ جلد ششم جس میں متعدد دہمچھ تاریخیوں کا انگریزی خلاصہ کر دیا ہے۔

۲۔ ریاض السالطین صفحہ ۳۶۵۔ سیر المتاخرین ۳۹۳ وغیرہ۔

کو علم خود مختاری بلند کرنے کی نوبت نہیں آئی۔
 البتہ مالوے اور گجرات کا تعلق مرہٹہ حملہ آوردوں نے قریب قریب
 سلطنت مغلیہ سے منقطع کر دیا تھا اور اپنی جگہ پر خود مرہٹہ ریاست کو آزاد
 سمجھنا چاہتے جس کا حال آگے آتا ہے۔ خاص پائے تخت کے قریب دیول کھنڈ
 کے پٹھان نہایت قوی اور سرکش ہو گئے تھے اور اسی طرح آگرے کے نواح میں جاٹوں
 نے شورش پیا کر رکھی تھی اور نہ صرف بادشاہی مالگزاری نہ ادا کرتے تھے بلکہ جب کبھی
 موقع ملتا دیہات و قصبات کو لوٹ لیتے تھے سکھوں کا پنجاب میں ابھرنا کچھ بعد کا واقعہ ہے
 مگر مذکورہ بالا اجالی حالات ہی کو بڑھ کر یہ نتیجہ نکالنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ محمد شاہ
 کے آخر زمانے تک صرف ان علاقوں میں سلطنت مغلیہ سے آزادی حاصل
 کرنے کی خواہش اور شورش کے آثار نمایاں ہوئے جہاں ایک ہی قوم کے
 بہت سے لوگ آباد اور جنگجوئی یا قزاقی کا فطری میلان رکھتے تھے۔ ورنہ
 جہاں کہیں طبقہ اعلیٰ کے منظم افراد کے ہاتھ میں حکومت تھی، وہاں مثل بادشاہ
 کا خطبہ و سکہ جاری تھا اور بے شبہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گودہلی کے
 تاجدار کو بزم عیش سے نکلنا گوارا نہ تھا، لیکن اگر وہ چاہتا تو اب بھی بہت
 کافی جنگی قوت فراہم کر سکتا تھا۔

جنگ سرہند

اس کا بدیر ہی ثبوت سرہند کی جنگ ہے جو محمد شاہ کے آخری ایام
 حیات میں ہوئی اور جہاں مغل سرداروں کو باہمی ناچاقی اور بری تدابیر جنگ
 کے باوجود ہندوستانی سپاہ نے افغان حملہ آوروں کو سخت شکست دی
 اور دور تک ان کا تعاقب کیا۔ لیکن اسی ضمن میں ہم کو ان حملہ آوروں
 کے سردار احمد شاہ ابدالی کے حالات پر ایک نظر ڈالنی چاہئے کیونکہ اس نے
 سرہند میں شکست کھانے کے بعد پھر ہندوستان پر کئی حملے کئے اور دربار دہلی
 کے معاملات میں اس کی مداخلت بھی (اگرچہ وہ ہمدردی سے خالی نہ تھی)
 زوال پذیر سلطنت مغلیہ کے تار و پود بکھرنے کا ایک بالواسطہ سبب
 بن گئی۔

احمد شاہ
ابدالی

ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ نادر شاہ کو فتح قندھار میں خراسان کے ابدالی

(یاد دہانی) قبائل سے بھی مدد ملی تھی جو اپنے غلڑائی ہمسایوں کے رقیب اور دشمن تھے۔ انھی اہالیوں میں سب سے معزز قبیلہ سدوزئی کا سردار احمد خاں تھا اور جب نادر شاہ اندرونی سازشوں کا شکار ہوا (۱۱۷۱ھ) تو وہی اس کے مشرقی مقبوضات کا مالک بن گیا۔ قندھار میں اس کی تخت نشینی کی رسم منائی گئی اور ایک طرف خراسان و بلخ، اور دوسری طرف سندھ، کابل اور کشمیر پر بلا وقت اس کا قبضہ ہو گیا۔ افغانی قبائل کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہو سکتی تھی کہ خود ان کا ایک ہمقوم اور لائق سردار اتنی وسیع سلطنت کا خود مختار بادشاہ ہو۔ اور سلطنت ایران یا ہندوستان میں یہ قوت نہ تھی کہ اس موقع پر وہاں کے بادشاہ اپنے مقبوضات واپس لینے کی کوشش کرتے، درحقیقت ان کی اندرونی کمزوری نے خود احمد شاہ کو ان پر چیرہ دست کر دیا اور ممالک ایران پر صرف مشہد کے قریب تک قبضہ رکھنا خود اس کی احتیاط پسندی اور مصلحت اندیشی تھی ورنہ اہل ایران اسے اور آگے بڑھنے سے بھی نہ روک سکتے تھے، قریب قریب یہی حال ہندوستان کا تھا۔ وہ حکومت جس نے مرہٹوں کے گجرات و مالوہ بلکہ آگرے تک بڑھنے اور لوٹ مار بچانے کا تدارک نہ کیا، افغانوں کو پنجاب میں بڑھنے سے کب باز رکھ سکتی تھی؟ جو کہیں زیادہ جفاکش اور دلیر یا ہی تھے اور قبضہ پنجاب کے جواز میں جھوٹی سچی بہت سی دہلیں بھی پیش کر سکتے تھے۔ غرض احمد شاہ ابدالی نے تخت نشین ہونے کے تھوڑے ہی عرصے بعد ہندوستان پر فوج کشی کی اور محض مغل امراء کی یاہمی عداوت اور کمال نااہلی کی بدولت بغیر لڑے بھڑے لاہور پر قابض ہو گیا۔

یہ ۱۱۷۱ھ کے بالکل آخری ایام کا ذکر ہے۔ اور حملہ آوروں نے دہلی کی طرف ۱۱۷۲ھ کے اوائل میں پیش قدمی کی۔ اسی زمانے میں بادشاہ کا

نہ احمد شاہ نے ملکا اپنی قوم کا نام بدل کر ”دہانی“ کر دیا تھا لیکن اکثر ہندوستانی تاریخوں میں خود اسے ”ابدالی“ ہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ای

مرض موت شروع ہو گیا تھا لہذا اپنی بجائے ولی عہد سلطنت شہزادہ احمد کو اس نے مقابلے کے لیے روانہ کیا مگر جنگ کی اصلی ذمہ داری وزیر الممالک قمر الدین خاں کے سپرد تھی اور سرسہند کی لڑائی میں درحقیقت اسی کی تدابیر نے احمد شاہ ابدالی کی ہمت پست کر دی۔ میدان میں آخری معرکہ ہونے سے پہلے ہی حملہ آور صلح پر آمادہ تھے لیکن قمر الدین خاں کی پہلی شرط یہ تھی کہ احمد شاہ ابدالی خود حاضر ہو کر مغل شہزادے کو نذر دکھائے ابدالی نے یہ ذلت قبول نہ کی اور گوتیوں کی آتش باری سے قمر الدین خاں میدان میں کام آیا لیکن اس کے فرزند معین الملک اور دیگر رفقاء نے حق نمک حلائی ادا کر دیا اور ایک خونریز جنگ میں افغانوں کو سخت شکست دی (ربیع الاول ۱۱۹۹ھ) شکست خوردہ حریف کا تعاقب کر کے نہ صرف پنجاب بلکہ کابل تک تمام ملک خالی کرانے کا یہ بہترین موقع تھا لیکن صفدر جنگ نے جو قمر الدین خاں کی بجائے سپہ سالار ہو گیا تھا۔ شہزادے کو آگے جانے کی اجازت نہ دی اور آخر کار بادشاہی منظوری سے صرف معین الملک کو ابدالی کے تعاقب اور حکومت پنجاب پر نافرزد کر کے شاہی لشکر دہلی کی طرف واپس آگیا۔ (ربیع الثانی)۔

مجاہد الدین احمد شاہ

انہی دنوں میں محمد شاہ بادشاہ نے وفات پائی (۲۷ ربیع الثانی ۱۱۹۹ھ مطابق اپریل ۱۷۹۹ء) اس کی ذاتی کمزوریوں کے باوجود ایک مہم جو بے درد مصنف کو بھی اعتراف ہے کہ ”در عہد او خلق بہ آسائش زندگی نمود و تا زمان دولتش بہر صورت سلطنت را آبرو دے و ورقے در نظر با بود..... گویا خاتم السلاطین بابر یہ است چہ بعد او سلطنت غیر از نام چیز دیگر ندارد“ کیونکہ اس کا جانشین جو مجاہد الدین احمد شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا اس سے بھی زیادہ نا اہل اور ناکارہ آدمی تھا اور جب اسی زمانے میں آصفیاء اولیٰ نے

بھی دکن میں وفات پائی (جمادی الثانی ۱۱۱۶ھ) تو کہنا چاہئے کہ قضا و قدر نے سلطنت کی وہ بازی ہی الٹ دی اور اب امراء میں بھی شہر الدین خاں یا آصف جاہ کی طرح کوئی ایسا ہوشمند و ذی اثر سردار نہ رہا جو اس ڈگمگاتی ناڈ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا۔ بادشاہ سلامت ہفتوں محسراتے باہر نہ نکلتے تھے اور قلعے کے اندرونی معاملات بھی ان کی ماں اودھم بانی اور جاوید خواجہ سرا کے اختیار میں آگئے تھے۔ باقی امیر و وزیر حسد اور خود غرضی کی بدولت ایک دوسرے کی بیخ کنی میں مصروف تھے اور ان میں کوئی اتنا قابل و ہوشیار بھی نہ تھا کہ کسی طرح اپنے درباری رقیبوں پر ہی غالب آجاتا۔ ایک اور پیچیدگی یہ پیدا ہوئی کہ نئے وزیر صفدر جنگ نے ردہ میلوں پر فوج کشی کی اور جب اپنا بس نہ چلا تو مدد کے واسطے مرہٹوں کو بلایا جنہوں نے شمال مغربی دوا آب کے تمام زرخیز علاقے پامال کر ڈالے۔ پھر انہی علیفوں کو ساتھ لے کر وہ پائے تخت میں آیا کہ اپنے درباری حریفوں کا قلع قمع کر ڈالے۔ لیکن جاوید خواجہ سرا کو دھوکے سے ہلا کر قتل کر دینے کے سوائے اس مقصد میں اسے زیادہ کامیابی نہ ہوئی اور ایک نئے حریف نواب عماد الملک غازی الدین (ثالث) نے تھوڑے دن بعد خود اس کے مرہٹہ اتحادیوں کو توڑ لیا۔ صفدر جنگ کو جس طرح بن سکا دلی سے نکل کر اپنے صوبوں میں جانا پڑا جہاں اب اسے ہم ایک حد تک خود مختار حاکم سمجھ سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ اودھ پہنچ کر زیادہ نہ جیا اور اس کی وفات (۱۱۶۴ھ) کے بعد اس کا بیٹا شجاع الدولہ اس علاقے کا وارث ہو گیا جو موجودہ اودھ سے رقبے میں تقریباً نہ چنہ تھا۔

اس اثنا میں بنگال اور دکن کے صوبہ داروں کا بھی مرکزی حکومت سے رہا سہا تعلق منقطع ہو گیا تھا جس کی تفصیل ہم آگے پڑھیں گے۔ اسی طرح پنجاب کو معین الملک ذاتی قابلیت و مستعدی کے باوجود طاقتور افغانوں کی پورش سے محفوظ نہ رکھ سکا تھا اور احمد شاہ ابدالی نے دو تین حملوں کے بعد اسے خراج گزاری پر مجبور کر دیا کیونکہ دربار دہلی سے کسی قسم کی امداد اسے

ایک

نہ ملتی تھی بلکہ صفدر جنگ رقیباً نہ حد کی وجہ سے ابدالی کے ہاتھ سے اس کی
ذلت و شکست سن کر خوش ہوتا تھا۔ الغرض جب معین الملک نے بھی
اسی زمانے میں وفات پائی (۱۱۶۶ھ) تو اس کے نابالغ بیٹے کے نام
صوبہ داری کی سند احمد شاہ ابدالی ہی نے بھیجی جس کے معنی یہ تھے کہ اب
یہ صوبہ والی کابل کی ملکیت ہے، لیکن ان واقعات سے بھی بڑھ کر
سلاطین مغلیہ کی کمزوری خود پائے تخت دہلی کے انقلابات میں نظر آتی ہے
کہ جب صفدر جنگ کو نکالنے کے بعد نوجوان غازی الدین کی خود احمد شاہ
سے ان بن ہوئی تو آخر غازی الدین ہی غالب آیا اور بادشاہ اور اس کی
فتنہ جو ماں کو گرفتار کر کے اس نے دونوں کی آنکھیں نکلوا دیں اور جہاندار شاہ
بن شاہ عالم کے ایک اور بیٹے (مرزا عزیز الدین) کو عالمگیر ثانی کے
لقب سے تخت پر بٹھا دیا (شعبان ۱۱۶۶ھ)۔

مالگیر ثانی

فارسی مورخ کے منقولہ بالا قول کے بموجب درحقیقت محمد شاہ کی
وفات سے ہندوستان میں مغلوں کی برائے نام سلطنت کا بھی خاتمہ ہو گیا
تھا۔ ممالک ہند میں مختلف ریاستیں اور قومیں حکومت دہلی سے ایسی
بے تعلق اور خود مختار ہو گئی تھیں کہ اب خاندان تیموریہ کے نام نہاد
بادشاہوں کے حالات ایک محدود و مختصر مقامی تاریخ سے زیادہ وقعت
نہیں رکھتے لیکن ایک انگریز تاریخ نویس نے اس دور کا خاتمہ پانی پت
کی تیسری جنگ (۱۱۶۶ھ) کو قرار دیا ہے اور بے شبہ عالمگیر ثانی کی تخت نشینی
سے جنگ مذکور تک تقریباً سات سال کے واقعات پائے تخت اور
حکومت دہلی کے کامل زوال و خاتمہ کا آخری مرقع پیش کرتے ہیں اور
مناسب ہو گا کہ ہم بھی اپنی کتاب کا یہ حصہ ختم کرنے سے پہلے سرسری طور پر
ان واقعات کو یہاں بیان کر دیں۔

ابدالی کا
حملہ دہلی پر

دہلی میں وزارت اور پورے اختیارات حاصل کرنے کے بعد
غازی الدین کو پنجاب پر دوبارہ قبضہ کرنے کی فکر ہو گئی تھی اور اس نے
احمد شاہ ابدالی کے قبضے کو باضابطہ تسلیم نہیں کیا تھا۔ اتفاق سے معین الملک

کی بیٹی اسے پہلے سے منسوب تھی لہذا شادی کے بہانے وہ لاہور کے قریب تک آکر یکایک شہر میں پہنچ گیا اور اپنی بیوہ ساس اور صغیر سن سالے کو حراست میں لے کر اس نے ایک اور شخص آدینہ بیگ کو اپنی طرف سے پنجاب کا صوبہ دار مقرر کر دیا۔ (رحمۃ اللہ علیہ)

یہ کارروائی گویا افغانی بادشاہ سے لڑائی مول یعنی تھی حالانکہ اگر گزشتہ دس برس میں ابدالی کی جنگی قوت وہی رہتی جو پہلے تھی تو بھی حکومت دہلی کی قوت اتنی جلد زائل ہو گئی تھی کہ اب اس میں افغان حملہ آوروں کے مقابلے کا دم نہ تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی اس قدر جلد اور یکایک ہندوستان میں بڑھا کہ غازی الدین اپنے مرہٹہ حلیفوں کو بھی کمک پر نہ بلا سکا اور سوائے اس کے کوئی چارہ کار اسے نہ سوجھا کہ احمد شاہ ابدالی سے عاجزانہ معافی مانگ کر جس طرح ممکن ہو امصالحت کر لے۔ اور گو کسی جنگ وجدال کی اب تک نوبت نہ آئی تھی لیکن حملہ آوروں نے غارت گری کا یہ موقع ہاتھ سے نہ کھویا اور شہر دہلی پر قابض ہو کر جس قدر مال و متاع مل سکا لوٹ لیا (جمادی الاول ۱۱۵۱ھ) افغانی سپاہیوں نے اس مرتبہ اہل شہر کے ساتھ ایسی سختیاں اور بے آبروئی کی تھی کہ بعض شرفا خود کشی کر کے مر گئے اور گردہ کشی نے اس بد نصیب شہر کی سکونت ترک کر دی۔

دہلی کی اس مصیبت اور بے بسی کے باوجود وزیر غازی الدین ریشہ دوانی میں مصروف تھا۔ اس کے پاس کوئی قابل اعتماد فوجی قوت نہ تھی لیکن تاریخ میں اس جیسے ذہین و عیار امیر کی بہت کم مثالیں نظر آتی ہیں جو سالہا سال تک اپنے خود غرض اور قوی حریفوں ہی کو آپس میں لڑا کر کام نکالتا رہا۔ اس موقع پر بھی اس نے احمد شاہ ابدالی کی مدد لے کر شجاع الدولہ والی اودھ پر فوج کشی کی اور اسے ڈرا دھمکا کر بادشاہی مالگزاری کے نام سے کئی لاکھ روپیہ وصول کر لیا۔ اس عرصے میں احمد شاہ ابدالی مغل بادشاہ (عالمگیر ثانی) کی بے دست و پائی اور غازی الدین کی چالاکیوں کے حالات سن کر اس سے بدگمان ہو گیا تھا لہذا واپس جاتے وقت اس نے روہیلکھنڈ کے ایک

غازی الدین
کی عیاری

باب

پٹھان سردار نجیب الدولہ خاں کو اپنی طرف سے بادشاہ دہلی کا سپہ سالار بنا دیا۔
وزیر کی بیباکانہ کارروائیوں کی روک تھام ہو جائے! اس کے جواب میں
احمد شاہ ابدالی کے رخصت ہوتے ہی غازی الدین مرہٹوں کی فوج کثیر لے کر
دہلی آ پہنچا اور نجیب الدولہ خاں کو بہ مشکل جان بچا کر وہاں سے نکلنا پڑا۔ پائے تخت
اور مغل بادشاہ کی برائے نام حکومت پھر غازی الدین دزپر کے قبضے میں آ گئی۔
مرہٹوں کی قوت اس زمانے میں انتہائے کمال کو پہنچ گئی تھی ان کے
یکجا حالات آئندہ ہماری نظر سے گزریں گے یہاں صرف یہ بتانا کافی ہے کہ
اب مغربی دکن، وسط ہند، گجرات و مالوہ پر ان کا قبضہ تھا۔ جنوبی دکن
ان کے حملوں سے محفوظ نہ تھا۔ شمال مشرق میں اڑیسہ اور جنوبی بنگالے تک
ان کی یورشیں پہنچنے لگی تھیں۔ راجپوتانے کی ریاستوں سے وہ جبراً "خراج"
وصول کرتے تھے اور اب غازی الدین کی امداد کے حیلے سے ان کا دست
غارت روہیلکھنڈ اور حکومت اودھ کے علاقوں پر بڑھ رہا تھا۔ اسی مشترکہ
خطرے نے شجاع الدولہ اور اس کے قدیم حریف یعنی روہیلکھنڈ والوں کو
باہم متحد کر دیا اور شجاع الدولہ نے دو آب میں مرہٹوں کو شکست دے کر گنگا
کے پار بھگا دیا۔ (۱۷۶۱ء)۔

مرہٹوں کا
دوڑنالی ہونا
میں۔

احمد شاہ ابدالی
سے دو غلامت

مگر مرہٹوں کے اس نقصان کی پہلے ہی کافی سے زیادہ تلافی پنجاب میں
ہو گئی تھی جہاں اب دریائے سندھ تک تقریباً تمام علاقہ ان کے زیر اثر تھا۔
شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی جلتے وقت اپنے فرزند تیمور شاہ
کو پنجاب کا صوبہ دار بنا کے لاہور میں چھوڑ گیا تھا اور اگرچہ غازی الدین کا
مقرر کردہ صوبہ دار آدینہ بیگ پنجاب کے مشرقی اور کوہستانی مقامات میں
اب تک شورش بپا کر رہا تھا اور سکھوں کو فوجی قواعد سکھا سکھا کر افغانی عمال
سے لڑا رہا تھا بایں ہمہ یہ تدابیر کچھ زیادہ کارگر نہ ہوئیں اور آدینہ بیگ نے
بھی اپنی مدد کے واسطے مرہٹوں کو بلایا۔ ان کی تعداد کثیر کی آمد سن کر تیمور شاہ
کو لاہور سے ہٹنا پڑا اور آدینہ بیگ ایک مرتبہ پھر لاہور پر قابض ہو گیا۔
مرہٹوں نے کثیر معاوضے کے اقرار پر اسے پنجاب کا صوبہ دار تسلیم کر لیا تھا۔

لیکن جب اسی زمانے میں وہ فوت ہوا (۱۱۹۹ھ) تو انھوں نے جالندھر کے اضلاع اس کی بیوہ کو دے کر خاص لاہور میں اپنے ایک مرہٹہ سردار کو صوبہ دار بنادیا۔

لیکن یہ محض ایک بے وارثہ مال سمجھ کر اس کا مالک بن جانا تھا ورنہ جب احمد شاہ ابدالی بعض اندرونی مفادات فرو کر کے پنجاب پر بڑھا تو مرہٹے جس آسانی سے قابض ہوئے تھے اسی سبب پانی سے پنجاب چھوڑ چھوڑ کر پیچھے ہٹے اور افغانوں سے ان کی پہلی لڑائی سرہند کے قریب ہوئی جہاں شکست کھا کر وہ دوبارہ دہلی کے قریب جمع ہوئے۔ اور ان کے قیام کی وجہ بھی ظاہر یہ تھی کہ احمد شاہ ابدالی سیدھے راستے کو چھوڑ کر (جس کے تمام علاقے مرہٹوں نے لوٹ کر تاراج کر ڈالے تھے) جمنائے پار اتر گیا تھا اور وہیں نجیب الدولہ خاں اور وزیر علی گڑھ کے دوسرے سرداروں نے اس سے ملاقات کی اور شجاع الدولہ سے بھی اتحاد کی گفتگو شروع ہوئی۔

مرہٹوں کی ہمتیں

اس عرصے میں غازی الدین وزیر نے عالمگیر ثانی کو اس گناہ پر کردہ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتا ہے قتل کرادیا (ربیع الثانی ۱۱۹۹ھ) اس کا بیٹا شہزادہ عالی گہر جو بعد میں شاہ عالم ثانی کے نام سے وارث تخت ہوا پہلے ہی غازی الدین کے خوف سے انکل کر بنگالے چلا گیا تھا کہ ممکن ہو تو وہاں دوبارہ اپنی حکومت قائم کرے۔ ادھر مرہٹوں کی سرہند ہی پر شکست کی خبر سن کر غازی الدین خوف زدہ ہو گیا اور اپنے مرہٹہ اتحادیوں کو تقدیر کے حوالے کر کے خود بھرتپور کے جاٹوں میں پناہ گزین ہوا جو اس زمانے میں (بھرتپور سے بلم گڑھ تک علاقے کے) خود مختار حاکم بن بیٹھے تھے۔ الغرض احمد شاہ دوبارہ جمنائے پار کو اتر کر جب یکا یک مرہٹوں کے سر پر پہنچ گیا جو دلی کے قریب مقیم تھے اور ان میں سے بہت کم مرہٹے جان سلامت لے کر فرار ہو سکے تو شہر دہلی پر بھی درانیوں کا قبضہ ہو گیا اور احمد شاہ انتظام کے لیے یہاں تھوڑی سی فوج چھوڑ کر خود دوبارہ دو آب کے علاقے میں چلا آیا جہاں سردار سانی اور شجاع الدولہ

۱۲

سے خط کتابت میں سہولت تھی۔

مذکورہ بالا پے درپے ہزیمتوں کی خبر نے دکن کے مرہٹوں میں انتقام کا جوش پیدا کر دیا۔ اسی زمانے میں نواب نظام الملک پر فتح پاکے وہ پھولے نہ سماتے تھے اور غالباً اتنی بڑی باقاعدہ فوج کبھی ان کے پاس نہ پہلے تھی نہ آئندہ ہوئی جس قدر کہ اس موقع پر آراستہ ہو کر افغان حملہ آوروں سے لڑنے شمالی ہندوستان کو روانہ ہوئی (بالاجی راؤ) کا نوجوان بیٹا وسواس راؤ فوج کا سپہ سالار تھا لیکن اصلی انتظامات اس کے چچا (سداشیو راؤ) بھاؤ کے ہاتھ میں تھے۔ سپاہ کی کل تعداد میں بہت اختلاف ہے لیکن پانی پت کی جنگ کے وقت مرہٹوں کی لشکرگاہ میں کم سے کم تین لاکھ آدمی موجود تھے جن میں سے ایک تہائی لڑنے والے سمجھنے چاہئیں جو احمد شاہ ابدالی کی افغانی اور رومیلہ فوج سے قریب قریب دگنے تھے اور ان کی توہیں بھی تعداد اور قوت میں افغانی توہیوں سے کہیں زیادہ خوفناک تھیں۔

آخر اس لاؤشکر کے ساتھ ^{۱۱۹۹} کے آخری مہینوں میں بھاؤ شمالی ہند میں آگیا اور دلی پر قبضہ کرنے میں بھی اس کو زیادہ وقت اٹھانی نہ پڑی۔ درانی جمعیت چند روز مقابلہ کرنے کے بعد ہٹ گئی شاہجہانی قلعے میں مرہٹہ سپہ سالار فاتحانہ شان و شوکت کے ساتھ داخل ہوا اور کہتے ہیں اس نے اپنے بھتیجے کو تخت پر بٹھا کر یہ اعلان کرانا چاہا تھا کہ اب مالک ہند کی شہنشاہی مرہٹہ برہمنوں کی ملکیت ہے! لیکن لوگوں کے کہنے سننے سے جنگ کے فیصلے تک اس ارادے کو ملتوی کر دیا اور پھر کرنال کی طرف کوچ کیا جہاں کنجپور سے میں درانیوں کی ایک اور فوجی جمعیت متعین تھی۔

اس عرصے میں شجاع الدولہ بہت کچھ خط کتابت کے بعد احمد شاہ ابدالی سے (انوپ شہر میں) آ ملا تھا۔ اس کی یہ شرکت بے دلی سے تھی اور اس کی قیس ہزار فوج نے جنگ میں کوئی حصہ بھی نہیں لیا تاہم

نہری جنگ
پانی پت

اس کی محض پھر ابھی فائدے سے خالی نہ تھی اور اس اطلاع نے ضرور مرہٹہ سپاہیوں کو دشمن کی طرف سے کچھ نہ کچھ اندیشہ مند کر دیا ہو گا اور جب یہ دشمن خود بڑھ کر ان سے لڑنے چلا اور جتنا کا پانی چڑھے ہوئے کے باوجود باغیت کے قریب جس طرح ممکن ہوا اسے عبور کر آیا تو معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹے مرعوب ہو گئے اور انھوں نے دریا پر روکنے یا فوراً بڑھ کر لڑنے کی بجائے پانی پیت کے میدان ہی میں اپنے خیمے ڈال دیے اور توپیں لگا کر مورچہ بندی کر لی احمد شاہ ابدالی کا لشکر ماہِ ربیع الاول ۱۱۷۱ھ (اکتوبر ۱۷۵۷ء) میں مرہٹوں کے سامنے پہنچ گیا تھا لیکن اس نے اپنی طرف سے لڑائی کی پیش قدمی نہ کی اور پہلے تو تھوڑی سی سوار فوج بھیج کر ان مرہٹہ دستوں کا سد باب کیا جو اس کے لشکر میں رسد پہنچنے نہ دیتے تھے پھر خود اس کے دستے مرہٹہ لشکر گاہ کے گرد منڈلانے لگے اور انھوں نے مرہٹوں کی رسد رسانی کے ذرائع اس طرح مسدود کر دیے کہ ان کی فوج میں فاقہ کشی کی نوبت پہنچ گئی، آخر بھاؤ نے مجبور ہو کر فیصلہ کن جنگ کا ارادہ کر لیا اور ۶ جمادی الثانی ۱۱۷۱ھ (۶ جنوری ۱۷۵۷ء) کے دن پانی پت سے چند میل مشرق میں نہایت خونریز لڑائی ہوئی۔ مرہٹے جان سے ہاتھ دھو کر حملہ آور ہوئے تھے اور ان کی تعداد بھی کہیں زیادہ تھی لیکن پہلا دیلا روکنے کے بعد جب غنیم نے قلب اور میسرے کی فوج سے ایک ساتھ حملہ کیا تو لڑائی کا رنگ بدل گیا اور وسط میں سمٹتے ہی احمد شاہی توپ و تفنگ نے ان کی بیوستہ صفوں میں توہمکہ ڈال دیا۔ ان کے بڑے بڑے سردار یعنی بھاؤ اور وسواس راؤ) اسی مقام پر مارے گئے اور وہ بہت جلد میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ فتح مندوں نے دور دور تک لتاقب کیا اور مشہور ہے کہ مرہٹوں کے تقریباً دو لاکھ آدمی اس لڑائی میں مارے گئے۔

باب

نئی طاقتیں

پہلی فصل :- مرہٹوں کا فروغ

میدان کرنال و پانی پت کی پہلی لڑائیاں ہندوستان میں کسی نئے خاندان کی بہتر و قوی تر بادشاہی کا افتتاح کرتی ہیں۔ لیکن یہ آخری لڑائی اہل ہند کی مرکزی سلطنت کا ایسا خاتمہ ثابت ہوئی جس کے بعد پھر اہل ہند خود تمام ممالک ہند میں کوئی متحد اور مرکزی حکومت نہ قائم کر سکے اور خود احمد شاہ ابدالی کے دل میں اگر اس قسم کا ارادہ تھا بھی تو اس کے مہم وطن سپاہیوں نے رفاقت نہ کی اور اسے مجبوراً صوبہ پنجاب پر اکتفا اور دہلی سے دو تین ہی مہینے میں مراجعت کرنی پڑی۔ شاہ جہاں کے اس ویران شدہ دار السلطنت میں ضہرۂ عالمی گہر پسیر عالمگیر ثانی کی بادشاہی کا اعلان کر دیا گیا تھا جو باب کے مرنے کے بعد (شاہ عالمگیر ثانی کے لقب سے) صوبہ بہار کے ایک مقام پر پٹنے میں تخت نشین ہوا (جمادی الثانی ۱۱۱۶ھ) لیکن ظاہر ہے کہ یہ محض رسم قدیم کو پورا کرنا تھا

ورنہ بہار و بنگال میں شاہ عالم کی بیہوشی کا کامیوں نے اس بات کا بھی امکان باقی نہ رکھا تھا کہ وہ کم سے کم شمالی ہند ہی کا فرماں روا ہو جائے گا۔

سلطنت ہندوستان کے تازہ ترین آرزو مند سداشیو (بھادرا) کا وہ سر ہی نہ رہا جس میں سلطنت کی آرزو تھی۔ پانی پت کے ”مقتل“ میں اس کی لاش بے سر کی ملی اور بہت دن تک شبہ رہا کہ یہ لاش اسی کی تھی یا کسی اور کی؟

شمالی یا جنوبی ہند کی کسی طاقت میں نہ یہ قابلیت تھی نہ ہوس کہ سلطنت تیموریہ کی جگہ لینے کا تہیہ کرتی غرض نئے نئے خود سرگردہ پیدا ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ ممالک ہند کا سیاسی شیرازہ پھر بچھ گیا اور دستور کے مطابق جا بجا نئی ریاستیں یا قومیں خود مختار ہو گئیں اور تقریباً نصف صدی تک سارے ملک میں اسی طوائف الملوک کی کا دور دورہ رہا۔ ان ریاستوں کے مفصل حالات لکھنے کا یہ محل نہیں ہے اور جہاں تک ممکن ہو ہم ممالک ہند کی مجموعی حالت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، بایں ہمہ اس باب میں اس قسم کی بعض نوخیز اور بڑی ریاستوں کا علیحدہ علیحدہ اجمالاً ذکر کرنا پڑے گا تاکہ انگریزی تاجروں کی آمد اور آئندہ تمام ممالک ہند پر تسلط پانے کے واقعات سمجھنے میں آسانی ہو۔

مرہٹوں کی ریاست

سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں دکن کی مرہٹہ قوم کو جو سیاسی قوت حاصل ہوئی اس کا بانی عام طور پر سیواجی کو سمجھا جاتا ہے لیکن تاریخی لحاظ سے وہ مرہٹوں کی قومی تاریخ کے سلسلے میں ایک بیج کی کڑی ہے ورنہ اس قوم کو سب سے پہلے ملک عنبر حبشی نے ”یا کہنا چاہئے کہ احمد نگر و بجاپور کی جنگی ضرورتوں نے“ سپہ گری سکھائی اور خود مرہٹوں میں سامراجی (بھونلہ) پہلا شخص ہے جس نے اس تعلیم سے فائدہ اٹھا کر اپنے ہم قوم سپاہیوں کو ایک ممتاز فوجی جمعیت میں منظم کیا اور اپنے واسطے تاریخ ہندوستان میں جگہ نکال لی۔ بے شبہ سیواجی کی پورش و دلیری نے دور دور کے مرہٹوں میں جنگی جذبات پیدا کر دیے اور ان میں قومی اتحاد کی روح پھونک دی، جو اس کا بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن خود اس کا طرز عمل کسی باقاعدہ اور مستقل حکومت کے مقابلے میں کامیاب

ب

نہ ہو سکتا تھا اور قرائن کہتے ہیں کہ راجہ جے سنگھ اور دلیہ خاں کی تادیبی انہم (سندھ) نے اس بات کا خود سیوا جی کو یقین دلادیا تھا چنانچہ آئندہ اس کی تشریف آفر تاخت و تاراج میں فی الجملہ کمی ہوگئی اور وہ اپنے علاقے میں ایک باقاعدہ ریاست قائم کرنے پر متوجہ ہو گیا، لیکن یہ ریاست بھی کوئی خاص قوت و پائیداری حاصل کرنے نہ پائی تھی کہ سینھاجی کی شوریدہ سری نے مغلوں کے ہاتھ سے اس کا خاتمہ کرادیا اور مغل بادشاہ (اورنگ زیب) کے طویل قیام دکن اور کارگزار انتظامات نے مرہٹوں کی نیم آزادانہ حیثیت باقی نہ رہنے دی۔

سینھاجی کے فرزند ساہوجی نے اورنگ زیب کے لشکر میں پرورش پائی اور گو اس کی حیثیت ایک شاہی قیدی کی سی تھی مابین ہمہ مغل بادشاہ کی مہر و عنایت کی بہت سی روایتیں فارسی اور نیز مرہٹی تحریروں میں محفوظ ہیں کہ وہ ساہو کے ساتھ اپنے خاندانی لڑکوں کا ساتھ کرتا تھا، اور غالباً یہ بھی ایک وجہ تھی کہ جب اسے باج گزاری کی شرط پر مغلوں نے رہائی دی تو وہ خود اس شرط کی خلاف ورزی کرنی نہ چاہتا تھا لیکن آئندہ ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ مرہٹوں کی حکومت اول اول بالقوہ اور آخر کار علانیہ ہندوستان کی ایک خود مختار و قوی سلطنت بن گئی۔

پیشوا کا
اقتدار

یہ اہم تغیر یعنی پہلے جبراً دے قاعدہ اور پھر باقاعدہ حکومت و بادشاہی کرنے کا شعور مرہٹوں میں بہت کچھ ساہوجی کے ان برہمن وزیروں کی محنت و ذہانت کا نتیجہ تھا جو ”پیشوا“ کے لقب سے مشہور ہیں۔ ابتدا میں یہ عہدہ دار دوسرے درجے کا وزیر سمجھا جاتا تھا لیکن جب بالاجی (دشوناٹھ) پیشوا مقرر ہوا مسئلہ تو اس کے ذاتی رسوخ سے رفتہ رفتہ یہ منصب سب سے اعلیٰ اور آخر میں موروثی اور اصلی حاکم کے مترادف ہو گیا۔ بالاجی نے راجہ ساہو کے بہت سے اندرونی جھگڑے رفع کئے اور اسی ضمن میں امیر الامرا سید حسین علی خاں سے چوتھ اور سرولیس کمہی کے متعلق وہ سند حاصل کی جس کا پچھلے حصے میں ذکر آچکا ہے۔ اس سند کی تصدیق محمد شاہ کے عہد میں ہوئی (سندھ) اور اس نے اول تو ساہو کو تاراج بانی اور اس کے فریق کے مقابلے میں مرہٹوں کا سکہ سردار و زمین

بنادیا اور دوسرے وصول مالگزاری کی غرض سے بالاجی کو ایک وسیع محکمہ قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کے ماتحت عمال مالک دکن کے قریب قریب ہر ضلع میں نظر آنے لگے اور اس واقعے نے نہ صرف مرہٹہ حکومت کی وقعت بلکہ مرہٹوں میں خود پیشوا کا اعزاز و اقتدار بڑھا دیا۔

بالاجی کے بعد اس کا بیٹا باجی راؤ پیشوا ہوا (۱۷۶۰ء) وہ اپنے باپ سے کہیں زیادہ بلند حوصلہ اور جنگجو سردار گزرا ہے اور اگر (سیواجی کے بعد) اسے مرہٹہ قوم کا سب سے بڑا شخص کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ وہ اپنی فراست سے یہ بات بخوبی سمجھ گیا تھا کہ سلطنت مغلیہ کی جڑیں گھن لگ چکا ہے اور ایک عالمگیر اصول کے مطابق کسی نئی قوم کے ابھرنے کا ٹھیک وقت وہی ہے جبکہ کوئی دوسری قوم حالت زوال میں ہو اور نئے لوگ کمال مستعدی کے ساتھ اس کی گرتی دیوار سے اپنی عمارت کے لیے سنگ و خشت جمع کر لیں۔ یہاں دوبارہ یہ وضاحت کر دینی مناسب ہوگی کہ آج جب کہ سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہوئے مدت گزر چکی ہے اس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں معلوم ہوتا کہ محمد شاہ کے عہد ہی سے اس سلطنت میں زوال پیدا ہو گیا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ خود محمد شاہ کے معاصرین بھی اس بات کا یقین رکھتے تھے، یا یہ کہ وہ سلطنت کی روز افزوں خرابی کو اسی وقت سے ناقابل اصلاح سمجھنے لگے تھے، اس کے برعکس جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، محمد شاہ کی زندگی تک ہندوستان کے ذی اثر لوگوں پر بغل بادشاہ کا بہت کافی رعب رہا اور مرہٹوں کی قوم کو اس کی زندگی میں علانیہ خود مختاری کا دعوے کرنے کی ہمت نہ ہوئی البتہ یہ پہلی قوم تھی جو پیشوا کی سرکردگی میں مرکزی سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں گھس پڑی اور جہاں گھنٹاؤں کی قابض ہو گئی۔

گجرات اور مالوے کے صوبہ داروں نے مرکزی حکومت سے اختلاف اور اپنے ذاتی رقبوں سے جھگڑوں کی وجہ سے مرہٹوں کو امداد کے واسطے خود طلب کیا اور وہاں بھی چوتھے وصول کرنے کا حق انھیں دے دیا تھا لیکن اول تو حکومت دہلی نے ان کے اس حق کو باضابطہ تسلیم نہیں کیا دوسرے نواب نظام الملک آصفیہ کے

۱۷

خوف سے وہ بہت دن تک اس "حق" سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے تا آنکہ نواب آصفیہ نے اس خیال سے کہ کہیں بالاجی شہنشاہ دہلی سے حکومت دکن کی کوئی سند حاصل کر لے بالاجی سے مصالحت کر لی جو ایک طور پر مرہٹوں کے لیے اجازت ہو گئی کہ وہ نربدا کے شمال میں تاخت و تاراج کریں۔^{۳۲} ان صوبوں میں چوتھ وصول کرنے کے واسطے حسب دستور باجی راؤ نے چند مرہٹہ سردار مقرر کئے تھے اور انہی کے خاندان گائیکوار سندھیا اور بلکر کے نام سے اب تک گجرات و مالوہ کے اقطاع پر حکمراں ہیں، مرہٹوں کا چوتھا مشہور خاندان بھونسلہ پہلے سے برابر میں راجہ ساہو کی نیابت کرتا تھا باجی راؤ کی اس خاندان کے سردار رکھو جی بھونسلہ سے مخالفت تھی اور اس نے پیشوا کو دو ایک مرتبہ سخت زک بھی دی۔

آئندہ چند سال تک باجی راؤ کچھ اندرونی جھگڑوں میں اور کچھ دیر باجی سے خط کتابت میں مصروف رہا کہ گجرات و مالوہ میں چوتھ وصول کرنے کی باقاعدہ سند حاصل کر لے، اس میں بلا دقت کامیابی کی امید اس لیے تھی کہ ان دنوں خان دوراں خاں اور ایرانی امرا کا دربار محمد شاہ میں بہت رستم ہو گیا تھا اور یہ لوگ توراتی امیروں کی رقابت میں چاہتے تھے کہ ممکن ہو تو مرہٹوں سے مصالحت کر کے انہیں نواب آصفیہ سے لڑا دیں جو توراتیوں کا مسلمہ سرگروہ تھا اور ناعاقبت اندیش خان دوراں خاں (وزیر جنگ) کا محمود، چنانچہ دہلی کے یہ امرا دکن کے صوبوں میں بادشاہ کی طرف سے مرہٹوں کو ایک عشر کے بجائے ایک خمس ("سردیش پانڈی گری") کا حق نیز راجپوتانے کی ریاستوں سے چوتھ وصول کرنے کی اجازت دینے پر آمادہ ہو گئے لیکن باجی راؤ کا اصلی مطالبہ گجرات اور مالوہ کے متعلق تھا اور نواب آصفیہ کو حکومت دہلی کا مخالف سمجھ کر وہ بادشاہ کی فوجی قوت کو بہت حقیر سمجھنے لگا تھا۔ لہذا اس نے

۱۔ گرانٹ ڈف کا بیان ہے کہ اس کے متعلق نواب ننگار الملک اور میٹھا کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا تھا (جلداول صفحہ ۴۴) لیکن مولف نے اس کی مفصل شرائط تحریر نہیں کیں نہ اپنے اند کا حوالہ دیا۔

اپنے مطالبات میں کوئی کمی نہیں کی اور یہ سن کر کہ دہلی میں بھی مقابلے کی جنگی تیاریاں ہو رہی ہیں وہ ہندو میل کھینڈ سے آگرے کی طرف بڑھا اور ایک فوج کو اس نے جھنڈا کے پار بھیج دیا کہ دو آب کا علاقہ تاراج کر دے اس فوج کو برہان الملک سعادت خاں صوبہ دار اودھ نے سخت شکست دی اور اودھ مرہٹوں کی اصلی فوج سے مقابلہ کرنے کے لیے وزیر الممالک قمر الدین خاں اور خانہ دارا خاں آگرے کے آگے تک بڑھ آئے (۱۷۶۴ء) باجی راؤ نے مقابلے سے پہلو تہی کی اور پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں سے چکر کھا کر ایک بیک پائے تخت دہلی کے قریب آنکلا۔ خاص شہر پر اسے پھر بھی حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور حوالی میں صرف کچھ ہندو اس کی غارت گری کا شکار ہوئے جو شہر کے باہر کالکا کے مندر میں تھوار منسلنے اور پوجا کرنے آئے تھے۔ پھر بادشاہی فوجوں کا اپنے تعاقب میں آنا سن کر وہ بجلت میوات کے راستوں سے دکن واپس ہو گیا (۱۷۶۵ء) اور اس ناکامی نے غالباً اسے یقین دلادیا کہ حکومت دہلی میں اپنے نمیبہ صوبوں کا انتظام درست رکھنے کی صلاحیت باقی نہیں ہے تاہم نعل بادشاہ کی فوجی قوت پر خاص اس کے مرکز میں حملہ کرنا جو کھوں سے خالی نہیں، چنانچہ آئندہ نادر شاہ کے حملے اور اہل دہلی کی سخت پریشاں حالی کے باوجود باجی راؤ نے چینل سے اوپر کوئی حملہ نہیں کیا۔ اس کی باقی زندگی جنوبی ہند اور مالوے کی لڑائیوں میں صرف ہوئی اور ہر چند اپنی وفات کے وقت (۱۷۶۷ء) وہ بہت سی مشکلات اور پریشانیوں میں گرفتار ہو گیا تھا، لیکن سچ یہ ہے کہ مرہٹوں کو صحیح معنی میں حکومت و سلطنت کے راستے پر اسی نے ڈالا اور اسی کی اولوالعزمی کی بدولت وہ قزاقوں کے بے ترتیب گروہ کے بجائے ہندوستان کی سب سے ترقی پذیر قوم بن گئے اسی کے ساتھ یاد رکھنا چاہیے کہ مرہٹوں کے اصلی رئیس کا پیشوا کے سامنے محض برائے نام راجہ رہ جانا، ایسی اندرونی خرابی تھی جس نے ان کی قوم کی مجموعی قوت کو زیادہ عرصے تک مستقل اور متحد نہ رہنے دیا، ان کے

ب

مختلف سردار جس قدر زیادہ طاقتور ہوتے گئے اسی قدر اپنی صدر حکومت کے قابو سے باہر ہوتے گئے اور حق یہ ہے کہ اس خرابی کے ذمہ دار ایک حد تک یہی برہمن پیشوا تھے جنہوں نے حکومت کے اصلی دارش کو رفتہ رفتہ عینو معطل کر دیا تھا۔ بہر حال اب نہ صرف پیشوا بلکہ خود مرہٹہ قوم کے آئندہ اقتدار و ترقی کا انحصار اس پر تھا کہ جہاں تک ممکن ہو مرہٹہ سرداروں کی اندرونی تفریق پر ظاہری اتحاد و مصالحت کا پردہ اٹھا رہے اور اس کی تدبیر یہی تھی کہ وہ بیرونی یا غیر طاقتوں سے جنگ و جدال میں مصروف رہیں، ہر اک مرہٹہ حاکم رگھوجی بھونسلہ تو باجی راؤ کے بعد بھی پیشوا کی حکومت سے آزاد ہی رہا بلکہ اس کی بجگی قوت بڑھتی گئی اور چند حملوں کے بعد وہ بطور خود گونڈوانہ اور اڑیسہ کے اکثر اضلاع پر قابض ہو گیا، لیکن اکثر مرہٹہ سردار بیرونی لڑائیوں میں تیسرے پیشوا بالاجی یا اس کے سپہ سالار سداسیو (بھاؤ) کے ساتھ رہے اور اسی کے زمانے میں صوبہ مالوہ کی چوتھ کی سند شاہی بھی مرہٹوں کو حاصل ہو گئی (۱۱۵۱ھ) جس کے واسطے باجی راؤ بہت روز تک جدوجہد کرتا رہا تھا۔

مرہٹوں کا فاضل
شالی ہند میں

یہ سند محمد شاہ نے بالاجی کو اس خدمت کے صلے میں دی تھی کہ اس نے بنگالے پر رگھوجی بھونسلہ کی یورش روکنے میں بادشاہی صوبہ دار مرزا محمد علی فردوس کو قوجی مدد دی اور خود اپنے ہمعوموں سے لڑ کر انھیں بنگالے سے خارج کر دیا۔ لیکن اس واقعے سے جہاں مرہٹوں کا اندرونی نفاق ظاہر ہوتا ہے وہی کے ساتھ دہلی کی صدر حکومت کی کمزوری بھی آشکارا ہے کہ وہ اپنے بعید صوبوں کو بچانے کے واسطے مرہٹوں کی دست نگر ہو گئی تھی اور جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں محمد شاہ کے انتقال کے بعد تو خاص پائے تخت کے تنازعات میں وہ مدد کے واسطے طلب کئے جاتے تھے اور دھرم گن میں انہی دنوں ایسے واقعات پیش آئے جن سے پیشوا کو مزید قوت اور شمالی ہند کے معاملات میں دخل دینے کی فرصت حاصل ہو گئی۔

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ اول تو ۱۱۶۱ھ میں نواب نظام الملک آصفیاء اول نے انتقال کیا اور نواب ناصر جنگ کی سند نشینی کے ساتھ ہی کرناٹک

میں وہ لڑائیاں چھڑ گئیں جن کی وجہ سے دکن کی یہ اسلامی طاقت عرصے تک اندرونی خلفشار میں مبتلا رہی اور مرہٹوں کو اس خطرناک ہمسائیگی کی طرف سے کوئی خاص اندیشہ نہ رہا، دوسرے پہلو پر راجہ ساہو نے لاؤڈ وفات پائی اور ہر چند پہلے اس کی بیوہ اور بعد میں تارا بائی نے بہت کچھ کوشش و سازش کی کہ اس موقع پر پیشوا کا زور توڑ دیا جائے لیکن اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی اور آخر کار بالاجی اپنے سب حریفوں پر غالب آگیا اور اس نے تارا بائی کے پوتے رام راجا کو ساہو کا جانشین اور مرہٹہ حکومت کا براہ نام راجہ تسلیم کر دیا پھر اس نے رگھوجی جھوندک کو بھی مصالحت سے اور داماجی گائیکوآر کو شکست دے کر آخر میں اپنا سامع بنالیا تھا اور اسی اندرونی انتظام کے بعد اب مرہٹے تازہ قوت کے ساتھ مالوے اور راجپوتانے کے علاقوں میں چوتھ و حمل کر رہے تھے۔

(۱۱۶۹-۱۱۷۵ء)

بھی زمانہ ہے جبکہ مرہٹوں کی روز افزوں طاقت سے غازی الدین ثالث (اعداد الملک) کو فائدہ اٹھانے کا خیال آیا اور اس نے عالمگیر ثانی اور اس کے امیر الامرا نجیب الدولہ کے مقابلے میں مرہٹوں کو اپنی مدد کے واسطے طلب کیا اور اسی سلسلے میں وہ آدینہ بیگ خاں کی مدد کے نام سے پنجاب میں بھیج گئے جس کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے یہ مرہٹوں کے انتہائی عروج کا وقت تھا اور بے شبہ اگر پنجاب پر قبضہ کر کے وہ احمد شاہ ابدالی سے جنگ ہول نہ لیتے تو غالباً شمالی ہند کے دوسرے علاقوں پر بہت جلد ان کا اثر قائم ہو جاتا، اسی طرح دکن میں ایک ہی معرکے نے ان کو چیرہ دست کر دیا تھا (جنگ اوڈگیر ۱۷۸۱ء) اور نواب صلابت جنگ کو مجبور ہو کر نہ صرف خاندیس بلکہ دولت آباد و بیجا پور کے اقطاع بھی پیشوا کے حوالے کرنے پڑے تھے جو صوبہ دار دکن کی انتہائی کمزوری کی دلیل تھی۔ اگر ان کامیابیوں نے مرہٹہ سرداروں کے دل میں غور و خوض نہائی کے جذبات پیدا کر دیے تو یہ کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ ملکی مقبوضات کے ساتھ ان کے ہاں یاد شاہی کے لوازم اور ساز و سامان میں بھی نمایاں اضافہ ہو رہا تھا بے قاعدہ جگہوں اور رہزن گروہوں کے بجائے اب پیشوا کے تحت میں ایک

جنگی انت
اور اس کے
نتیجے

۱۰

باقاعدہ اور تنخواہ دار فوج تھی جس میں ابراہیم خاں گارودی کے وہ دس ہزار سپاہی خاص طور پر مشہور ہیں جنہیں فرانسیسیوں کے طرز پر قواعد جنگ سکھائے گئے تھے اور جو اسی زمانے میں نواب صلابت جنگ کی ملازمت چھوڑ کر حکومت یونا کے نوکر ہو گئے تھے اسی طرح پیشوا کے توپ خانے میں اب اتنی توپیں تھیں کہ ہندوستان کی اور کسی طاقت کے پاس نہ ہوں گی۔

بائیں ہمہ جب اس جنگی قوت اور ساز و سامان کی سب سے بڑی آزمائش کا وقت آیا تو مرہٹوں کی نااہلی یا کہنا چاہئے کہ اس زمانے کے اہل ہند کی نااہلی کا راز فاش ہو گیا کہ نہ ان میں جانباز و مستقل مزاج سپاہی تھے نہ ایسے کاروان سپہ سالار جو ایک دلیر و ہوشیار دشمن سے لڑ کر فتح حاصل کر لیتے۔ کم تعداد اور کم سامان افغانی حریفوں سے پانی پت کے میدان میں جو شکست انھوں نے کھائی وہ کئی اعتبار سے تاریخ میں اہل ہند کی سب سے بڑی شکست ہے جب رفتہ رفتہ اس کی تفصیلی خبریں دکن میں پہنچیں تو مرہٹی علاقوں میں ہشک کوئی گاؤں ایسا ہو گا جہاں پانی پت کے مقتولین کا ماتم بپا نہ ہو گیا ہو، خود پیشوا کی نسبت عام خیال ہے کہ اسی قوی معیبت اور جوان بیٹے و سواس راؤ کے غم نے جو اس لڑائی میں مارا گیا تھا اس کی جان لی اور وہ جنگ پانی پت کے چند مہینے بعد مر گیا (۱۷۶۱ء) نیز یہی شکست تھی جس نے مرہٹوں کے سیلاب کو عین طغیانی کے وقت شمالی ہند میں بڑھنے سے روک دیا اور کم سے کم چند سال کے واسطے چنبیل کے شمال میں ان کی حکومت کا نشان باقی نہ رہا۔

لیکن اس شدید نقصان و ذلت کے باوجود یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ پانی پت کی اس لڑائی نے مرہٹوں کی قوت بالکل توڑ دی۔ اس کے برخلاف ہم انھیں آئندہ تقریباً نصف صدی تک ہندوستان کی ریاستوں میں سب سے طاقتور پاتے ہیں، اپنے ملکی حریفوں سے ان کے دہنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی

۱۰ مرہٹوں کا یرغے نام راجہ متارا کے حملات ہی میں نظر بند رہا لیکن ۱۱۱۳ھ سے پیشوا کا مستقر بنی اہلی دارالحکومت پونا بن گیا تھا۔

کیونکہ انھوں نے اپنے ہم وطنوں سے نہیں بلکہ ایک بیرونی دشمن سے شکست کھائی تھی جو فتح حاصل کرنے کے بعد ہندوستان سے واپس چلا گیا اور پانچ سات برس کے بعد ہی مرہٹہ سوا جینبل اتر کے پھر پھر پیور د آگرے کی نواح میں نظر آنے لگا اور جب مغل بادشاہ شاہ عالم (ثانی) مشرقی صوبوں سے مایوس و ناکام اپنے پائے تخت میں واپس آیا (۱۱۹۱ء) تو رومیلکھنڈ اور شمال مشرقی راجپوتانے کے سرکشوں کو زیر کرنے میں اسے مرہٹوں ہی سے مدد ملی جن کو رفتہ رفتہ دربارہلی میں دوبارہ رسوخ حاصل ہو گیا اور آخر میں سندھیا کے ذریعے پیشوا کو تمام ہندوستان میں بادشاہ کی نیابت کی سند حاصل ہو گئی (۱۱۹۸ء)۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ سند یا فرمان شاہی عملاً کچھ زیادہ وقیع نہ تھا۔ بے شبہ ہندوستان میں مغل بادشاہ کا ابھی تک سب لوگ ادب و احترام کرتے تھے اس کے اجداد نے اہل ہند میں سیاسی اتحاد کا جو احساس پیدا کر دیا تھا اس کا فطری مقتضی تھا کہ ان کی آنکھیں تمام ممالک ہند کا کوئی مرکز و احد تلاش کریں اور یہ مرکز اگر کہیں نظر آتا تھا تو وہ اسی مغل بادشاہ کی ذات تھی۔ لیکن سیاسی دنیا میں عمدہ جذبات اور محض رہی اطاعت سے کوئی حکومت نہیں چلتی، شاہ عالم کی براہ راست حکومت صرف مغربی دوا آب۔ رومیلکھنڈ، شمالی مشرقی راجپوتانہ، غرض دلی سے تقریباً دو سو میل کے فاصلے تک محدود تھی۔ اور اس میں بھی روپے اور جاٹ جا بجا بغاوت و سرکشی کرتے رہتے تھے۔ تلج کے ادب پر پنجاب کا صوبہ پہلے ہی افغانوں کے تحت میں آگیا تھا اور جب ان سے چھٹا تو وہاں سکھوں کی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔ مشرقی دوا آب میں والی اودھ کی حکومت تھی اور اس کا بادشاہ سے بس اتنا ہی تعلق رہ گیا تھا کہ اب تک اس کا سرکاری لقب "نواب دزیر" تھا اور نہ حکومت کے اندرونی انتظام میں اس کو بالکل آزاد سمجھنا چاہیے۔ باقی جنوب میں مدت سے مغل بادشاہ کی سرحد دریا گئے چنبل بن گیا تھا جس کے آگے مرہٹوں یا مقامی رئیسوں کا راج تھا۔

لہذا ہندوستان کا شہر راجپوتانہ و بومیشی شہادت دیتا ہے کہ اگرچہ تمام جنوبی ہند شاہ عالم کی حکومت سے آزاد ہو چکا تھا لیکن ہنوز اس کا ہندوستانی تھا کہ ہندوستان میں کسی رئیس و راجہ کو علانیہ "بادشاہ" کہنا اقباحتیا کرنے کی جرأت نہ تھی۔ (زندیہا تہذیبیہ ۱۹۰۶ء)

باب
مرہٹوں
کا زوال
اور انتشار

انغرض ایسے بادشاہ سے اگر نیابت کی سند ملی بھی تو وہ کچھ بہت مفید مطلب نہ ہوتی تھی دوسرے یہ سند جو پیشوا کے نام پر حاصل کی گئی تھی اس سے جو کچھ نفع ممکن تھا وہ خود مادھو جی سندھیا اٹھانا چاہتا تھا اور گو دربار دہلی میں وہ اپنے آپ کو پیشوا کا ماتحت و قائم مقام ظاہر کرتا تھا مگر حقیقت حکومت یونان سے اس کا تعلق محض سیاسی اور ذاتی اغراض پر مبنی تھا ورنہ بجائے خود اس کے مختار کامل ہونے میں کوئی کسر نہ رہی تھی، شمالی مالوے اور نواح دہلی میں جو مرہٹہ عامل اور مرہٹہ فوجی دستے متعین تھے وہ بھی براہ راست سندھیا ہی کے ملازم تھے اور حکومت یونان کو ان کے معاملات میں کوئی دخل نہ تھا۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ گڈی کے اصلی وارث کو بیکار بنانے کے برعکس مرہٹوں کا حکومت پر قابض ہو جانا مرہٹہ ریاست کی بنیادی کڑی تھی اور دوسرے پیشوا ہی کے زلمے میں اس کے بے نتائج کا ظہور ہونے لگا تھا، ایسکین بالاجی پیشوا کی وفات کے بعد جب اس کے بھائی رگھو ناکھ راؤ یا رگھو بانی حکومت پر خود قبضہ جمانا چاہا اور اس میں اور بالاجی کے بیٹوں میں کشاکش ہوئی تو پیشوا کے رہے ہیں اقتدار میں بھی کمی آنے لگی اور چوتھے پیشوا کے بعد یہی خانگی نزاع سخت نقصان رساں بن گئی اور مرہٹوں کے مختلف طاقتور سردار یونانی مرکزی حکومت سے قریب قریب آزاد ہو گئے، اس طرح سچ پوچھئے تو مادھو راؤ (جو تھے پیشوا) کے مرتے ہی مرہٹہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تھا اور گوا بھی تک حکومت یونانی بیرونی لڑائیوں میں

لے اس بگڑے پیشواؤں کا شجرہ نسب پیش نظر رکھنا مفید ہوگا:-

(۱) بالاجی وشو ناکھ

(۲) باجی راؤ (۱۱۲۲ تا ۱۱۵۳)

(۳) بالاجی راؤ (تا ۱۱۰۳)

نسواس راؤ (۴) مادھو راؤ (تا ۱۱۵۲) (۵) نرائن راؤ (تا ۱۱۵۳) (۶) رگھو ناکھ راؤ (گھو بانی) تا ۱۱۲۳

(۷) مادھو راؤ نرائن (۱۱۴۵ تا ۱۱۷۱) (۸) باجی راؤ (معزولی) ۱۱۳۳

دوسرے مرہٹہ سردار بھی شریک و مددگار ہو جاتے تھے لیکن اول تو اس امداد میں اگر خود غرضی نہیں تو خود مختاری کی شان ضرور تھی دوسرے خود مرکزی حکومت میں یہ قوت و قابلیت نہ رہی تھی کہ وہ صحیح معنوں میں تمام مرہٹہ رئیسوں کو متحد و متفق رکھ سکتی۔ لہذا جب تک اس کا مقابلہ ہندوستانی حریفوں سے رہا جو اس سے بھی زیادہ غیر مستقل اور زوال پذیر تھے، اس وقت تک حکومت پونا ظاہر بہت اچھی حالت میں رہی لیکن جب ایک تیسری اور تازہ دم بیرونی قوت سیاسیات کے میدان میں داخل ہوئی جس کی کامیابی کا انحصار ہی اہل ہند کے باہمی نفاق سے فائدہ اٹھانے پر تھا، تو مرہٹوں میں سب سے پہلے حکومت پونا ہی زد میں آئی اور اس نے نقصان اٹھایا اور پھر ایک ایک کر کے دوسرے مرہٹہ رئیس بھی مغلوب و سرنگوں ہوتے گئے۔

مرہٹوں کے زوال قوت کا دوسرا قوی سبب جسے ان کی تایخ کے مشہور مصنف گرانٹ ڈف نے باجاء بتایا ہے یہ تھا کہ ابتدا سے ان کی سپاہ گری قزاقانہ قسم کی تھی اور اسی طرز جنگ کے لیے وہ طبعا موزوں تھے جس میں نہ کسی باقاعدہ اور منظم فوج کی ضرورت ہے اور نہ کسی فن حرب کے ماہر سپہ سالار کی پس جب تک وہ دوسروں کے علاقے پر تاخت تاراج کرتے رہے ان کا زور رہا۔ لیکن جب یہ دوسری قوتیں اندرونی اسباب اور کچھ مرہٹوں کی یورشوں سے کمزور ہو کر معدوم ہو گئیں اور ان کے علاقوں پر مرہٹوں کا تسلط ہوا تو پھر انھیں قزاقی کی بجائے ریاست و حکومت کی شان بنانی پڑی، باقاعدہ فوجیں اور توپ خانے رکھنے پڑے اور یہ وہ پابندیاں تھیں جن سے مرہٹہ قوم کی کوئی مناسبت نہ تھی چنانچہ جہاں جہاں ان کی مستقل حکومت قائم ہوئی وہاں شاید دوشلیں بھی نہ گزری تھیں کہ ان کی فوجوں میں مرہٹہ عنصر کم ہو گیا، حتیٰ کہ ۱۸۱۷ء میں پونا سے جو فوج آراستہ ہو کر شمال کی جانب روانہ ہوئی اس کے پیادوں اور توپخانہ میں

ب

کوئی مرہٹہ سپاہی نہ تھا اور سواروں میں بھی وسط ہند کے بہت سے پنڈارے شامل تھے۔ اسی طرح مادھوجی سندھیا جس نے مرہٹوں میں سب سے زیادہ قوت حاصل کر لی تھی اور جو توپ و تفنگ کی اہمیت کو بخوبی سمجھتا تھا غیر مرہٹہ فوجیوں کا محتاج ہو گیا تھا، اس کے بہترین سپہ سالار بھی غیر قوم بلکہ غیر ملک کے لوگ تھے، اور ان میں دو فرانسیسی سردار ڈبوشینی اور پیران خاص طور پر مشہور ہیں۔

دوسری فصل حیدر آباد (وایسور)

خاندان
آصفی

اس انقلاب عظیم کے وقت جبکہ سلطنت مغلیہ کی پر شکوہ عمارت گر رہی تھی اور مرہٹوں کی غارتگری نے سارے ملک میں تہلکہ ڈال دیا تھا، ان کے ہمسائے میں دکن خاص کے علاقوں کا محفوظ و مصئون رہنا حاذقان آصفی کی حیرت انگیز قابلیت و مستعدی کا ثبوت ہے۔ یہ نامور خاندان شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد میں ہے اور اس کے جد امجد خواجہ عابدؒ کہ پدرش عالم شیخ از غلامائے اکابر سمرقند.... بود۔ محمد شاہ جہانی میں ہندوستان آئے اور عہد اورنگ زیب میں قلیچ خاں کے خطاب اور منصب چہار ہزاری سے مفتخر ہوئے، چند سال بعد ان کے فرزند میر شہاب الدین اور بھائی خواجہ بہاء الدین بھی ہندوستان چلے آئے اور سلطنت کے نہایت معزز عہدوں پر سرفراز ہوئے رہے۔ تلخ میں میر شہاب الدین اپنے شاہی خطاب ”غازی الدین فیروز جنگ“ سے مشہور ہیں۔

یاد
کن ہے
ابتدائی

دربار اور نگ زیب کے ان گرامی قدرامیروں کے تفصیلی حالات
مجموعہ تو اسخ میں جستہ جستہ اور مآثر الامرا میں یکجا موجود ہیں لیکن اس مختصر کتاب
میں بھی یہ لکھنا بچھی سے غامی نہ ہوگا کہ بیجا پور اور گولکنڈے کی فتومات میں یہ
دونوں سردار بادشاہ کے سب سے عزیز و محترم رفقاء میں تھے اور بیجا پور کی
فتح کا جو اطلاع نامہ دفتر شاہی سے شایع ہوا اس میں قدر شناس بادشاہ نے
یہ فقرہ اپنے قلم سے تحریر کیا تھا کہ بیجا پور..... ”بدستاری فرزند بے رب و رنگ
غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ مفتوح شد“ اسی طرح گولکنڈے کے
محاصرے میں سپہ سالاری کے فرائض نواب قلیچ خاں کے تفویض کردئے گئے تھے
اور انھوں نے یہیں گولے کے زخم سے انتقال کیا (۱۱۹۰ھ) اور نگ زیب
کو اس واقعے کا نہایت ملال ہوا، مرحوم کی اولاد مزید اعزاز و اکرام شاہی سے
مفتخر ہوئی مگر حق یہ ہے کہ قضا و قدر کی طرف سے اس جاں نثاری کا جو صلہ ملا وہ تمام
بادشاہی انعامات سے بڑھ چڑھ کر تھا کیونکہ بادشاہ کے حکم سے جب جو اصرار
اپنے مرحوم سپہ سالار کی نقش کو لشکر گاہ کے قریب دفن کر رہے تھے تو یہ بات
کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوئی کہ وہ درحقیقت دکن میں اسی بہادر امیر کے
خاندان کی آئندہ فرماں روائی کی بنیاد چار رہے ہیں۔

اسی موقع پر مرحوم کے نوجوان پوتے میر قمر الدین کو منصب چہار ہزاری
اور ”چین قلیچ خاں بہادر کا خطاب عطا ہوا اور آئندہ کارناموں کے صلے میں مزید
ترقی ہوتی رہی لیکن میر قمر الدین کی فراست و تدبیر کی آزمائش کا سب سے
نازک وقت وہ تھا جب کہ سادات بارہہ فرخ سیر کو معزول و مقتول کرنے
کے بعد حکومت کے قریب قریب مالک بن بیچھے تھے اور سلطنت مغلیہ کے
قدیم امرا کا ہر حیلے سے استیصال کر رہے تھے۔ ان سیدوں کی شکست و زوال
کا حال پہلے ہماری نظر سے گزر چکا ہے اور یہ مسلم ہے کہ مغل بادشاہ کو میر قمر الدین خاں
کی شجاعت و قابلیت اور اسی خاندان کے دوسرے رکن محمد امین خاں

نواب
اعظم الملک
انصاف گاہ
اول۔

۱۔ یہ بیاضی مقبرہ قلیچ خاں کی بارہ دری کے نام سے حمایت ساگر کے قریب موجود ہے۔

باب

پسر خواجہ بہاؤ الدین کی سعی و کوشش نے بادشاہ گریدوں سے غلصی دلائی تھی، اور آئندہ بھی یہ خاندان سلطنت کی جس خلوص و لیاقت کے ساتھ خدمت گزاری کرتا رہا، اس کی بہت سی مثالیں تاریخ میں محفوظ ہیں حتیٰ کہ یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ محمد شاہ کو اپنے طویل عہد حکومت میں جب کبھی مصائب نے خوابِ عشرت سے بیدار کیا تو انتہائی پریشانی کے وقت میں اسی خاندان کے افراد خاص کر نواب میر قمر الدین خاں سلطنت کے واسطے سینہ سپر ہو گئے۔ محمد شاہ کی جانب سے اس خدمت و جانپاری کا اگر کوئی قابلِ یادگار صلہ ملا تو وہ صرف خطاب آصفیاء تھا (۱۱۳۷ھ) ورنہ اس بادشاہ نے اپنے کم عقل اور حاسد امیروں کے اغوا سے بارہا نواب موصوف کے ساتھ برا سلوک کیا اور گجرات اور مالوے کی طرح دکن کے صوبوں کو بھی آصفیاء سے لے لینے کی درپردہ کوششیں کیں۔

یہ کوششیں خود سلطنت کے لیے موجب نقصان تھیں، خیر خواہی اور وفاداری کے باوجود نواب نظام الملک کو دہلی کی ناقدر داں حکومت کے حاسدانہ احکام کی تعمیل میں دکن سے دست بردار ہونا گوارا نہ تھا اور کچھ عرصے کے واسطے حفاظت ذاتی کی بدولت بادشاہ کا نواب نظام الملک پر عتاب بھی ہوا لیکن آخر میں محمد شاہ کو اپنے بہترین امیر کی مخالفت سے پشیمانی ہوئی اور بادشاہ کی پریشانیاں دیکھ کر نواب آصفیاء نے بھی گزشتہ شکایات بھلا دیں اور آڑے وقت میں رفاقت و جانپازی کے لیے پھر دہلی آنا منظور کر لیا (۱۱۴۲ھ) لیکن پچھلے دس بارہ برس میں گجرات و مالوہ مرہٹوں کی آماج گاہ بن گئے تھے بادشاہ کا خزانہ خالی اور فوج کی تعداد بہت ہی کم رہ گئی تھی۔ لہذا اب مذکورہ بالا صوبوں سے مرہٹوں کے اخراج میں نواب آصفیاء کی مساعی بھی کارگر نہ ہو سکیں اور مالوے کی چند ہفتے کی لڑائی میں چار و ناچار باجی راؤ سے دب کر صلح کرنی پڑی اور استرازانہ بھوپال (۱۱۵۱ھ)۔

جیسا کہ صاحبِ ماتر الامرا نے تصریح کی ہے مرہٹوں سے اس موقع پر

لے ہو وہ معاملت نہیں ہے جس کا پہلے ذکر آیا ہے اور جس کا زمانہ ۱۱۴۲ھ ہجری تھا۔

جس طرح ممکن ہو بیچیا چھڑانے اور ان کی من مانی شرائط قبول کر لینے کا ایک بڑا ہب یہ تھا کہ انھی دنوں نادر شاہ کی آمد آمد کی خبر گرم تھی۔ اور حکومت دہلی سے مطلق امید نہ تھی کہ بطور خود اس نے خطرے کا تذکرہ کر سکے گی پس نواب آصفیہ کو جلد سے جلد مالوے سے واپس آنا پڑا اور نہ صرف کرنال کے میدان میں جنگی مدافعت بلکہ حملہ آوروں سے بعد کی مصالحت بھی درحقیقت زیادہ تر آصفیہ کی سعی و تدبیر کا نتیجہ تھی جس کی خود نادر شاہ نے داد دی۔

مرہٹوں کو تھوڑے ہی دن میں معلوم ہو گیا تھا کہ بھوپال کے اقرار و مدار محض دفع الوقتی کے واسطے تھے جن کے ایفا کی کوئی امید نہ تھی، لہذا انھوں نے اس مرتبہ دکن کے علاقوں پر یورش کی جہاں آصف جاہ کا بھلا فرزند میر احمد ناصر جنگ، نائب صوبہ دار تھا اور فوج کا بڑا حصہ دہلی گیا ہوا تھا۔ دکن کو گجرات کی طرح تاراج کرنے کا اس سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا لیکن ناصر جنگ کی دلیرانہ مدافعت نے مرہٹوں کی ہمت پست کر دی اور انھیں مالی زیرباری اور نقصان کے سوا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا (۱۱۵۳ھ) اور ادھر کچھ عرصے بعد خود نواب آصفیہ نے دکن پہنچ کر عثمان انصام اپنے ہاتھ میں لی۔

نواب آصفیہ کے باقی ایام زندگی دکن ہی میں بسر ہوئے، یہاں پہنچتے ہی

اندرونی
تعمیر و تنقید

۱۔ آثار الامراء - جلد سوم ۸۴ -

۲۔ اہل دہلی اپنے ہر عزیز و محترم نواب آصفیہ کی آمد سے جس قدر مسرور و مطمئن ہوئے تھے اس کی شہادت میں یہ مشہور قطعہ تاریخ نقل کرنا دلچسپی سے مافی نہ ہو گا کہ :-

صد فکر کہ ذات دیں پناہی آمد رونق دہ ملک بادشاہی آمد
تاریخ رسد نقش بگو شمع ہاتھ گفت ”آیت رحمت الہی آمد“

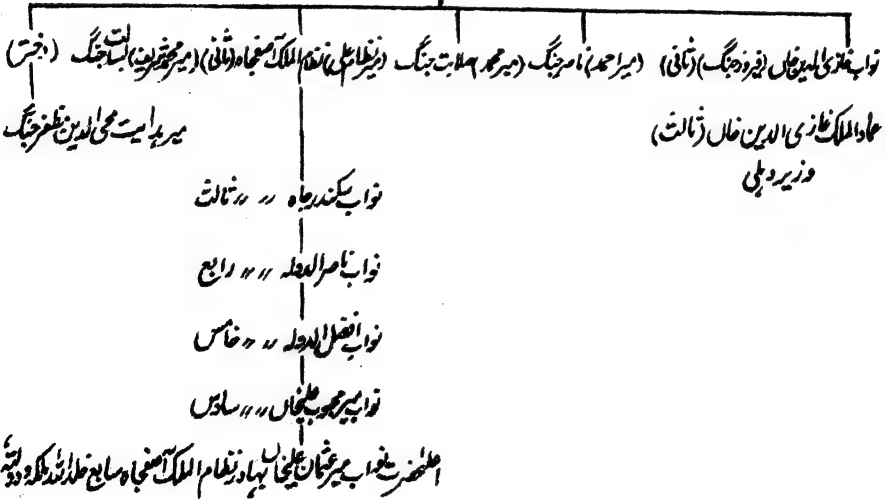
۳۔ اس حقیقت کو خاص طور پر جاننے کی ضرورت ہے کہ چونکہ ڈوف اور دیگر انگریز مورخ مذکورہ بالا جنگ اور مصالحت کو مرہٹوں کے کال غیبی کا ثبوت بتاتے ہیں حالانکہ خود ان کے آئندہ بیانات سے اس کی تردید ہوتی ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ باجی رائے کی یہ کامیابی محض ماضی اور نواب آصفیہ کی وقتی مشکلات کا نتیجہ تھی۔

بے

اول تو ناصر جنگ نے باپ سے سرکشی کی لیکن لڑائی میں زخمی ہو کر گرفتار ہوا اور قدر داں باپ نے نہ صرف جان بخشی کی بلکہ بہادری کی داد دی، پھر نواب آصفیہ نے ملک ارکاٹ کی تسخیر توجہ کی جس کے مفتوحہ علاقے مرہٹوں کی تاخت و تاراج اور کچھ مقامی رئیسوں کی سرکشی سے صوبہ دار دکن سے مخوف ہو گئے تھے آصفیہ ہی افواج نے ترجیا پٹی تک (جس پر مرہٹے قابض تھے) تمام اضلاع کو از سر نو فتح کیا، (۱۱۵۵ھ تا ۱۱۶۲ھ) پھر یہاں کی حکومت (یا نظامت) انور الدین خاں کے تفویض کر کے نواب آصفیہ نے اورنگ آباد کو مراجعت کی۔ آصفیہ اول نے برہانپور میں انتقال کیا (جمادی الآخر ۱۱۶۱ھ) اور چھ بیٹیاں اور چھ فرزند چھوٹے جن میں سے ایک نوے اور چار بیٹوں نے کم سے کم رسمی طور پر مرحوم کی جانشینی کا شرف حاصل کیا۔ لیکن ان واقعات کو پڑھتے وقت مناسب ہے کہ خاندان آصف جاہی کے مشاہیر کا مجسمہ پیش کر دیا جائے :-

خواجہ عابد قلیچ خاں

میر شہاب الدین الخطاب یہ غازی الدین خاں (اول)
میر قاسم الدین نظام الملک آصفیہ (اول)



آصف جاہ اول کا فرزند اکبر نواب غازی الدین خاں باپ کی طرف سے نیا بستہ دربار دہلی میں امیر الامرا تھا اور دکن میں ضرورت کے وقت یہ خدمت دوسرا بھائی نواب ناصر جنگ انجام دے چکا تھا اس کی جنگی اور انتظامی قابلیت مسلم تھی اور باپ کے انتقال کے بعد وہی نظام الدولہ ناصر جنگ کے خطاب سے سندھ صوبہ داری پر متمکن ہوا، پھر اسی زمانے میں جب احمد شاہ اہلہلی کے حملے کے وقت دربار دہلی سے طلبی ہوئی تو وہ فوج لے کر دکن سے روانہ ہوا تھا کہ ادھر تو بادشاہ نے فصیح غزیمت کی ہدایت کی اور ادھر اس کے بھانجے ہدایت مخی الدین خاں نے خود دکن میں علم سرکشی بلند کیا۔ اس نوجوان امیر زادے کو نواب آصف جاہ اول کی جانشینی کا دعویٰ تھا اور چند اصحاب اور دو پلے جیسے سازشی رفیق مل گئے تھے، چند اصحاب کا اصل نام حسین دوست خاں ہے اور وہ کرناٹک یا ارکاٹ کے ان مقامی (نوائے) رئیسوں کا سرگروہ تھا جنہیں آصف جاہ اول نے بے دخل کر کے انور الدین کو وہاں کا ناظم بنا دیا تھا۔ اور دو پلے دکن میں اہل فرانس کی تجارتی کوٹھیوں کا صدر عامل یا گورنر تھا جنہوں نے تقریباً نصف صدی پہلے ساحل کورومندل پر ایک گاؤں (پیل چری) خرید کر اسے اپنا صدر مقام اور سب سے بڑی تجارتی بندرگاہ بنالیا تھا، یہی جگہ تاریخ میں پانڈی چری (یا پانڈی شیر) کے نام سے مشہور ہے۔

فرنگی سوداگروں کے ہندوستان آنے اور ملک گیری کا منصوبہ سوچنے کے حالات آئندہ باب میں یکجا ہماری نظر سے گزریں گے، اس جگہ یہ لکھنا کافی ہے کہ ڈو پلے پہلا فرنگی ہے جس نے اہل ہند کی کمزوریوں کو تاڑا اور انہیں آپس میں لڑا کر خود حکومت قائم کرنے کا وسیع و وسیعہ جال تیار کیا تھا۔ اس سازش میں چند اصحاب کو تو فرانسیسیوں کے ساتھ برابر کا شریک سمجھنا چاہیے لیکن جو صید غافل سب سے پہلے اس جال میں پھنسا وہ ہدایت مخی الدین خاں النخاطب بہ مظفر جنگ ہے۔

شہر کا سب سے سازش کو شروع میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ انھوں نے انور الدین خاں

۱۱

ناظم کرناٹک پر حملہ کیا اور وہ اتفاق سے پہلی ہی جنگ میں مارا گیا (۱۱۶۲ھ) ملک پر یہ ”اتحادی“ قابض ہو گئے۔ لیکن ابھی وہ خوشیاں ہی منا رہے تھے کہ نواب ناصر جنگ نے فوج کثیر کے ساتھ اورنگ آباد سے کیرج کیا اور سازش کے اصلی مرکز یعنی پانڈی چیری کے قریب تک آ پہنچا۔ صوبہ دار دکن کی اس یلغار نے اتحادیوں میں ہل چل ڈال دی۔ مظفر جنگ اور چندا صاحب کے تمام رفیق سمٹ کر پانڈی چیری سے کچھ فاصلے پر جمع ہو گئے اور فرانسیسی سپاہ کی بہت بڑی تعداد ان کی امداد کے واسطے آئی۔ فرنگی سپاہی جن کی قواعد دانی اور بہادری کی بے سر و پا تعریف سے جدید تواریخ ہند کے ورق سیاہ نظر آتے ہیں، اگر غور کیا جائے تو ایشیا میں دراصل اکثر موقعوں پر فریق مقابل کی باہمی نا اتفاقی اور غداری سے لڑائیاں جیتی ہیں اور اس موقع پر بھی ڈوپلے برابر سازاویں مصروف تھا۔ لیکن اس ریشہ دوانی کا کوئی نتیجہ نکلنے نہ پایا تھا کہ فرنگی سپاہیوں نے محض معروب ہو کر ایک رات بغیر کسی بڑی لڑائی کے فرار اختیار کیا اور کمال بزدلی سے اپنے رفیق مظفر جنگ کو تنہا چھوڑ گئے جو صبح کو معمولی زد و خورد کے بعد گرفتار کر لیا گیا، (منبع الثانی ۱۱۶۳ھ)

منبری نغز
دربار دکن میں

مگر اورم لکھتا ہے کہ مذکورہ بالا ناکامی کے باوجود مکار دوپلے اس بات سے مایوس نہ ہوا تھا کہ نواب ناصر جنگ کے دربار میں کسی نا اتفاقی کا پتہ لگائے گیا یا خود کوئی ایسا اتفاق پیدا کر دے گا جس سے عیاری کے ساتھ اپنا کام چل آدے اور دوبارہ مظفر جنگ اور چندا صاحب کے بگڑے ہوئے معاملات کی اصلاح ہو سکے، اس کا خیال صحیح نکلا، چند مہینے کی ریشہ دوانی سے نواب کے چند چٹھان امیر و دوپلے سے مل گئے اور انھی غداروں کی تحریک سے فرانسیسیوں نے نواب کی فوج پر پنجون مارا پھر جب ناصر جنگ ہاتھی پر سوار ہو کر خود سپاہیوں کی بہت بندھانے نکلا اور ان پٹھانوں کی طرف بھی آیا تو ان میں سے ایک پٹھان امیر

۱۔ آٹالا مرزا جلد دوم صفحہ ۸۵۴۔ ۲۔ آدم جلد اول صفحہ ۱۲۰، ۱۴۰۔ ۳۔ لسن صاحب نے حسب دستور ان واقعات کے بیان کرنے میں بہت سی تاویلات پیش کی ہیں، ”مہتری اوف ڈی فرینچ ان انڈیا“ صفحہ ۲۴۴ وغیرہ۔

(ہمت خاں نامی) نے اپنے آقا ناصر جنگ کے گولی لگائی اور جو ہیں وہ مر کر ہاتھی سے نیچے گرا فوراً اس کا سر کاٹ لیا۔ (۱۶۳۱ء)

اہل سازش نے اسی وقت مظفر جنگ کو قید سے نکال کر سند دکن پر بٹھا دیا تھا اور جب وہ بھی تھوڑے دن بعد باہمی نفاق و شورش کا شکار ہوا تو نواب آصفیہ اول کے قیسرے فرزند نواب صلابت جنگ کی سند نشینی کا اعلان کر دیا جو مظفر جنگ کی طرح فرانیسیوں کی طرف مائل تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ فرانیسی فوج کے سردار موسیو بوسے (بوسی) کو دربار دکن میں بڑا رسوخ حاصل ہو گیا اور اس میں شک نہیں کہ اس نے ریاست کو بیرونی حملوں سے بچانے میں جانیازی اور قابلیت بھی دکھائی، یہ بیرونی حملے مرہٹوں نے کئے تھے لیکن انھیں اصلی قوت و تحریک نواب غازی الدین خاں (ثانی) سے پہنچ رہی تھی جو اب اپنے باپ نواب آصف جاہ اول کی درمت کا دعویٰ دار تھا اور صوبہ داری دکن کی سند لے کر دہلی سے فوج کشی کی تیاریاں کر رہا تھا، اس نے اپنی مدد کے معاوضے میں مرہٹوں کو ملک خاندیس دینے کا وعدہ کیا تھا اور اس کی آمد سے پہلے مرہٹہ حلیفوں نے صلابت جنگ سے لڑائی چھیڑ دی تھی۔ لیکن اول تو یہ حملے چنداں کا رگ نہ ہوئے اور ادھر نواب غازی الدین خاں کا اورنگ آباد پہنچتے ہی انتقال ہو گیا پس جھکڑا جبکی نسبت خوف تھا کہ سخت خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لے گا ایک ہی سال میں رفع دفع ہو گیا (۱۶۵۱ء) اور اس اثنا میں فرانیسیوں کو دربار میں مزید قوت حاصل ہو گئی۔ سال آئندہ جنوبی اڑیسہ کے چار بڑے بڑے اضلاع کی سند بھی انھیں مل گئی جو فوجی معارف کے لیے بطور جاگیر عطا ہوئے تھے اور انکی سالانہ آمدنی کا تخمینہ تقریباً چالیس لاکھ روپے کیا جاتا تھا۔

اسرائے دکن کی خود غرضی اور باہمی نا اتفاقی ہونے فرنگیوں کی ریشہ دوانیوں سے

نواب
نظام ملتان
آصفیہ ثانی

۱۔ یعنی سکھ بڑے مصطفیٰ نگر، ایلور، راجمندرام اور چچا کول جو اب "شمالی سکھاؤں" کے نام سے احاطہ مداس میں شامل ہیں۔

باج

آئندہ پانچ سات برس تک ملک دکن کی حالت میں بہت اتری رہی مگر یہی بد نظمی نے خاندان آصف جاہی کے سب سے بہتر فرد کو مسند فرمانروائی پر پہنچنے کا موقع دیا اور کچھ عرصے دیوان رہنے کے بعد نواب یہ نظام علی خاں نے نظام الدولہ آصفیہ ثانی کے خطاب سے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی (۱۷۹۲ء)۔

واضح رہے کہ نواب صلابت جنگ کی کمزوری اور غیر ہر دلغیزی کی سب سے آخری اور قوی وجہ لڑائی ہوئی تھی جس میں مرہٹوں نے اسے اودھ کے قریب گھیر کر خاندیس و برار نیز دولت آباد و بیجا پور کے وسیع علاقے دینے پر مجبور کر دیا تھا (۱۷۹۲ء) لہذا نواب یہ نظام علی خاں بہادر کی سب سے پہلی کوشش یہ تھی کہ جس طرح ہو سکے اس نقصان کی تلافی کی جائے اور پانی پت میں مرہٹوں کی سخت ہزیمت نے کامیابی کا خداداد موقع دے دیا تھا۔ چنانچہ آئندہ دو تین سال تک مرہٹوں سے براہر جنگ ہوتی رہی جس میں نواب نظام الدولہ بہادر کی فوجوں نے ایک مرتبہ خاص پونتا تک بڑھ کر اس شہر کو جلا دیا (۱۷۹۲ء) اور اس کے جواب میں مرہٹوں کی اورنگ آباد و حیدرآباد پر یورش ناکام رہی آخر نصف سے زیادہ کھویا ہوا علاقہ لے کر نواب نظام الدولہ بہادر نے مرہٹوں سے صلح کر لی۔

انگریزوں کے تعلقات

اس مصالحت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اب انگریز نہ صرف اپنے قریبی حریفوں پر غالب آگئے تھے بلکہ بنگال دار کاٹ میں بھی ان کا عمل دخل ہوتا تھا اور اسی زمانے میں شاہ عالم ثانی سے بالائی بالا انھوں نے شمالی سرکاروں کا فرمان لے کر اس علاقے پر اپنا قبضہ جمایا تھا۔ ۱۷۹۵ء اس کارروائی کی حیدرآباد میں اطلاع ہوئی تو نواب نظام الملک کو نہایت غصہ آیا اور فوج کشی کی تیاریاں کی گئیں کہ انگریزوں کو جبراً اس علاقے سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن پلاسسی کے فتح ابھی ہر میدان میں کود پڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے دب کر سات لاکھ روپیہ سالانہ خراج اور بوقت ضرورت خراج گزاری کی حیثیت سے کچھ امدادی فوج دینے کا عہد کر لیا اور ان شرائط پر نواب نظام الملک نے وہ سرکاری انھیں کے قبضے میں

باب

حیدرآباد کی جدید قواعد و اس فوج کو موسیور لیون اور پیراں جیسے لائق
 و کارداں فرانسیسی سردار مل گئے تھے جنہوں نے مختلف معرکوں میں اپنی
 رفاقت و سپہ سالاری کے جوہر دکھا کر دربار دکن میں نہایت ہر دلغیزی
 حاصل کر لی تھی اور ولیعہد ریاست (نواب سکندر جاہ) نیز دیگر امرا لیون
 کے بڑے قدرداں تھے لیکن یہاں خاص طور پر یاد رکھنے کے لائق بات یہ
 ہے کہ یہ فرانسیسی ملازمین دوپلے کے پہلے فرستادوں کی طرح ریاست حیدرآباد
 کے درپردہ دشمن نہ تھے کہ اپنے قومی فوائد یا ملک ستانی کے لیے ریاست
 کو کمزور و بے قابو کرنے کی سازشیں کرتے۔ لہذا ان سے نواب نظام الملک
 کی قوت کو کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا، لیکن حیدرآباد کا بجائے خود
 ایک قوی ریاست بن جانا اور وہاں فرانسیسیوں کی موجودگی ان کے
 قومی رقیب انگریزوں کو گوارا نہ ہو سکتی تھی۔ وہ موقع کی تاک میں لگے ہوئے
 تھے اور جب لیون نے وفات پائی (۱۸۱۳ء) تو انھوں نے ایک بہ یک
 حیدرآباد کی جدید سپاہ کو گھیر کر ہتھیار رکھوا لیے اور اس ایک ہی چال میں
 نواب نظام الملک کی جنگی قوت کو ایسا نقصان پہنچا دیا کہ ونٹنٹ اسمتھ
 کے قول کے بموجب پھر انگریزوں کو نہ ریاست حیدرآباد کی دشمنی کا خوف
 رہا نہ دوستی کی تمنا۔ غرض اس طرح ریاست کی خود مختاری میں روز بروز کمی ہوتی
 گئی ادھر انگریزی مقبوضات اور جنگی قوت میں برابر اضافہ ہوتا رہا تھا حتیٰ کہ ہندوستان کی اور ریاستوں
 کے ساتھ ریاست حیدرآباد بھی رفتہ رفتہ ان کی سیادت کے تحت میں آگئی۔
 ریاست حیدرآباد اور مرہٹوں پر انگریزوں کی بالادستی کے ضروری
 واقعات ہم آئندہ پڑھیں گے۔ یہاں جنوبی ہند کی ایک اور اسلامی قوت
 کا مختصر حال بیان کر دینا مناسب ہے جو اسی زمانے میں ایک خود مختار و
 طاقتور حکومت بن گئی تھی اور گو اس کے قیام کا سلطنت مغلیہ کے زوال
 سے کوئی براہ راست تعلق نہ تھا لیکن وہ ہندوستان کے اسی عہد انقلاب کی

سب سے دلچسپ تاریخی یادگار ہے :-

جیسا کہ ایک انگریز تاریخ نویس نے بتایا ہے ”وہ تمام علاقہ جسے آجکل میسور کہتے ہیں حیدر علی سے پہلے کبھی کسی حکومت واحد کے زیر نگین نہ ہوا تھا“ بلکہ جب سے اس کی تاریخ کا سراغ ملتا ہے اس وقت سے اس علاقے میں دو تین ریاستیں قائم تھیں اور اس پورے علاقے پر سلطنت وجیانگر کا بھی قبضہ نہ تھا۔ پھر جب وجیانگر کی قوت میں زوال آیا اور چھوٹے چھوٹے پرگنوں کے زمیندار، جنہیں ”دوپائی گار“ یا ”ٹائلک“ کہتے ہیں خود مختار ہو گئے تو میسور یا سری رنگ پٹن (سرکاپٹنم) کے حاکم (یا ”وڈیار“) کی حیثیت بھی اس وقت ایک بڑے زمیندار سے زیادہ نہ تھی اگرچہ اس کے قبضے میں دوسروں کی نسبت زیادہ علاقہ تھا۔

یہ ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا کہ میسور کے ان رئیسوں کا حکومت بچا پور سے بھی کوئی مستقل سیاسی تعلق تھا یا نہیں لیکن جس وقت اورنگ زیب نے دکن کی ریاستوں کو فتح کیا تو سری رنگ پٹن کے وڈیار کی طرف سے وکیلوں نے حاضر دربار ہو کر اطاعت و باج گزاری کا اقرار کیا اور اس کے جواب میں دکن کے رئیس کو بادشاہ کی جانب سے ”راجہ“ کا خطاب ملا۔ بعد کی تاریخی شہادتوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے راجہ صوبہ دار دکن کے ماتحت اور سلطنت مغلیہ کے باج گزار سمجھے جاتے تھے اور نواب ناصر جنگ نے مظفر جنگ اور چند اصحاب کے خلاف کرناٹک پر فوج کشی کی تو اس موقع پر سری رنگ پٹن یا میسور کے راجہ نے بھی نواب نظام الملک کو بحیثیت باج گزار امدادی فوج بھیجی تھی۔ صوبہ دار دکن کے ساتھ میسور کے ان ماتحتانہ تعلقات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ہم نواب نظام الملک اور حیدر علی میں آئندہ مخالفت کے صحیح اسباب نہیں سمجھ سکتے اور یہیں حیرت ہوتی ہے کہ دربار حیدر آباد نے

باب

حیدر علی
کا تہذیب

نے میور کی اسلامی بادشاہی کا خاتمہ کرنے میں اس قدر سرگرمی کیوں دکھائی؟
 الحقتہ یہ سہری رنگ پٹن کا لائق راجہ (چک دیور راج) جس نے
 اورنگ زیب سے حکومت کی سند حاصل کی تھی فوت ہوا (۱۱۱۵ھ) تو
 اس کی اولاد میں کوئی راجہ ایسا نہ ہوا جو اولوالعزمی یا عمدہ اوصاف حکمرانی
 سے متصف ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی باگ رفتہ رفتہ اس کے وزیر جنگ
 یا ”دلوائی“ کے قبضے میں آگئی اور خاندانی راجہ محض ”شاہ شطرنج“ سمجھے جانے لگے
 ادھر یہی زمانہ ہے جب کہ عام روایتوں کی بموجب حیدر علی کے قریشی نسل
 اجداد شمالی ہند سے ترک وطن کر کے دکن آئے اور بارہویں صدی ہجری کے
 وسط میں ان کا خاندان بنگلور میں آ بسا، حیدر علی کا باپ (فتح محمد)
 کرناٹک کی لڑائیوں میں مارا گیا تھا مگر اس نے اور اس کے بھائی اسماعیل نے
 میور کے دلوائی کی فوجی ملازمت اختیار کی جس میں اپنی دلیری اور کارگزاری
 سے وہ رفتہ رفتہ ترقی کرتے گئے اور غالباً ۱۱۶۵ھ میں حیدر علی ضلع دندنگل کا
 فوجدار مقرر ہوا، یہاں اس نے پیادہ اور سوار فوج کی ایک بڑی جمعیت
 فراہم کی اور فرانسیسیوں کی مدد سے گولے باروت کا بھی کافی ذخیرہ جمع کر لیا اور
 مجموعی طور پر اپنی قوت و شہرت حاصل کر لی کہ دو سال کے بعد جب مرہٹوں
 نے میور پر یورش کی تو دلوائی نے حیدر علی ہی کو اپنا سپہ سالار مقرر کیا اور محض
 اس کی مستعدی اور عمدہ سپہ سالاری کی بدولت حملہ آور تادان جنگ لے کر
 تل گئے اور میوری اضلاع ان کے ہاتھ میں پڑنے سے بچ گئے (۱۱۶۹ھ)۔

حیدر علی کا اس قدر اقتدار دیکھ کر میور کے موروثی راجہ کو خیال آیا کہ
 اس کی مدد کر دلوائی کے پنجے سے رہائی حاصل کرے اور جب حیدر علی نے
 دلوائی کو نکال کر خود حکومت کا مالک بننا چاہا تو راجہ نے مرہٹوں کو مدد کو اسلے
 بلایا۔ حیدر علی کو میور سے بھاگنا پڑا اور مرہٹے واپس چلے گئے تو اس وقت
 بھی حیدر علی بہ مشکل اپنے رقبوں کو زیر کر سکا لیکن تقریباً دو سال کی جدوجہد
 کے بعد آخر کار اسے کامیابی ہوئی اور ۱۱۷۳ھ سے ہم اس کو ریاست میور کا
 خود مختار حاکم کہہ سکتے ہیں۔ اتفاق سے انھی دنوں نواب نظام الملک کے

بھائی بسالت جنگ نے سیرا پر فوج کشی کی تھی۔ یہ مقام میسور کے شمال میں اورنگ زیب کے سب سے جنوبی صوبے کا مستقر تھا اور ان دنوں اس پر مرہٹے قابض تھے۔ بسالت جنگ کو اسے فتح کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن حیدر علی نے اسے تین لاکھ روپے دے کر سیرا کی صوبہ داری اپنے نام لکھوالی اور اسی سند میں اسے ”نواب حیدر علی خاں“ کا خطاب دیدیا گیا۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ بسالت جنگ کی بے قاعدہ کارروائی تھی اور دربار دکن میں اس خطاب و سند کو کبھی نہیں مانا گیا چنانچہ حیدر آباد کی مہم عصر تانہوں میں میسور کے نئے حاکم کو ہمیشہ ”حیدر نائٹک“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حیدر علی
کی فتوحات

بہر حال اب حیدر علی ریاست میسور کا خود مختار حاکم تھا۔ موروثی راجہ کی حیثیت ایک شاہی نظر بند سے زیادہ نہ تھی اور دوسرے رقیب بھی مغلوب ہو گئے تھے لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا اس زمانے میں میسور یا سہری رنگ پٹن کا علاقہ موجودہ ریاست میسور کی نسبت بہت کم تھا اور حیدر علی کی اولوالعزمی ایسی چھوٹی ریاست پر قناعت نہ کر سکتی تھی، چنانچہ آئندہ بیس برس تک اس کی تمام زندگی جنگ و جدال میں گزری جس میں سے بعض لڑائیوں کی غرض کشور کشانی تھی اور باقی ان مفتوحہ علاقوں کی حفاظت کے واسطے ہوتی رہیں اس کی فتوحات کے تفصیلی حالات لکھنے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن اجمالی طور پر اس قدر لکھنا مناسب ہو گا کہ حیدر علی نے غالباً چٹیل ورگ اور بدنور کی ابتدائی فتوحات کے بعد ہی جنوبی ہند میں ایک وسیع سلطنت قائم کرنے کا منصوبہ سوچ کر اس کی تکمیل میں رفتہ رفتہ کورگ اور سائل ملیبار کا تمام علاقہ فتح کر لیا تھا، مرہٹوں کی پیہم پورش اور نواب نظام الملک اور انگریزوں کی شدید مخالفت کے باوجود شمال اور شرق کی طرف بھی اس کی حدود سلطنت برابر بڑھ رہی تھیں اور ایک زمانے میں انگریزوں کو خود کرناٹک و مدراس کی سلامتی محذوش نظر آنے لگی تھی۔

انگریزوں

انگریزوں کے ساتھ ریاست میسور کی لڑائیوں کے حالات ہم آئندہ پڑھیں گے جنگ کا یہی سلسلہ جاری تھا کہ اس کے دوران میں حیدر علی نے

ب

وفات پائی (۱۱۹۵ھ) اور اس کا بڑا بیٹا فتح علی ٹیپو سلطان تخت نشین ہوا۔
 ”سلطان“ کا لقب خود حیدر علی نے کبھی اختیار نہیں کیا لیکن اس میں شبہ نہیں
 کہ اس کے آخری زمانے میں بادشاہی کے تمام لوازم جمع ہو گئے تھے، اسس کی
 خود مختاری (۱۱۹۵ھ) سے مسلم تھی، دکن کے صوبہ دار سے ماتحتی اور خراج گزاری کا
 تعلق بالکل منقطع ہو چکا تھا اور جنگی قوت و ریاست میں اضافے کے ساتھ
 حیدر علی کو اب نواب نظام الملک کی ہمسری کا دعویٰ تھا اور یہی وہ بات
 تھی جس نے حیدر آباد کی حکومت کو میسور کا تخت مخالف و رقیب بنا دیا۔
 ۱۱۹۲ھ میں اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کی نواب ساونور کی بیٹی سے شادی کی تو
 سری رنگ پین میں یہ رسم شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئی، اسی طرح دیگر
 تقریبات یاد رہا دوں کے موقع پر ہم حیدر علی کو بادشاہی لباس میں جلوہ گر
 پاتے ہیں اور فیل سفید پر اس کی سواری کا جلوہ اسی ماہی مراتب اور ساز و سامان
 کے ساتھ نکلتا ہے جو خاص بادشاہوں کی شان تھی۔

ٹیپو کے عہد میں قدرتی طور پر بادشاہی کی یہ شان زیادہ نمایاں ہو گئی
 ریاست میسور سرکاری طور پر ”سرکار خداداد“ کے نام سے موسوم ہوئی اور ”حیدر ناگ“
 کے فرزند نے ”سلطان“ کا پر شکوہ لقب اختیار کیا جسے دہلی کے برائے نام تاجداروں
 کے جیتے جی دکن کے طاقتور صوبہ داروں نے بھی اپنے واسطے جاسٹزند رکھا تھا
 ایک اعتبار سے ٹیپو کی یہ خود نمائی کچھ بجا نہ تھی رقبے میں تقریباً انگلستان کے
 مساوی ملک اس کے زیر نگین تھا، نوے ہزار جنگ آزما سپاہی اس کے حکم
 پر سرکٹوانے کے لیے تیار تھے، روپے پیسے اور جنگی ساز و سامان کے ذخائر باپ
 کے ترکے سے ملے تھے اور اندرونی طور پر بھی اس کی ریاست خامی منظم حالت
 میں تھی لیکن ”سلطان میسور“ کی یہی سطوت و قوت جس نے ٹیپو کو معروف بنایا
 اس کے ہمایوں کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی اور حیرت پہنچے کہ اسے
 خطرناک دشمنوں سے مقابلہ ہونے کے باوجود ٹیپو سلطان نے غالباً اس بات کا

صحیح اندازہ نہیں کیا کہ میسور کی نئی سلطنت کی بنیادیں نہایت ناپائیدار ہیں بے شبہ حیدر علی نے اپنی ذاتی قابلیت سے ترقی کی تھی اور وقتی حالات سے فائدہ اٹھا کر بہت قوت بہم پہنچالی تھی لیکن یہ ظاہر ہے کہ اہل ملک اسے دل میں محض غاصب سمجھتے تھے اور اس کے ہم قوم یا ہم مذہب لوگوں کی کوئی ایسی بڑی تعداد میسور میں آباد نہ تھی جو اس نئی حکومت کے استحکام کی ضامن ہوتی، ادھر ہمسائے میں تین بڑی طاقتیں موجود تھیں جنہیں کسی چوتھے رقیب کا خود مختار و قوی ہونا کسی طرح گوارا نہ تھا، اس حالت میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی بہترین حکمت عملی بظاہر ہی ہو سکتی تھی کہ جس طرح ممکن ہو تار یا سرت حیدر آباد سے دوستانہ تعلقات قائم رکھتے اور کم سے کم یہی طور پر میسور کی سابقہ باج گزاری کو نباتتے کہ ہمسایوں کو حد کرنے کا زیادہ موقع نہ ملتا، لیکن دولت و قوت حاصل کرنے کے بعد آدمی ایسی مصلحتوں کو باعث عار سمجھنے لگتا ہے اور ٹیپو سلطان کا تو یہ قول مشہور ہے کہ دوسو برس بھیڑ بن کر جینے سے کہیں بہتر ہے کہ میں صرف دو دن شیر کی طرح زندہ رہوں، چنانچہ گو ۱۲۰۷ء کی لڑائیوں میں اس کا نصف کے قریب ملک چھین گیا (”عہد نامہ سرنگاپٹم“ ۱۲۰۷ء) اور وہ کبھی اپنے ملکی محصولات بڑھا کر ہمارے کے از سر نویری اور کجری فوجیں فراہم کرنے کی کوشش اور کبھی فرانسیسیوں کے ساتھ ساز باز کرتا تھا کہ اپنے تین تین دشمنوں کا کلمہ یہ کلمہ مقابلہ کر سکے لیکن خود ان دشمنوں کی باج گزاری یا اطاعت قبول کرنے کا اسے بھی خیال نہ آیا اور آخری جذبہ خود مختاری کی خاطر اس نے جان دی (۱۲۱۳ء) اسی کے ساتھ جنوبی ہند کی آزاد حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

تیسری فصل شمالی ہند کی ریاستیں



(۱) بنگالہ سلطنت مغلیہ کا سب سے وسیع صوبہ تھا اور اس میں موجودہ بنگال اور بہار (واڑیسہ) کے تمام اضلاع شامل تھے، لیکن صدر مقام ڈھاکہ تھا، صوبے کی زرعی خوش حالی اور بعض صنعتیں صدیوں سے مشہور تھیں اور گیارہویں صدی ہجری میں فرنگی تاجروں کی آمد و رفت کی بدولت اس کی بحری تجارت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی تھی، مگر اسے مرطوب آب و ہوا اور وبائی امراض نے بدنام کر رکھا تھا، فصل امرا اس دور دست علاقے میں آنے سے گھبراتے تھے اور متعدد کارکنز عہدہ داروں کی کمی سے اکثر یہاں کے مالی اختلالات میں اتہری رہتی تھی۔ اورنگ زیب کے آخری عہد میں اس کا عزیز اور لائق پوتا شہزادہ عظیم الشان بنگالے کا صوبہ دار تھا لیکن غالباً ملنے کی حالت اس وقت بھی اصلاح طلب تھی کہ بادشاہ نے محمد ہادی نامی (ایک نو مسلم برہمن) کو پہلے واڑیسہ اور پھر کل بنگالے کا دیوان بنا کر دکن سے ڈھاکہ بھیجا اور اس نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی قابلیت سے یہاں کی آمدنی بڑھا دی، نئے دیوان کی جسررسی نے جب شہزادہ عظیم الشان کے مصارف کو روکا تو شہزادہ دیوان سے بہت ناخوش ہو گیا بلکہ شہزادے کے اشارے سے ایک مرتبہ چند سپاہیوں نے دیوان پر حملہ بھی کیا لیکن وہ قابو میں نہ آیا اور جب بادشاہ کو ان باتوں کی اطلاع ہوئی تو اس نے پوتے کو لکھ بھیجا کہ محمد ہادی بادشاہی نوکر ہے اگر سرموئے ضرر جانی یا مالی بہ او خواہد رسید انتقام ال ازاں بابا خواہد کشید!

یہی محمد ہادی ہے جو چند روز بعد مرشد قلی خاں اور پھر نواب جعفر خاں کے خطاب سے بنگالے کا صوبہ دار بنایا گیا اور ۱۱۲۵ھ تک اس عہدے پر سرفراز رہا۔ دھاکہ چھوڑ کر مرشد آباد کے مرکزی مقام کو اسی نے بنگالے کا مستقر بنایا اس کا پیدائشی نام شخصوں میں آباد یا مقصود آباد بدل کر مرشد آباد کے نام سے اس کو نہایت رونق و ترقی دی انتظامی قابلیت کے علاوہ اس کی سخت گیری اور انصاف پسندی ضرب المثل تھی اور کہتے ہیں کہ ایک مظلوم کے قصاص میں اس نے خود اپنے بیٹے کو جان سے مراد دیا تھا۔

جعفر خاں اپنے نواسے سرفراز خاں کو جانشین بنانا چاہتا تھا لیکن خود سرفراز خاں کے باپ شجاع الدین دلی اڑیسہ نے یہ بات گوارا نہ کی۔ بیٹے نے بھی اس کے سامنے سر جھکا دیا اور دربار دلی نے اسی شجاع الدین کو شجاع الدولہ اسراخاں کے خطاب سے بنگالے کا صوبہ دار تسلیم کر لیا آئندہ تیرہ سال تک شجاع الدولہ نے حکومت کی اور جعفر خاں کی طرح وہ بھی نہایت منظم اور لائق صوبہ دار گزار ہے جس کے سب فارسی اور انگریزی تاریخ نویس مداح ہیں۔ شجاع الدولہ اور نیز اس کا بیٹا سرفراز خاں حکومت دہلی کے فرمانبردار رہے اور گوبنگالے کے صوبہ داروں نے آئندہ بھی کبھی علانیہ خود مختاری کا دعویٰ نہیں کیا لیکن صدر حکومت کی کمزوری سے سب سے پہلے جس شخص نے فائدہ اٹھایا وہ بیٹے کا حاکم محمد علی وردی خاں تھا جسے خود شجاع الدولہ نے ادنیٰ مرتبے سے ترقی دے کر امرائے شاہی میں داخل کرایا تھا۔ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد سرفراز خاں مارا گیا اور علی وردی خاں نے پورے صوبے پر قبضہ کر لیا (۱۱۵۳ھ)۔

یہ کارروائی حکایت دہلی کی بغیر اجازت و خلاف مشائیں اس وقت عمل میں آئی جب کہ نادر شاہ کے حملے نے مغل تاجدار کو پہلے سے بھی زیادہ کمزور کر دیا تھا۔ ادھر علی وردی خاں نے خراج کے نام سے تحفے تحائف اور

باب

کچھ روپیہ بھیج کر اطاعت و باج گزاری کا اقرار کیا اور آئندہ بھی اس رسم کو تباہتا رہا، پس حکومت دہلی نے طوعاً و کرہاً اس کو بنگالے کا صوبہ دار تسلیم کر لیا لیکن نہ تو علی وردی خاں کی یہ اطاعت سچی تھی اور نہ بادشاہ دہلی اسے کٹائی سمجھتا تھا۔ چنانچہ بیس برس کے بعد شہزادہ عالی گہرا شاہ عالم ثانی کے ادھر آنے کی اصلی وجہ یہی تھی کہ وہ بنگالے میں مغلوں کے قدیمی حقوق بادشاہی کو از سر نو قائم کرنا چاہتا تھا اور علی وردی خاں کے جانشینوں کو بنگالے کا حاکم جابر علیہم نہیں کرتا تھا۔

شہزادہ موصوف کی جدوجہد کا اجمالی حال ہم آئندہ پڑھیں گے یہاں خاص طور پر جتانے کے لائق یہ امر ہے کہ علی وردی خاں کی مذکورہ بالا بغاوت و کامیابی نے بنگالے کے مقامی امرا اور عہدہ داروں میں سخت انتشار و نا امنی پیدا کر دی اور مقتول صوبہ دار (یعنی سرخراز خاں) کے ہواخواہوں سے جب خود مقابلہ نہ ہو سکا تو انہوں نے مرہٹوں کو مدد کے واسطے بلایا اور ایک دو مرتبہ ناکامی کے بعد آخر میں مرہٹوں کی سالانہ یورتوں نے علی وردی خاں کو ایسا عاجز کیا کہ اسے خاص بنگالہ بچانے کی خاطر اٹریسہ کا صوبہ مرہٹوں کے حوالے کرنا پڑا اور بہت دن تک یہ علاقہ برار کے بھونسلہ حاکموں کے زیر نگیں رہا، لیکن ان کی اس ”حکومت“ کی صورت صرف یہ تھی کہ چھٹے چھ ماہے مرہٹہ سوار اس طرف کا گشت لگاتے اور جس قدر ممکن ہوتا رہیہ جبراً رعایا سے وصول کر کے واپس چلے جاتے تھے۔

علی وردی خاں کی وفات کے بعد اس کا نواسہ نواب سراج الدولہ اس کا جانشین ہوا (۱۱۶۹ھ) لیکن اس کی حکومت کے پہلے ہی سال میں خانہ جنگیوں کے علاوہ انگریزوں سے جنگ چھڑ گئی جس نے انجام کار ان مغربی تاجروں کو ملک بنگالہ کا مالک بنا دیا۔

شمالی ہند کی ایک اور بڑی اور نیم آزاد ریاست خاص دوآب کے

(۲) لکھنؤ

علاقے میں قائم ہوئی جسے سہولت کے لئے ”حکومت اودھ“ کہتے ہیں، اس میں روہیلکھنڈ سے حدود بہار تک کے اقطاع داخل تھے اور ایک زمانے میں روہیلکھنڈ بھی فتح ہو کر شامل ہو گیا تھا اس ریاست کا بانی ایک ایرانی سوداگر برہمان الملک سعادت خاں تھا جس نے اپنی سپاہیانہ قابلیت سے محمد شاہ کے عہد میں بڑی ناموری پائی اور الہ آباد و اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا لیکن اودھ کی جنگی قوت کو بڑھانے والا اس کا جانشین اور بھتیجا صفدر جنگ تھا جو آصف جاہ اول کے بعد سلطنت دہلی کا وزیر ہوا اور غرضے تک وہاں کی درباری سازشوں میں الجھا رہا اس کی وفات اور اس کے بیٹے شجاع الدولہ کی جانشینی (۱۱۶۷ھ) کا ذکر ہم پہلے پڑھ چکے ہیں، پانی پت کی تیسری جنگ کے وقت شجاع الدولہ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ تھا لیکن آخر وقت تک مرہٹوں سے ساز باز کرتا رہا اور اس کی فوج نے لڑائی میں بھی کوئی قابل لحاظ حصہ نہیں لیا اسی طرح اگرچہ شہزادہ عالی گہر (شاہ عالم ثانی) کو بنگالے پر حملہ کرنے کی تحریک میں وہ پیش پیش تھا لیکن درحقیقت اس حملے کا خاص محرک شجاع الدولہ کا چچیرا بھائی محمد علی خاں ناظم الہ آباد ہوا اور شجاع الدولہ نے اسے شہ دی تاکہ وہ اور شاہزادہ عالی گہر اس کی حدود سے باہر چلے جائیں، اور بنگالے کی لڑائیوں میں الجھے رہیں اور خود شجاع الدولہ کو ان کی کسی سازش و رقابت کا خوف نہ رہے پھر تین چار سال کے بعد میر محمد قاسم والی بنگالہ نے بہار سے بھاگ کر اس سے مدد مانگی، اور شجاع الدولہ نے شاہ عالم کے ساتھ ملکر دوبارہ بہار پر فوج کشی کی لیکن معاہدہ اتحاد و دوستی کے باوجود شجاع الدولہ نے اپنے مہمان (میر قاسم) سے دغا کی اور اس کی فوج کے فتنہ پرداز فرانسسی سردار سمرویا شمر و کو ملا کر اپنا رفیق بنا لیا اور اس بے بسی میں

۱۔ میر التاخرین جلد دوم صفحہ ۶۷ وغیرہ یہ حالات اور آئندہ میر قاسم والی بنگالہ کے ساتھ شجاع الدولہ کی دغا بازی کا ذکر میر التاخرین کی دوسری جلد میں بہت تفصیل سے مرقوم ہے اور اس کتاب کا مولف ان واقعات کے وقت موجود اور اکثر معاملات میں خود شریک تھا۔

ہے

میر قاسم کو ایک عرصے تک نظر بند رکھا، اس دغا بازی سے شاید وہ بہار کے بعض اضلاع پر خود قبضہ کرنا چاہتا تھا لیکن اول تو انگریزوں نے اسے بمکسر پر شکست دی (۱۷۶۴ء) دوسرے خود شاہ عالم اس کا ساتھ چھوڑ کر انگریزوں کے لشکر میں چلا آیا جنھوں نے اب خاص شجاع الدولہ کے ملک پر پیش قدمی کی اور والی بنگالہ سے فریب و حسد کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود اسے بہت سا روپیہ انگریزوں کو دینا پڑا اور اضلاع کا نیپور والہ آباد و قجپور شاہ عالم کے حوالے کرنے پڑے۔

انگریزوں کا اثر۔

چند سال بعد جب شاہ عالم انگریزوں سے ناخوش ہو کر دہلی گیا تو الہ آباد کو پھر شجاع الدولہ کے سپرد کر گیا تھا، لیکن اب بادشاہ کے مرہٹہ رفیقوں کا زور ہوا اور انھوں نے شاہ عالم سے الہ آباد کی سند حاصل کر لی، اسی سلسلے میں انھوں نے روہیلکھنڈ پر حملہ کیا اور شجاع الدولہ کو اپنا ملک بچانے کی خاطر انگریزوں سے امداد لینے پڑی، اس فوجی امداد کے عوض میں اس نے انگریزوں کو پچیس لاکھ روپیہ سالانہ دینے کا اقرار کیا اور اودھ کے صدر مقام فیض آباد میں مستقل طور پر انگریزی سفارت قائم ہو گئی جسے آئندہ انگریزی سیادت و حکومت کی تمہید سمجھنا چاہیے (۱۷۶۴ء) لیکن اس وقت الہ آباد شجاع الدولہ کو اس اتحاد سے یہ نفع پہنچا کہ اس نے انگریزوں کی مدد سے روہیلکھنڈ پر فوج کشی کی اور سوائے ریاست رامپور کے یہ تمام علاقہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

سال آئندہ شجاع الدولہ نے وفات پائی (۱۷۶۴ء) اور اس کے جانشینوں کے زمانے میں انگریزوں کا اثر آہستہ آہستہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ خود سعادت علی خاں کو جو شجاع الدولہ کے بعد سب سے لائق اور باخبر نواب اودھ مانا جاتا ہے، قریب قریب آدھا ملک انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا (۱۷۶۴ء) اور کہنا چاہیے کہ اس وقت سے اودھ انگریزی حکومت کے بالکل تحت میں آ گیا۔

۱۷۵۰ء کو غزوہ پٹنہ ہو ۵۹۰ گورنر جنرل دہلی کی ایسی کملی ہوئی زیادتی اور جھنڈی تھی جس کا قریب قریب تمام انگریزوں کو خوف کرنا پڑا۔

بج

اودھ کی بعد کی تاریخ اہم سیاسی واقعات سے خالی ہے اور اس ملک پر براہ راست انگریزی قبضہ ہونے تک یہاں کے باقی نوابوں یا بادشاہوں کے حالات میں صرف ان کی عیاشی کے عبرت ناک قصے محفوظ رہ گئے ہیں ان رنگ رلیوں کا مرکز لکھنؤ میں تھا جسے آصف الدولہ نے فیض آباد کی بجائے اپنا پایہ تخت بنائے بڑی ترقی دی، ایک اور قابل الذکر بات یہ ہے کہ سعادت علی خاں کے زمانے تک اودھ کے فرمانروا سلطنت دہلی کے قدیم خطاب ”نواب وزیر“ سے مخاطب کئے جاتے تھے لیکن سعادت علی خاں کے جانشین غازی الدین حیدر نے ۱۲۱۹ھ میں انگریزوں کے مشورے سے ”شاد اودھ“ کا لقب اختیار کیا اور اپنے نام کا علیحدہ سکہ جاری کیا اور یہ وہ جسارت تھی جس کا پڑوسلطان کے سوا ہندوستان کے کسی رئیس درجہ نے اقدام نہ کیا تھا کیونکہ وہ اپنی خود مختاری کے اعلان کو اب تک نام نہاد سلاطین مغلیہ کے لحاظ و ادب کے خلاف جانتے تھے۔

یوں تو پائے تخت کے قریب ہی روہیلے اور جاٹ حکومت دہلی کے خلاف شورش و بغاوت کرتے رہتے تھے اور فرخ آباد، پیلی بھیت، رامپور، بھرتپور وغیرہ مقامات میں ان کی کئی آزاد ریاستیں قائم ہو گئی تھیں لیکن اس کتاب میں ہم صرف سکھوں کی آزاد ریاست کا ذکر کریں گے جو سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد پنجاب میں قائم ہوئی۔ قوم دہسل کے اختیار سے یہ سکھ بھی اکثر جاٹ تھے مگر ایک خاص مذہبی فرقہ بن جانے کی وجہ سے انھیں اپنے دوسرے ہمعوموں اور عام ہندوؤں سے امتیاز حاصل ہو گیا اور بعد کے سیاسی اقتدار نے اس امتیاز کو اور بھی نمایاں کر دیا۔

مذہبی طور پر سکھ مت کے لوگ اول اول مسلمان صوفیوں کا ایک فرقہ سمجھے جاتے تھے اور بانی مذہب گرو نانک صاحب نے اپنی تعلیم میں وحدت وجود اور انسانی مساوات پر ہی سب سے زیادہ زور دیا ہے لیکن بعد میں جب ان کے دینی پیشواؤں نے ان کو علیحدہ سیاسی یا فوجی گروہ بنانا چاہا تو لازمی طور پر ان کے عقائد و شعائر میں بھی ہندو مسلمانوں کے مذہب سے

(۳) پنجاب

یا ہے

اختلافات پیدا ہوئے اور دسویں گرو گوبند سنگھ نے ان اختلافات کو اور زیادہ واضح کر دیا حتیٰ کہ خود سنگھ مست کے مقتدا اس تجدید و اصلاح سے ناراض ہو گئے اور گرو گوبند سنگھ کو یہ مشکل ان پر غلبہ حاصل ہوا۔

انگریزی تاریخوں میں اس بات کو بہت شد و مد سے بیان کیا ہے کہ گرو گوبند سنگھ کی مذہبی اصلاح کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ سکھوں کو مسلمانوں (اور نیز برہمنوں) کا سخت دشمن بنادیا جائے لیکن جب ہم پڑھتے ہیں کہ خود یہ گرو شاہ عالم بہادر شاہ کی فوج میں بھرتی ہو کر مسلمانوں کی طرف سے لڑنے دکن آئے تو مذکورہ بالا اقوال کی وقعت باقی نہیں رہتی البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سکھوں نے جب کبھی ست نامیوں کی طرح مشرقی پنجاب کے کوہستانی اضلاع میں سر اٹھایا، تو ان کی سختی سے تنبیہ و تادیب کی گئی اور اس سلسلے میں شاہی افواج کے ساتھ ان کی کئی خونریز لڑائیاں ہوئیں آخر گرو گوبند سنگھ کا جانشین بندہ فریخ پیر کے عہد میں محصور ہو کر گرفتار ہوا اور وہلی میں سخت عقوبتوں کے ساتھ قتل کر دیا گیا (۱۱۲۱ھ) تو اس وقت یہ شورش بھی فرو ہو گئی۔

سکھوں کی بارہوی

لیکن جس وقت احمد شاہ ابدالی کے حملوں اور اندرونی جھگڑوں نے دربار وہلی کی فوجی قوت کو کمزور کر دیا تو سکھوں کو دوبارہ سر اٹھانے کا موقع ملا اور ان کے سربراہ اور وہ زمینداروں نے جا بجا اسی بارہویں صدی ہجری کے وسط میں وہ ”سکھیں“ یعنی جتھے بنانے شروع کئے جو بعد میں خامی قوی ریاستیں

۱۔ شلا و پھول گرین کی کتاب ”رجیت سنگھ“ نیز اسکندر ہسٹری صفحہ ۴۵۴ وغیرہ۔

۲۔ یہ ایک محدود ہی قوت تھا جس میں بالعموم ہندو پیشہ ور داخل ہو گئے تھے اور ان کی سب سے بڑی تعداد نارنول (ربا ست پٹیل) کی نواح میں آباد تھی۔ یہیں کسی ستنامی سے کو توالی کے کسی جوان کا جھگڑا ہوا اور اس نے بڑھتے بڑھتے بلوے بلکہ بغاوت کی صورت اختیار کر لی حتیٰ کہ شورش فرو کرنے کے لیے شاہی فوجوں کو بھیجا پڑا اور خامی باقاعدہ جنگ کے بعد یہ فساد رفع ہوا۔ یہ تہذیب عالمگیر کا واقعہ ہے اور اپنی پہلی تاریخ (برائے میٹرک) میں ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔

بن گئیں ان مسلوں کی ابتدائی حیثیت قزاقانہ گروہوں کی سی تھی اور ان کے شرکا گروہوں کا علاقہ لوتے پھرتے تھے، ان کا اس زمانے میں زیادہ زور سرہند و لاہور کی نواح میں تھا اور انہی شہروں کو لوٹنے کی نرا میں ایک مرتبہ احمد شاہ ابدالی نے خاص سکھوں پر خون کشی کی (۱۷۶۲ء) اور تلج کے پار (برنالے کے قریب) انھیں سخت شکست دی اور بہت ساناواں جنگ و سول کیا لیکن اس شکست نے سکھوں کو بہت فائدہ پہنچایا، عام قومی مصیبت میں وہ اپنے اندرونی جھگڑے بھول گئے اور دوبارہ انھوں نے مل کر سرہند پر چڑھائی کی اور شہر کو فتح کر لیا۔ احمد شاہ ابدالی سال آئندہ بھی پنجاب آیا تھا لیکن سرہند کی طرف بڑھنے کی فرصت نہ ملی اور اس نے خود ہی سکھ سردار آلا سنگھ کو سالانہ پیش کش کے وعدے پر ضلع سرہند کی حکومت سونپ دی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب کہ ایک بادشاہ کی جانب سے سکھوں کو ایک محدود ضلع کا حاکم تسلیم کیا گیا اور اس کے بعد سے ان کی مسلمین مسلمان خانقوتوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر روز افزوں قوت حاصل کرنے لگیں، ان مسلوں کے مفصل حالات اس تاریخ میں لکھنے بے محل ہوں گے، یہاں مختصر طور پر یہ لکھنا کافی ہے کہ ان کی بارہ مسلوں میں سے پانچ سب سے زیادہ طاقتور اور مشہور تھیں۔ اچھو لکیاں، اہلو والیہ، بھنگی، کہنے یا، اور رام گڑھیا آخر کی چاروں مسلوں کا علاقہ دریائے ستلج کے شمال میں تھا، اور اچھو لکیاں کے جتنے میں جو سکھ زمیندار شریک تھے ان کی اولاد آج بھی پٹیالہ، جیند وغیرہ این روے ستلج اس پار کی بڑی بڑی ریاستوں کی وارث ہے۔

لیکن گوبرنلے کی جنگ کے بعد بارہویں صدی ہجری کے اخیر تک ان سکھ مسلیموں کی قوت برابر بڑھتی رہی تاہم ان میں باہم کوئی سیاسی اتحاد نہ تھا اور ان کے سردار آئے دن آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، یہی وہ کمی تھی جسے رنجیت سنگھ (ولادت ۱۷۹۹ء) کی اولوالعزمی نے دور کیا اور اس لیے سکھ قوم کی سیاسی قوت کا بانی مہانی اسی کو سمجھنا چاہئے اور اگرچہ یہ قوت کچھ زیادہ دیر پا نہ تھی بلکہ کہنا چاہئے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرنے ہی اس کا

باب

شیرازہ بچھ گیا تاہم سکھ ریاست کی یہ کمزوری بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ خود رنجیت سنگھ اپنی قوم میں نہایت غیر معمولی قابلیت کا سردار تھا۔

ابتدا میں رنجیت سنگھ اپنے باپ کے بعد سکھوں کی ایک چھوٹی مہل کا حاکم ہوا تھا جو اپنے مرکزی مقام کے نام پر سکھر چکیا کہلاتی تھی سکھر چک کو رنجیت سنگھ کے بزرگوں نے امرتسر کے ضلع میں آباد کیا تھا لیکن اسی زمانے سے ان کی خزا قانہ یورشوں کا حلقہ دریائے جہلم تک وسیع تھا اور یہی سبب ہوا کہ جب احمد شاہ ابدالی کے پوتے شاہ زماں کی بھاری توہین پنجاب سے جاتے وقت دریائے جہلم کی ریتی میں دھنس گئیں تو اس نے رنجیت سنگھ سے وعدہ کیا کہ اگر ان کو بہ احتیاط نکلوا کر کابل بھیج دیا گیا تو اسے راجہ کالقب اور شہر لاہور کی حکومت عطا کر دی جائے گی (۱۷۹۹ء) رنجیت سنگھ نے اس خدمت کو مستعدی سے انجام دیا اور سال آئندہ راجہ کے شاہی خطاب کے ساتھ لاہور میں داخل ہو کر باضابطہ اس شہر پر قابض ہو گیا۔

واضح رہے کہ لاہور پر کئی سال سے افغانیوں کی حکومت برائے نام باقی رہ گئی تھی ورنہ اس پر بھی سکھ سردار قابض تھے اور اس لیے آئندہ چند سال تک رنجیت سنگھ کی انھی سکھ سرداروں سے لڑائیاں ہوتی ہیں جن کے آخر میں قریب قریب پنجاب خاص کے تمام علاقوں میں اس کی سیادت تسلیم کی جانے لگی اور این روئے ستلج کی سکھ ریاستوں کے معاملات میں بھی وہ مداخلت کرنے لگا بلکہ کچھ روز کے واسطے انبالے پر قابض ہو گیا لیکن یہ وہ زمانہ ہے جب کہ انگریزوں کی پہلی مصلحت ہو گئی تھی اور ہلکر سے لڑائیوں کے ضمن میں ستلج اس پار کے سکھ سرداروں تک ان کا اثر پہنچ گیا تھا، معلوم ہوتا ہے ان سکھ سرداروں کو اپنے ہمقوم راجہ کاباج گزار بننا گوارا نہ تھا اور اس کی جنگی قوت کا وہ مقابلہ نہ کر سکتے تھے لہذا انھوں نے اپنی حفاظت کے عوض میں انگریزوں کی سیادت قبول کر لی اور انگریزوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے عہد لے لیا کہ وہ ستلج اس پار کے علاقوں سے کوئی سروکار نہ رکھے گا۔ (عہد نامہ امرتسر ۱۸۰۹ء)

باب
نجات
ملتان
کشمیر

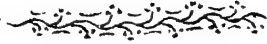
شمالی ہند کی سب سے بڑی قوت سے مصالحت کرنے کے بعد
ہمارا راجہ رنجیت سنگھ کو سولج کے شمال میں مزید فتوحات کی بخوبی فرصت
مل گئی اور اس نے چند ناکام حملوں کے بعد آخر کار شہر ملتان کو
فتح کر لیا (۱۷۹۹ء) جہاں کا حاکم مظفر خاں کئی سال تک حیرت انگیز
شجاعت و مردانگی سے سکھوں کا مقابلہ کرتا رہا تھا اور آخر میں بھی
جب تک وہ زندہ رہا قلعہ ملتان کو سکھ فتح نہ کر سکے۔ کشمیر کی فتح میں رنجیت سنگھ
کو ملتان کی فتح سے بھی زیادہ نقصانات اٹھانے پڑے اور یہاں کی افغانی
حاکموں نے کئی بار اسے سخت شکستیں دیں، لیکن ۱۸۱۹ء میں جب کہ کشمیر کا
افغان ماکو دربار کابل کے اندرونی جھگڑوں میں حصہ لینے افغانستان چلا گیا
تھا، سکھوں نے پھر اس ملک پر حملہ کیا اور اس مرتبہ ان کی کوئی خاص
مزا حیرت نہ ہوئی، اور یہ خوبصورت صوبہ ہمارا راجہ رنجیت سنگھ کی حکومت
میں داخل کر لیا گیا۔

رنجیت سنگھ کے آخری عہد کی لڑائیاں زیادہ تر پیشاور ڈیرہ جات
کے علاقے میں ہوتی رہیں اور اگرچہ حکومت کابل کی اندرونی کمزوری اور
سرحدی پٹھانوں کی باہمی نا اتفاقی سے پیشاور پر ۱۸۳۷ء میں سکھوں کا
قبضہ ہو گیا تھا لیکن یہ قبضہ جو کھوں سے خالی نہ تھا اور انھیں آہستہ آہستہ
برس تک اس کے واسطے بہت سی قیمتی جانیں اور بے شمار روپیہ صرف
کرنا پڑا اور کبھی حکومت کابل سے اور کبھی یہاں کے باشندوں سے مسلسل لڑائیاں
ہوتی رہیں جن میں شاہ سید احمد اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے مذہبی جہاد کی
روح پھونک دی تھی۔

سکھوں کی سلطنت پنجاب پر انگریزی تسلط کے حالات آئندہ
ابواب میں ہماری نظر سے گزر رہے ہیں گے یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ
یہ سلطنت دہلی اور کابل کی حکومتوں کی کمزوری کے زمانے میں رنجیت سنگھ
کی ذاتی قابلیت و مستعدی سے قائم ہوئی تھی اور اس کی وفات (۱۸۳۹ء)
کے ساتھ ہی اس کا خاتمہ ہو گیا کیونکہ ہمارا راجہ رنجیت سنگھ کے بعد سکھوں میں

ب

کوئی ایسا لائق اور صاحب تدبیر سردار پیدا نہ ہوا جو اپنی جنگجو قوم کو پوری طرح قابو میں لا کر متحد رکھ سکے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیمتی میراث کو اس نئی توت کے ہاتھ میں پڑنے سے بچا لیتا جو شمالی ہند میں سلاطین مغلیہ کی جانشین ہو گئی تھی۔



باب ۶

اہل یورپ کی آمد ہند میں

پہلی فصل - مغربی ممالک سے بحری تجارت کا آغاز

ہندوستان کی تاریخ میں دسویں صدی ہجری (سولہویں عیسوی) کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ اسی صدی میں مغلوں کی عظیم الشان سلطنت قائم ہوئی اور شیر شاہی انتظامات اور اکبری فتوحات نے مدت دراز کے بعد ممالک ہند کی ایک مرکزی حکومت کے ماتحت شیرازہ بندی کی لیکن تمدن انسانی کی تاریخ میں اس سے بھی بڑھ کر اہم واقعہ یہ ہے کہ اسی صدی میں ہندوستان اور نیز ”نئی دنیا“ کے ساتھ اہل یورپ کی براہ راست بحری آمد و رفت کا آغاز ہوا اور دسویں صدی ہجری کے ابتدائی سینے سے پرتگال کے جہاز سواہل ہند تک آئے جانے لگے۔ اس وقت تک دغانی جہاز ایجاد نہیں ہوئے تھے اور اس لیے اہل پرتگال و ہسپانیہ کی جہاز رانی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ ایک طرف

کلبیس بحر اوقیانوس کو طے کر کے امریکا پہنچا (۱۴۹۲ء) اور دوسری طرف
 واسکو د گاما اپنے تین بادبانی جہازوں کو مغربی افریقہ کے گرد چکر دیکر ہندوستان
 کی جنوبی بندرگاہ کالی کٹ تک صبح سلامت لے آیا۔ (۱۴۹۸ء مطابق سنیۃ)
 اگرچہ یورپ سے ہندوستان کی طرف بہت سی قومیں آئیں اور
 بالآخر انگریز یہاں قابض ہو گئے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ سب سے پہلے
 پرتگالی ہندوستان کی طرف آئے اور یورپ کی دوسری قوموں نے ان کی
 پیروی کی اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ پرتگالی اور سپانوی دونوں ہمسایہ قومیں فن جہازرانی
 میں سب سے پیش پیش تھیں۔ برخلاف ان کے دوسری قومیں اس فن میں
 ان کی خوشہ چیں میں نیز ان سلطنتوں کے حکمران بھی جو پندرھویں صدی کے
 آخری حصے میں حکومت کرتے تھے بڑے حوصلہ مند ثابت ہوئے انھوں نے
 اپنے اہل قوم کی جو آگے بڑھنا چاہتے تھے خوب حوصلہ افزائی کی۔ اس کے
 علاوہ اس زمانے کی مذہبی شکست بھی اسپین اور پرتگال کی ترقی کا باعث
 ہوئی ہے۔ بات یہ تھی کہ پندرھویں صدی میں لو تھر کی تبلیغ سے یورپ
 میں ایک جدید پروٹسٹنٹ مذہب پیدا ہو گیا تھا جس کے پرانے
 مذہب والے جو اپنے آپ کو رومن کیتھولک کہتے تھے مخالف ہو گئے
 یورپ ان کا پیشوا تھا۔ وہ رومن کیتھولک افراد اور سلطنتوں کی مدد کرنا
 اپنا فرض سمجھتا تھا۔ چنانچہ ۱۴۹۳ء کا یہ بڑا دھچک واقعہ ہے کہ پوپ
 الکزنڈر ششم نے کرۂ ارض پر ایک لکیر کھینچ کر دنیا کے دو حصے کر دئے مغربی
 حصہ اسپین کو اور مشرقی حصہ پرتگال کو دے دیا تاکہ وہ غیر معلوم اقطاع کو منکشف
 کر کے قبضہ کر لیں اور پروٹسٹنٹ قومیوں کو آنے نہ دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین
 کی جدوجہد مغرب کی طرف منقطع ہو گئی اور پرتگالی مشرق کی طرف
 آئے۔ چونکہ اس زمانے میں پروٹسٹنٹ قومیں ولندیزی اور انگریز
 زمتے قوی نہیں تھے کہ پوپ کے اس حکم کے عملی الزم آگے بڑھ سکیں۔
 اس لیے آئندہ سو سال تک مشرق میں صرف پرتگالیوں کا بول بالا رہا۔
 ۱۶۴۰ء سے ۱۸۰۸ء تک کئی پرتگالی جہازراں نے بے بعد و گری

اب

افریقہ کے مغربی ساحل کے برابر برابر جنوب تک پہنچتے رہے اور ان کا بحری
 سورما شاہزادہ ہتھری ان کی ہر وقت حوصلہ افزائی کرتا تھا اور اس کی وجہ سے
 انھیں انڈیا اور جہاز رانی کا شوق بڑھتا رہا۔ ۱۸۰۰ء میں برہما موڈیس ٹوفان
 کے تھپیڑوں سے راس امیتھ تک پہنچ گیا اور اس طریقے سے بحر ہند کا راستہ دریافت
 ہو گیا۔ چنانچہ اس کی بدولت دوسرے سال پیڈرو و بھر ہند کے راستے سے
 ساحل ملا بار پہنچ گیا اور اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ جنوبی مشرقی راستے سے
 ہندوستان پہنچنا آسان ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۰۵ء میں واسکو دی گاما
 نہایت اطمینان سے راس امیتھ کا ٹیکر کاٹ کر بحر ہند میں داخل ہو گیا اور
 اس کے بعد مئی کے مہینے میں کالی کٹ کے ساحل میں لنگر انداز ہو گیا۔
 سواحل ہند کی بحری تجارت ان دنوں اہل عرب کے ہاتھ میں تھی
 لیکن پرتگیزیوں نے مختلف تدبیروں سے کالی کٹ کے راجہ سے تجارت
 کی اجازت حاصل کر لی، اس راجہ کو وہ اور دیگر اہل فرنگ دوزمورن
 اور اہل عرب ”سامری“ کے لقب سے یاد کرتے تھے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ
 پرتگیزیں ہزاروں کی حیثیت تاجرانہ نہ تھیں بلکہ ابتداء سے یہ ہزاروں شاہ
 پر نکال کے بحری عہدہ دار تھے اور اسی لیے واسکو دی گاما کی بحیریت واپسی
 پر اس کے وطن میں سرکاری طور پر خوشی منائی گئی اور اسی زمانے سے
 اہل پرتگال ایشیا میں اپنی سلطنت قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگے کہ
 جس طرح امریکہ کے دریافت شدہ جزائر پر ہسپانیہ کا قبضہ ہو گیا تھا اسی طرح
 بحر ہند کے جزائر و ممالک میں پرتگال کا تسلط ہو جائے! چنانچہ دیر ۱۵۰۰ سال
 کے بعد ہی ان کی حکومت نے تیرہ جہازوں کا بیڑا ہندوستان کی جانب
 روانہ کیا جس میں بارہ سو سپاہی سوار تھے، یہ بیڑا ہوا کی ناموافقت سے
 جنوبی امریکا کی جانب بہ گیا اور وہاں سے بہت دن کے بعد کالی کٹ
 پہنچا مگر پہنچتے ہی اس کے سردار کی زخمی زمرورن اور عرب سوداگروں سے
 لڑائی ہو گئی جس میں پرتگیزیوں کے صد ہا آدمی مارے گئے اور وہ کالی کٹ
 میں نہ ٹھہر سکے بلکہ ان کو مجبوراً کو چین کے راجہ سے امداد لینے پڑی جو

پرتگیزیوں
 کے پاس
 منصوبے

ب

کالی کٹ کے راجہ کا رقیب تھا۔

اس مہم کی ناکامی کے بعد پھر واسکو د گاما میں جہازوں کا پٹر لے کر ہندوستان آیا اور کوچین و کنا نور کے رئیسوں کو لا کر اس نے کالی کٹ پر باقاعدہ فوج کشی کی لیکن اس میں بھی چنداں کامیابی نہ ہوئی اور پرتگیز اپنے کچھ سپاہی کوچین میں چھوڑ کر واپس چلے گئے، اسی زمانے میں شاہ پرتگال نے اپنے مذہبی پیشوا پاپائے روم سے ایک فرمان حاصل کیا جس میں اس سےجی بادشاہ کو حبش، عرب، ایران و ہند کی تجارت، فتوحات اور جہاز رانی کا مختار تسلیم کیا گیا اور ۱۵۰۵ء (۱۰۱۵ھ) میں اس نے ایک شخص المیڈا کو ہندوستان میں اپنا نائب یا وائسرائے بھی مقرر کر دیا۔

اب پرتگال کی یہ کارروائیاں اگرچہ مضحکہ انگیز معلوم ہوتی ہیں لیکن ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ابتدائی سے مالک ہند میں اپنی حکومت قائم کرنے کی فکر میں تھے اور اسی لیے ان کی عرب تاجروں یا ہندی رئیسوں سے لڑائیاں ایک حد تک سیاسی تھیں جن کے ذکر میں پرتگیزوں نے حسب دستور بہت کچھ مبالغے سے کام لیا ہے، ان کو تفصیل سے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ کئی سال تک جدوجہد کرنے کے باوجود پرتگیزوں کو ملک گیری کے منصوبوں میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور ان کے مشہور بحری سردار ال بوکرک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے مغربی ساحل ہند کے ایک جزیرے کو آ (یا الہاس) کو فتح کر لیا جو ان دنوں سلطنت بجا پور کے علاقے میں داخل تھا (۱۵۱۱ء) پرتگیزی مصنفوں کا بیان ہے کہ اس فتح سے وہاں کے باشندے بہت خوش ہوئے تھے لیکن فتنہ دوں نے جس بے دردی سے وہاں قتل عام اور غارت گری کا حکم دیا اس سے ان مصنفوں کے اقوال کی تکذیب ہوتی ہے۔

۱۔ یہ حالات کم و بیش تفصیل کے ساتھ ہندوستان کی تمام انگریزی تاریخوں میں درج ہیں لیکن ہمارے اس سے مستند ماخذ (پیریل گزٹ ٹیرری (جلد دوم صفحہ ۴۷ تا ۴۵۰) جلد دوازہم صفحہ ۲۵۰ وغیرہ) نیز پیکر ایکسفورڈ ہٹری موڈ ۲۳ وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال گوآ پرتگال کا قبضہ ہو گیا اور اس کو انھوں نے اس قدر مستحکم جنگی مقام بنایا کہ اپنے ہمسائے اہل ہند (خاص کر مرہٹوں سے) اور نیز ولندیزیوں سے بار بار لڑائیاں ہونے پر بھی یہ بندرگاہ اور اس کے مضافات میں کوئی تین ہزار مربع میل کا رقبہ آج تک ان کے زیر نگین ہے۔

ہندوستان میں یہ مقام (گوآ) یورپ والوں کا پہلا مقبوضہ تھا جسے پرتگیزیوں کی بحری تجارت اور جنگی قوت کی بدولت نہایت رونق حاصل ہوئی لیکن اس قوم کی سفاکی اور بد اخلاقی ضرب المثل ہے اور لوگوں کو سخت ظلم و جبر سے عیسائی بنانا اس کی سیاسی حکمت عملی میں داخل تھا لہذا ایشیا میں پرتگیزی حکومت کو کبھی قبولیت حاصل نہ ہو سکی اور ہندوستان میں جہاں کہیں مستقل اور بڑی حکومتیں قائم تھیں، وہاں پرتگیزیوں کا اتنا زور نہ پیل سکا کہ گوآ کی طرح دوسرے مقامات پر بھی متصرف ہو جاتے، گجرات کی بندرگاہ دیویدا دیپ کو انھوں نے سلطان گجرات سے مصالحتانہ طریق پر حاصل کیا تھا (۱۵۱۱ء مطابق ۱۵۱۲ء) لیکن تقریباً ایک صدی بعد بنگالے میں جب انھوں نے بنگالی کو قلعہ بند کر کے خود مختار حکومت کی شان بنانی چاہی تو شاہجہاں کے حکم سے وہ جبراً وہاں سے محال دئے گئے اور ان کے جو لوگ بچ کر بھاگ سکے انھوں نے بنگالے کے دشوار گزار اسالی مقامات میں رہ کر بحری قزاقی کا پیشہ اختیار کر لیا۔

ان سب باتوں کے باوجود پرتگیزیوں کی آمد و رفت اور جنگی نوآبادیوں سے مجموعی طور پر ہندوستان کی بحری تجارت کو فائدہ پہنچا اور انھیں نے یورپ کی دوسری قوموں کو اس ملک کا راستہ دکھایا۔ خود ان کا ملک (۱۵۸۰ء) میں ہسپانیہ کی سلطنت کا جزو بن گیا تھا اور اس واقعے نے ان کی بحری اور تجارتی رتنی کو اور بھی نقصان پہنچایا کہ یورپ کی وہ قومیں جو ہسپانیہ کی دشمن تھیں اب پرتگیزیوں کو بھی ہر جگہ زک پہنچانے لگیں اور وہ اس امداد سے جو پہلے ان کی قومی حکومت دیا کرتی تھی، محروم ہو گئے پھر گو نصف صدی کے بعد حکومت پرتگال ہسپانیہ سے علیحدہ ہو گئی لیکن اس عرصے میں ولندیز اور انگریز تاجر

پرتگیزیوں کا بڑا دشمن

۱۰

ایشیائی سمندر میں پہنچ گئے تھے اور ان قوی رقبوں کے مقابلے میں پرتگیزیوں کی تجارت وقت کو پہلا سا فروغ پھر حاصل نہ ہو سکا۔ بلکہ گیارھویں صدی بحری اترھویں عیسوی کے وسطی سن میں لنکا اور ملیبار پر ان کے جس قدر تجارتی مقبوضات تھے قریب قریب سب ولندیزیوں نے چھین لیے اور ہندوستان میں ان کی قوم کی آئندہ تاریخ و سرور و افلاس و مصائب کی عبرت ناک داستان ہے کہ خشکی کی طرف سے تو ویسی رئیس ان پر دباؤ ڈالتے تھے اور سمندر میں زیادہ طاقتور مغربی قومیں ان کی جگہ لیتی چلی جاتی تھیں۔“

ولندیزی تاریخ

مغربی قوموں میں سے سب سے پہلے ولندیزیوں یا ہالینڈ والوں نے پرتگیزیوں کا زور توڑا تھا۔ اول اول ان ولندیزیوں کی ایشیائی تجارت نے پرتگیزیوں ہی کی وساطت سے ترقی پائی۔ اور ایمنٹ و رپ، امسٹرڈم وغیرہ شہر شمالی یورپ میں ایشیائی اجناس کی بہت بڑی منڈیاں بن گئے جہاں پرتگیزی جہاز ممالک ایشیا کا مال لاتے اور یورپ کی ایشیا مشرق کی طرف لے جاتے تھے۔ پھر وہاں کے لوگوں نے خود ان مغربی ممالک سے تجارت کرنی چاہی اور انگریزوں کی طرح اول اول اس کوشش میں رہے کہ یورپ و ایشیا کے شمال سے مشرق کا بحری راستہ دریافت کریں۔ اس میں ان کو ناکامی ہوئی اور آخر انھوں نے بھی بحر ہند کا وہی (افریقہ کے گرد سے آنے کا) راستہ اختیار کیا جس سے اہل پرتگال ہندوستان پہنچے تھے۔ یورپ کی اس دوسری قوم کا پہلا ناخدا جو افریقہ کے گرد ہو کر واسکو د گاما سے ٹھیک ایک صدی کے بعد ایشیائی سمندروں تک پہنچا باؤٹ مین تھا۔ (۱۵۹۶ء مطابق سن ۱۰۰۰ھ)۔

اس کے بعد ولندیزیوں یا ڈچوں کے اور تجارتی جہاز بھی آنے جانے لگے اور ان کی پرتگیزیوں سے شکست شروع ہو گئی۔ لیکن اس موقع پر ان کی اور اہل پرتگال کی آمد کا یہ فرق پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ولندیزیوں کی اصلی غرض ایشیا آنے سے تجارت تھی اور اگرچہ یہ تجارت شروع ہونے کے دو تین سال بعد ہی ان کے سب تاجروں نے مل کر تقریباً ۱۰ لاکھ پونڈ کے سرمائے سے

ایک مشترکہ کمپنی (دی یونائیٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی) اوف دی ندرلینڈز قائم کی تھی جو ان کی ملکی حکومت کی زیر نگرانی تھی تاہم پرتگیزیوں کی طرح اس کمپنی کے جہاز یا ملازمین براہ راست حکومت کے ملازم نہ تھے اور نہ پرتگیزیوں کی طرح انھیں اول سے مالک ایشیا کی فتح کا سودا تھا۔ کم سے کم وہ ایسے ملکوں پر ہاتھ ڈالنا نہ چاہتے تھے جہاں اہل ایشیا کی مستقل اور قوی حکومتیں موجود تھیں۔

بہر حال ان کی آمدورفت شروع ہونے پر بہت جلد اہل پرتگال سے تجارتی رقابت اور جنگ چھڑ گئی۔ جزیرہ جاوا کے شہر بٹے دیا کے قبضے کو اہل پرتگال نے چنداں اہمیت نہیں دی لیکن جب ولندیزیوں نے ۱۵۸۱ء (۹۸۰ھ) میں جزیرہ ملاکا پر قبضہ کر لیا تو پرتگیزیوں کی تجارت کو سخت صدمہ پہنچا اور ولندیزیوں نے ان جزائر ملایا (شرقی) کی طرف جہاں سے گرم مصالحے یورپ جاتے تھے، اپنے رقبوں کا آنا جانا دشوار کر دیا۔ پھر انھوں نے لنکا سے پرتگیزیوں کو شکست دے کر نکال دیا اور تین سال کی مسلسل جنگ میں رفتہ رفتہ حاصل طبعیات کے تمام پرتگیزی مقبوضات چھین لیے (۱۶۶۳ء مطابق ۱۰۷۳ھ) یہی زمانہ ہے جس میں ولندیزیوں کی تجارتی کوٹھیاں نہ صرف کورومندل اور بنگالے کے سواحل پر قائم ہوئیں بلکہ ڈھاکہ، پٹنہ، آگرہ، اور احمد آباد (گجرات) میں بھی ان کے مستقل کارخانے بن گئے اور یورپ و ایشیا کے مابین تجارت کا سب سے بڑا ذریعہ ان کی کمپنی ہو گئی۔

ولندیزیوں کو اس زمانے میں تجارتی دولت اور بحری قوت نے یورپ والوں کا محسوس بنادیا تھا اور یورپ ہی میں انگریز اور فرانسیسی ہمسایوں سے ان کی وہ جنگ چھڑی جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے ۱۷۱۳ء مطابق ۱۱۲۴ھ تک جاری رہی۔ اس کشمکش نے ولندیزیوں کی قلیل التعداد

۱۔ ان جزیروں کو انگریزی میں عام طور پر (Spices Islands) یعنی ”مصلحے کے جزیرے“ کہا جاتا ہے لیکن اس پورے مجمع الجزائر کا نام ”ملایا پروشیا“ یا جزائر ملایا ہے اور مذکورہ بالا جزیرے اس کا مشرقی حصہ ہیں۔ لہذا ہم نے انھیں جزائر ملایا شرقی موسوم کیا۔

باب

قوم کو بہت مفصل کر دیا اور جنگ کے آخری زمانے میں وہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ فرانسیسیوں کے مقابلے میں انگریزوں کے حلیف ہو جائیں۔ اس اتحاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں ایشیا کی تجارت میں انگریزوں کو حصہ دار بنانا پڑا اور گوان کی بحری قوت نے فرانسیسیوں کی ہندوستانی تجارت کو کافی نقصان پہنچایا، لیکن وہ خود بھی یہاں زیادہ فروغ و سرسبزی نہ حاصل کر سکے اور بارہویں صدی بحری کے وسط میں ان کی تجارت و فتوحات کا مرکز جزائر شرق الہند کی طرف ہٹ گیا، جہاں اب تک کئی وسیع و زرخیز جزیروں پر ان کا قبضہ ہے۔

ہندوستان میں دہلی کے انگریزوں کے غلبہ پانے کا حال اگلی فصل میں ہماری نظر سے گزرے گا۔ اس جگہ مختصر طور پر یورپ کی دوسری قوم کا حال بیان کرنا مقصود ہے جنہوں نے برنگال اور ہالینڈ والوں کی دیکھا چھی ممالک ایشیا سے تجارت کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں اہل ڈنمارک کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاوہ جن کی گیارہویں صدی بحری میں سیرامپور (بنگال) میں بہت بڑی تجارتی کوٹھی قائم تھی، جرمن اور آسٹریا والوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو ایشیا سے تجارت کے بہانے اپنی بحری قوت کو بڑھانا چاہتے تھے۔ وسطی یورپ کے یہ ممالک ان دنوں سیاسی طور پر آسٹریا کے بادشاہ کے ماتحت تھے اور وہ ”شہنشاہ جرمانیہ“ یا قیصر کہلاتا تھا۔ اور ہر چند اس زمانے میں بحری تجارت اور جنگی جہازوں کو یہ اہمیت حاصل نہ ہوئی تھی جو آج کل حاصل ہے، پھر بھی دسویں صدی بحری میں جہاز رانی کے فروغ اور ہسپانیہ و پرتگال کے امریکہ اور ایشیا میں ملکی مقبوضات کا حال سن سن کر یورپ کی باقی تمام حکومتوں کو رشک آتا تھا۔ اور وسطی یورپ کے بعض مدبرین اس خیال سے بھی غالی نہ تھے کہ محل وقوع کی وجہ سے بحری تجارت میں انھیں جو دشواریاں ہیں، ممکن ہو تو انھیں اپنی بحری قوت بڑھا کے دور کیا جائے۔ اسی قسم کی مصلحتیں تھیں کہ چند سال کے نائل و تذبذب کے بعد جرمن شہنشاہ شہر اوسٹینڈ کے سوداگروں کا سرپرست بن گیا جنھوں نے بارہویں صدی بحری

دیگر فرنگی اقوام کی تجارت۔

(اٹھارویں عیسوی) کے اوائل میں ہندوستان سے تجارت شروع کی گئی ملک
 بلجیوم کی یہ بندرگاہ (اوسٹینڈ) ان دنوں جرمن شہنشاہ کے زیر ریاست تھی اور
 یہاں اکی بھری تجارت کو ترقی دینے سے اس کا متناہ تھا کہ رفتہ رفتہ اس مقام کو
 سلطنت جرمانہ کی بحری قوت کا ایسا مرکز بنادے کہ ہالینڈ اور انگلستان پر
 اس کا دباؤ رہے تجارت میں بھی اول اول ”اوسٹینڈ کمپنی“ کو بہت
 فتنہ ہوا اور شہنشاہ سے باضابطہ تجارت ملنے کے چوتھے سال ۱۶۲۲ء
 ۱۶۲۹ء اس کے حصہ داروں میں ۲۲ فیصدی سے بھی زیادہ سالانہ منافع
 تقسیم کیا گیا۔ اس کمپنی نے کورومندل اور بنگالے میں مہنگی کے کنارے انگریزوں اور ولندیزیوں
 کی تجارتی کوٹھیوں کے قریب اپنے کارخانے کھولے تھے اور اسی قوموں نے
 اس کے قیام کی سخت مخالفت کی آخر شہنشاہ بعض مقامی فوائد کے
 عوض میں اس کمپنی کی سرپرستی سے دست بردار ہو گیا اور ادھر ولندیزی اور
 انگریز تاجروں نے مہنگی کے فوجدار (یا صاحب ضلع) کو مختلف جیلوں سے
 جرمن تاجروں کا دشمن بنادیا اور اس نے تھوڑی سی فوجی جمعیت بھیج کر انہیں
 جبراً اپنے علاقے سے خارج کر دیا اور ان کی تجارتی کوٹھی جس کے گرد انھوں نے
 خندق اور جنگی برج تیار کئے تھے چھین کر منہدم کرادی ۱۶۳۱ء مطابق ۱۲۵۰ھ
 اسی سال سویڈن میں ایک تجارتی کمپنی بنی اور اوسٹینڈ کمپنی کے
 بعض شرکاء بھی اس میں حصہ دار ہو گئے۔ یہ کمپنی زیادہ تر چین و جاپان سے تجارت
 کرنی چاہتی تھی لیکن جرمن تاجروں کی شرکت کی وجہ سے رقیبوں نے بھرپور
 کہ یہ محض اوسٹینڈ کمپنی کو ایک دوسرے نام سے جاری رکھنے کی کوشش ہے اور آخر
 تھوڑے ہی دن بعد اس کمپنی کا کاروبار بند کر دیا گیا۔

آخر میں پروشیا کے مشہور بادشاہ فریڈرک (دی گریٹ) نے
 اپنی رعایا کو مالک ایشیا سے تجارت کرنے کی ترغیب دی اور خود بھی ”سنگال کمپنی“

۱۵۔ ریاض السالطین میں فرنگی تاجروں کی باہمی رقابت اور اس کا اثر اسی کے حالات تفصیل سے لکھے
 ہیں (صفحہ ۲۵۱) نیز دیکھو گزشتہ جلد دوم صفحہ ۴۶۵۔

باب

کے نام سے تاجروں کی ایک جماعت مرتبہ کی ۱۵۲۷ء مطابق ۱۶۶۱ء لیکن اول تو اس کو ابتدا میں خسار ادا دوسرے کچھ حکومت بنگالہ کی مخالفت اور کچھ دوسرے فرنگیوں کی رقابت سے اہل پروشیہ کو ہندوستان کے اس صوبے میں قدم جلانے کا موقع نہ مل سکا اور چند روز چوری چھپے تجارت جاری رکھنے کے بعد ان کی یہ کمپنی ٹوٹ گئی۔

دوسری فصل: انگریزی کمپنی کے ابتدائی حالات

انگریزوں کی ابتدائی کوششیں

انگریز ملاحوں کو دسویں صدی ہجری کے بالکل شروع میں ہندوستان پہنچنے کا شوق دامنگیر ہو گیا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ فن جہاز رانی میں وہ برتگیزیوں کے شخص مقلد نہیں بلکہ ابتدا سے ہمسری کے دعویدار تھے۔ اور گوئیے مالاکہ تک جہاز لیجانے میں سب سے بڑی کامیابیاں پر نکال اور ہسپانیہ کو نصیب ہوئیں لیکن انگریز بھی برابر اس دھن میں لگے رہے اور شمال مغربی راستے سے ایشیا پہنچنے کی کوشش میں جزیرہ نیو فونڈ لینڈ سب سے پہلے انہی کے ملاحوں نے دریافت کیا۔ پھر دسویں صدی ہجری (سولھویں عیسوی) کے وسط میں ان کے ایک بحری سردار نے یورپ و ایشیا کے شمال (یعنی بحر ہند شمالی) کے راستے مالاکہ ایشیا تک پہنچنے کی کوشش کی اور خود اس سردار کے ہلاک ہونے کے باوجود اس کے بعض رفیق شمالی روس کے ساحل (بحر سفید) تک پہنچ گئے۔ یہاں سے وہ شاہ روس کے پاس تختہ ماسکو آئے اور مالاکہ روس کے راستے ایران و بخارا سے تجارت کرنے کی اجازت حاصل کی اسی طرح اور کئی مرتبہ انگریز جہاز راں انہی شمالی راستوں سے ایشیا پہنچنے کی کوشش کرتے رہے لیکن اس میں انہیں کامیابی نہ ہوئی اور انگلستان کے

باب

جو چار سوداگر سب سے پہلے ہندوستان آئے وہ بھی بڑی راستوں سے یہاں تک پہنچے تھے (۱۵۸۳ء مطابق ۱۹۱۳ء) گو آکے پرتگیزیوں نے انھیں پکڑ کر قید میں ڈال دیا لیکن آخر کار انھیں رہائی مل گئی اور ایک شخص بہت سی مشکلات برداشت کرنے کے بعد واپس اپنے وطن پہنچ گیا۔

لیکن انگریزوں کی ہندوستان سے تجارت کا اصلی آغاز اس وقت ہوا جبکہ ہسپانیہ اور پرتگال کی بحری قوت کمزور ہو گئی اور ہسپانیہ کے زبردست بیڑے (آرمڈا) کی تباہی کے بعد انگریز سوداگروں نے ملکہ الزبتھ سے درخواست کی کہ ہمیں بھی ممالک ایشیا سے بحری تجارت کرنے کی اجازت دی جائے (۱۵۹۱ء مطابق ۱۹۹۱ء) یہ درخواست منظور ہوئی اور ان سوداگروں نے تین تجارتی جہاز ہندوستان روانہ کئے جن میں سے ایک راستے میں ڈوب گیا دو جنوبی ہند تک آئے اور یہی انگریزوں کے پہلے جہاز تھے جو آفریقہ کے گرد پرتگیزیوں کے دریافت کردہ راستے سے ایشیا پہنچے۔

آئندہ چند سال کی کوشش میں انگریزوں کو ہندوستان کی بحری تجارت میں چنداں نفع نہیں ہوا بایں ہمہ ان کے شوق میں اضافہ ہوتا رہا اور آخر میں لندن کے کئی دو لٹمنڈ سوداگروں نے تقریباً لاکھ روپے کے سرمائے سے ایک کمپنی مرتب کی اور سوٹھویں صدی عیسوی کے آخری دن ملکہ الزبتھ نے بھی شاہی فرمان کی رو سے ان کو ایشیا سے تجارت کی اجازت دے دی (۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء مطابق ۱۶۰۰ء) لیکن اول اول یہ کمپنی زیادہ تر جزائر شرق الہند سے جو پار کرتی رہی اور جب اس کے جہاز یوں نے پرتگال والوں کی دیکھا دیکھی دیسی سوداگروں کے جہاز لوٹنے شروع کئے تو ان جہازوں میں اس کی ساکھ بگڑ گئی اور تجارت میں نقصان ہوا۔

اس عرصے میں پرتگیزیوں سے انگریزی کمپنی کی لڑائی شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے ان تجارتی رقبوں کے خلاف ایرانیوں کو ملا لیا اور پرتگیزیوں کی مقبوضہ بندرگاہ

پرتگیزیوں اور ان کی قابض

ب

ہرمز (آرمز) سے انھیں خارج کر دیا (۱۶۱۲ء مطابق ۱۰۳۱ھ) لیکن سواحل ہند پر اہل پرتگال نے بہت دن تک انگریزوں کے قدم نہ جھنے دیے اور حقیقت یہ حکومت پرتگال کی اندرونی کمزوری کا نتیجہ تھا کہ وہ کروم ول کے زمانے میں انگریزوں کی تجارت کا حق تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئی (۱۶۵۴ء مطابق ۱۰۶۵ھ) دراصل انگریزوں نے جب ایشیائی سمندروں میں اپنے جہاز ڈالے اس وقت پرتگال کی بحری قوت میں زوال آ رہا تھا اور ہالینڈ والوں نے انھیں شکستیں دے کر اکثر ایشیائی مقامات سے نکال دیا تھا۔ لہذا انگریزوں کو پرتگیزیوں سے لڑ بھڑ کر اپنے واسطے جگہ نکال لینے میں اتنی دشواری نہ ہوئی جتنی کہ ولندیزیوں اور بعد میں فرانسیسیوں کی مناصمت کی بدولت پیش آئی۔ ہالینڈ کی بحری قوت کا ان دنوں عروج تھا اور (۱۶۷۴ء مطابق ۱۰۸۵ھ) میں ہسپانیہ سے صلح ہونے کے بعد اسے اپنے دوسرے تجارتی رقبوں سے لڑنے کی فرصت بھی مل گئی تھی، انگریزوں کے ساتھ ولندیزیوں کے دوستانہ تعلقات تھے کیونکہ یہ دونوں قومیں اسی زمانے میں رومن کیتھولک مذہب چھوڑ کر پاپائے روم کی حکومت سے آزاد ہو گئی تھیں، لیکن تجارتی اغراض نے بہت جلد ان کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا اور سرکاری طور پر اعلان جنگ نہ ہونے کی حالت میں بھی ان کے تاجروں کے جہاز ایک دوسرے پر حملہ کرنے لگے۔ ولندیزیوں کی ابتدا میں کوشش یہ رہی کہ انگریز جزائر شرق الہند میں قدم جمانے نہ پائیں۔ چنانچہ ان کی جو تجارتی کونٹھیاں ان جزیروں میں قائم تھیں ان پر بار بار ولندیزی تاجروں نے حملے کئے اور جا بجا انگریزوں کو نقصان پہنچایا۔ (۱۶۱۹ء مطابق ۱۰۲۹ھ) میں دونوں قوموں کے تاجروں کی یورپ میں مصالحت بھی ہو گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے شریک رہ کر تجارت کریں لیکن اس عہد و پیمان کا ایشیا میں کوئی فائدہ ظاہر نہ ہوا اور تھوڑے ہی دن بعد مذکورہ جزائر کے دو مشہور انگریزی کارخانوں پر ولندیز جبراً قابض ہو گئے۔

اور اس وقت
کا قتل۔

ولندیزیوں کی اس دشمنی کا سب سے مشہور واقعہ ”امبوی“ نامہ قتل تھا

یہ مقام جزائر ملایا میں واقع ہے اور یہاں ولندیزیوں نے چند انگریز جہازوں کو گرفتار کر کے ان پر سازش و بغاوت کا الزام لگایا اور معمولی تحقیقات کے بعد سزائے قتل کا فیصلہ صادر کیا۔ تو انگریزوں کے ساتھ چند جاپانی اور ایک پرتگیزی ملاح بھی شریک جرم قرار دیے گئے تھے۔ مشہور ہے کہ ولندیزیوں نے ان سب کو خوفناک اذیتیں دیں اور آخر میں قتل کر دیا (۱۶۲۳ء مطابق ۱۶۱۲ء)۔ انگلستان میں اس واقعے کی اطلاع نے سخت غم و غصہ پیدا کر دیا تھا لیکن ساہا سال تک صرف خط و کتابت ہوتی رہی آخر گردوم ول کے زلزلے میں ہالینڈ کی حکومت نے ان مقتولوں کا خون بہا دلوانا قبول کیا۔ غرض بیس بائیس برس کی جدوجہد کے باوجود جزائر شرق الہند ملایا میں تو انگریزی تجارت کوئی فروغ نہ پاسکی البتہ اس اشنا میں کپتان ہاکنس اور سرتاس رو کی سعی و سفارت سے انگریزوں کو سلطنت مغلیہ کے علاقوں میں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی یا کم سے کم انھیں یہاں کے حکام سے روشناسی حاصل ہوئی اور سورت میں ان کی تجارتی کوٹھی بھی قائم ہو گئی۔ ہاکنس چیمس اول شاہ انگلستان کا خط اور بہت سے محالف لے کر پہلے جہاز لایا کے آغاز میں آکرے پہنچا تھا (۱۶۰۱ء) اور دو تین سال تک حاضر دربار رہا اس کا بیان ہے کہ بادشاہ اس کے ساتھ بہت عنایت سے پیش آیا اور ترکی زبان میں بغیر ترجمان کے گفتگو کی۔ نیز خلوت کے جلسوں میں بھی اسے باریابی کا شرف بخشا اور چار صدی منصب عطا فرمایا۔ اسی طرح تاس رو جو تین سال بعد آیا بیان کرتا ہے کہ دربار مغلیہ میں اس کا بہت اعزاز و اکرام ہوا اور جہاں پناہ اسے اپنی بے تکلفی اور خلوت کے جلسوں میں شریک کرتے تھے لیکن درایتاً ان انگریز سفیروں کے اقوال کی صحت میں شبہ ہے اس بات کا تو وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ جن تجارتی اغراض کے لیے وہ دربار میں آئے تھے ان میں چنداں کامیابی نہیں ہوئی ہاکنس کو اگر واقعی منصب

دربار مغلیہ
میں ملا تھا

۱۰

چار سدی عنایت ہوا تھا تو وہ دربار کے سب سے کتر امیدوں کا منصب ہے اور سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ اس عہد کی سرکاری تاریخوں میں ان سفیروں کا کہیں نام تک نہیں آتا اور جیسا کہ ہم ایک حاشیے میں بیان کر چکے ہیں۔ فارسی تواریخ میں صرف بالواسطہ شہادتوں سے تادمس رو اور اس کے انگریزی تحالف کے دربار میں پیش ہونے کا پتا چلتا ہے۔ حالانکہ دیگر ممالک کے سفیروں کی آمد کے تفصیلی حالات محفوظ ہیں اور یوں بھی سلاطین مغلیہ کے ذاتی مشاغل کی ایسی جزئیات فارسی تاریخوں میں قلمبند کی گئی تھیں کہ اگر ہالکس یا تادمس رو پر ان کی خاص توجہ ہوتی تو یہ خلاف قیاس ہے کہ ان کے ذکر سے یہ تاریخیں خالی ہوتیں۔

ابتدائی
کارخانے۔

بہر حال ۱۶۱۲ء مطابق ۱۰۲۱ھ میں پہلی انگریزی کوٹھی سورت میں کھولی گئی اور بعد میں اس کی شاخیں برہانپور، احمد آباد، اجمیر و آگرہ میں قائم ہوئیں جو مغربی ہند میں اس زمانے کے بڑے بڑے تجارتی مرکز تھے۔ خود سورت غالباً اس عہد میں مالک ایشیا کی سب سے زیادہ آباد و بارونتی بندرگاہ تھی اور جب یہاں یرنگیزوں کے علی الرغم انگریزی تجارت کی بنیاد پڑ گئی تو دوسرے مقامات پر بھی یرنگیز اپنے نووارد دریغوں کو فروغ پانے سے نہ روک سکے اور کئی ناکامیوں کے بعد ۱۶۱۶ء مطابق ۱۰۲۵ھ میں کورومندل کے سال پر مچھلی پٹم اور پیٹھلی میں انگریزی دکانیں کھل گئیں۔ لیکن اس طرف ان کی تجارت کے فروغ بلکہ کہنا چاہئے کہ حکومت کے آغاز کی تاریخ وہ ہے جبکہ چینا پٹم کے راجہ نے موجودہ مدراس کی زمین معاوضے پر بطریق معافی ایک انگریز ایجنٹ کو دے دی (۱۶۳۹ء مطابق ۱۰۴۸ھ) اور تھوڑے دن بعد یہاں ان کا قلعہ سینٹ جارج تعمیر ہوا۔ (۱۶۴۱ء مطابق ۱۰۵۰ھ)۔

واضح رہے کہ جنوبی ہند کے ان علاقوں میں اس وقت تک مغلوں کی عملداری نہ ہوئی تھی اور وجہ انگریزوں کے زوال نے یہاں کے مقامی رئیسوں کو خود مختار و آزاد بنادیا تھا یہی وجہ تھی کہ چینا پٹم کا چھوٹا سا راجہ انگریزوں کو مدراس میں جنگی اسلحہ بنانے سے نہ روک سکا در نہ مغلوں کے ملک میں جو ان کی

بابت

تجارتی کوٹھیاں قائم ہوئیں وہاں وہ اس قسم کے قلعے بنانے کی جرأت نہ کر سکے اور ان کی حیثیت خالص تاجرانہ رہی۔ اسی گیارہویں صدی ہجری کے وسط میں بنگالے میں ان کے کئی کارخانے جاری ہوئے اور انگریزی تاریخوں کا بیان ہے کہ یہاں ان کی تجارتی ترقی بہت کچھ ڈاکٹر باوٹن کے رسوخ و کوشش کا نتیجہ تھی جو بنگالے کے مغل صوبہ دار کی سرکار میں ملازم (سراج) تھا۔

لندن کے ان تاجروں کو اپنی وطنی حکومت کی طرف سے ایشیائی تجارت کا اجارہ مل گیا تھا لیکن شاہ چارلس اول کے زمانے میں بعض اور سوداگروں نے بھی تجارت کی اجازت حاصل کر لی اور اب دونوں کمپنیوں میں رقابت بلکہ کبھی کبھی جنگ و جدال ہونے لگی، ادھر انگلستان میں سخت خانہ جنگی برپا ہو گئی اور بہت دن تک حکومت درہم برہم رہی، آخر شاہ چارلس دوم کے زمانے میں ان سوداگروں میں باہم اتحاد ہو گیا اور از سر نو ایک فرمان شاہی حاصل ہوا جس کی رو سے نہ صرف تجارت بلکہ اپنے ایشیائی مقبوضات میں انھیں ضربہ سکہ اور حکومت کرنے کے حقوق بھی مل گئے۔

انگریز سوداگروں کا اپنی تاجرانہ

(۱۶۶۲ء مطابق ۱۰۷۲ھ)

اسی سال چارلس نے جزیرہ بمبئی کمپنی کو کرایہ پر دے دیا، اصل میں یہ جزیرہ پرتگیزیوں کے قبضے میں تھا اور جب پرتگال کی شہزادی کی شاہ انگلستان سے شادی ہوئی تو یہ بھی اس کے جہیز میں شاہ انگلستان کو ملا تھا۔ اس جزیرے کی ان دنوں جو حیثیت و وقعت تھی اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ لکھنا کافی ہے کہ اس کا سالانہ کرایہ صرف دس پونڈ قرار دیا گیا تھا۔ لیکن اول تو اسی زمانے میں سورت پر مرہٹوں نے تاخت کی دوسرے آہستہ آہستہ جزیرہ بمبئی کی آبادی بڑھی اور انگریزوں کی چند عمارتیں تیار ہو گئیں۔ لہذا ۱۶۸۷ء تا ۱۶۹۹ء میں کمپنی نے اپنے صدر کارخانے کو سورت سے بمبئی میں منتقل کر لیا اور اس وقت سے انگریزی تجارت کے ساتھ ساتھ اس جزیرے کی رونق و آبادی

کمپنی کا تہذیبی فروغ

باب

میں برابر ترقی ہوتی رہی۔

یہی بارھویں صدی بھری کے آخری شین کا زمانہ ہے جس میں انگریز سودا گروں کے دل میں شوق ملک گیری پیدا ہوا اور انھوں نے سرٹائیس رو کے سابقہ اصول عمل کو چھوڑ کر قرار دیا کہ آئندہ سے جہاں تک ممکن ہو کمپنی کے ملازمین اپنے تجارتی کارخانوں کو جنگی اغراض کے لیے مستحکم کریں اور فوجی مصارف اور منافع کے واسطے گرد و نواح کے علاقوں پر بھی تصرف حاصل کریں کمپنی کی طرف سے اس نئے منصوبے پر عمل کرنے کے واسطے جو ہدایات تحریر کی گئی تھیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک گیری کا یہ جذبہ ولندیزیوں کی تقلید اور مزید منافع حاصل کرنے کے لالچ سے پیدا ہوا تھا۔ مگر جب اس پر عمل شروع ہوا تو کمپنی اور ہندوستان میں اس کے ملازمین کو سخت ناکامی و مصیبت اٹھانی پڑی کیونکہ یہ ملک جزائر شرق الہند کی طرح جس میں ولندیزیوں کا قبضہ ہوتا جاتا تھا، پنجم تمدن مقامی رئیسوں میں بٹے ہوئے نہ تھے بلکہ مغلوں کی پر شوکت و غنیمت مرکزی حکومت کے ماتحت تھے۔

الغرض انگریزوں کی سرکشی کی خبر ہوتے ہی تمام صوبہ داروں کے نام شاہی احکام پہنچ گئے کہ ہر جگہ ان کی دکانیں بند اور مال ضبط کر لیا جائے۔ اسی ضمن میں کمپنی کے بعض انگریز ملازمین قید کر لیے گئے اور بعض نے روپوش ہو کر جان بچائی۔ کمپنی اپنے زعم میں سلطنت مغلیہ سے برسہا پکار تھی۔ لیکن یہاں اس کی طفلانہ ”جنگ“ کے حالات بیان کرنا تاریخ ہند کے ایک خفیف معاملے کو غیر معمولی اہمیت دینا ہو گا مختصر طور پر اتنا لکھنا کافی معلوم ہوتا ہے کہ

لے کارکنان کمپنی کی نئی تجاویز کے الفاظ یہ تھے کہ آئندہ سے ہمیں نہ صرف تجارتی نفع، بلکہ مالگناری کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اگر تجارت میں خسارہ ہو تو بھی اپنی ”سپاہ“ کے مصارف ادا کر سکیں.... یہی وہ مصلحت ہے جس کی بنا پر دانشمند ولندیزی اپنی عام ہدایات میں جنھیں ہم نے دیکھا ہے، اگر ایک فقرہ اپنی تجارت کے متعلق لکھتے ہیں تو دس فقرے سیاسی اور جنگی معاملات اور اپنی مالگناری بڑھانے کے متعلق تحریر کرتے ہیں..... ”گزے تیر جلد دوم صفحہ (۲۶۰)۔“

۱۰

گو کمپنی نے دو تین مرتبہ جنگی بیڑے روانہ کئے جن میں انگلستان کی شاہی فوج بھی تھی لیکن ان ”حملہ آوروں“ کی مجموعی تعداد غالباً دو ہزار سے کبھی زیادہ نہ تھی اور انھوں نے سواصل جنگال پر جو حملے کئے ان سب میں نقصان و ناکامی ہوئی۔ پھر انھوں نے بحر عرب میں حاجیوں کے جہاز لوٹنے شروع کئے لیکن شاہی جہازوں نے اس دست برد کا بھی خاطر خواہ انسداد کر دیا اور دو تین سال کی اس ”لڑائی“ میں اہل ہند کا تو کوئی قابل ذکر ملکی یا مالی نقصان ہوا نہیں البتہ کمپنی کا دودا لاکھنے کی نوبت پہنچی۔ آخر اس کے وکیلوں نے عجز و ذمہ داری کے ساتھ بادشاہ سے معافی مانگی تب اسے از سر نو مکرر دشوار تر شرائط پر تجارت کی اجازت حاصل ہوئی ۱۶۹۲ء مطابق ۱۱۰۲ھ۔ نیز اسی سال انھیں کلکتے کے مقام پر زمین لے کر تجارتی کارخانہ قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔ بایں ہمہ کمپنی کی اسی ایک جنگ نے اس کو ایسا نقصان پہنچایا، اور سبق دیا تھا کہ پھر نصف صدی تک انگریزوں کو ”ملک گیری“ کا حوصلہ نہ ہوا اور بعد میں بھی یہ صرف فرانیسیوں سے تجارتی رقابت و آویزش کا نتیجہ تھا کہ وہ دوبارہ ہندوستان کے سیاسی معاملات میں دخل دینے پر آمادہ ہوئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے مذکورہ بالا نقصانات اور ناکامیوں نے وطن میں بھی اس کی ساکھ بگاڑ دی اور وہاں کا ”آزاد خیال“ (وہگ) فرقہ اس کے تجارتی اجارے کے خلاف ہو گیا۔ اس اجارے کے باوجود بعض سوداگر جو رہی جھپے بخ کی تجارت تو پہلے ہی کرتے تھے لیکن اب جو کمپنی والوں نے بعض عہدہ داروں کو دریادلی سے رشوتیں دے کر پارلیمنٹ کے بے اطلاع ایک تازہ فرمان شاہی حاصل کر لیا تو پارلیمنٹ میں عام ناراضی پیدا ہو گئی۔ اور دارالعوام نے ایک تجویز منظور کی جس کی رو سے انگلستان کے ہر شخص کو ایشیا سے تجارت کا حق مل گیا اور کمپنی کے مخصوص حقوق سوخت کر لیے گئے۔ (۱۶۹۷ء مطابق ۱۱۰۶ھ)

برانی کمپنی کے تئیں پر ایک نئی ”انگلش کمپنی“ قائم ہوئی جس میں بہت سے دولت مند اور ذی اثر لوگ حصہ دار تھے۔ ۱۷۰۱ء کمپنی کے مقرر کردہ ملازمین کی پرانی کمپنی کے نوکردوں سے ہندوستان میں بہت دن تک جنگ زرگری ہوئی رہی

نئی کمپنی
اور اس کا
اتحاد

نئی کمپنی

باب

مگر نئی کمپنی کو انگلستان میں جو رسوخ و اثر حاصل ہو گیا تھا یہ ہندوستان میں حاصل نہ ہو سکا اور آخر عرصہ دراز کے بے لطف تنازعات اور طویل بحث مباحثے کے بعد حکومت انگلستان نے دونوں کمپنیوں کو متحد کر دیا (سنہ ۱۱۱۹ھ مطابق ۱۷۰۹ء) اور یہی ”ایشیا سے تجارت کرنے والے سوداگروں کی متحدہ جماعت“ بنی جس سے بعد میں اہل ہند کو نہ صرف تجارتی بلکہ سیاسی واسطہ پڑا۔

مذکورہ بالا اندرونی نزاع دفع ہونے کے بعد ان انگریز تاجروں کو پہلے سے زیادہ سرمائے اور اطمینان کے ساتھ اپنی تجارت ہند کو ترقی دینے کا موقع ملا لیکن اورنگ زیب کے عہد میں مغلوں سے لڑائی چھیڑ کر وہ ایسا نقصان اٹھا چکے تھے کہ اب ان کے تمام سیاسی منصوبے اور ملکی فتوحات کی آرزوئیں دلوں سے محو ہو گئی تھیں اور آئندہ چالیس برس تک انھوں نے ہندوستان کے معاملات میں حصہ لینے کی جسارت نہ کی۔ گزے ٹیر کے مختصر تبصرے میں کمپنی کی اس جہل سالہ تاریخ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ”اب کمپنی نے اسی قدیم طرز عمل کو اختیار کر لیا تھا کہ چپ چاپ اپنے بیویاں سے کام رکھے لہذا اس کی تاریخ میں یہ زمانہ قابل ذکر واقعات سے خالی ہے۔“ سنہ ۱۱۳۸ھ (۱۷۲۵ء) تک ایک انگریز ایجنسی سورمان دربار شاہی میں رہا اور اس نے سلطنت مغلیہ کی طرف سے کمپنی کے لیے بعض تجارتی اور نیز نوآبادیاں بیلانے کی مراعات حاصل کیں اور کمپنی کے ملازمین کو اپنی آنکھوں سے سلطنت کی اندرونی خرابی دیکھنے کا بھی موقع ملا لیکن اس عرصے میں خود کمپنی نے اپنے کام سے کام رکھا۔۔۔۔ بدامنی سے جو خرابیاں ملک میں رونما ہو رہی تھیں ان کے سب سے برے اثرات بمبئی میں ظاہر ہوئے جہاں ایک طرف انگریز نامی بحری قواں ساحلوں پر کمپنی کی تجارت میں خلل ڈال رہا تھا اور دوسری طرف مرہٹوں کی آمد آمد نے کمپنی کی سلامتی کو محذور کر دیا تھا؛ لیکن بنگالے کا نیم ازاد نواب

اپنے انگریز ہمسایوں کے ساتھ مصالحہ برتناؤ کرتا رہا اور مدراس میں انگریزوں کو اطمینان تھا کہ جب تک نواب نظام الملک اور مرہٹوں میں فیصلہ نہ ہو جائے اس وقت تک وہ محفوظ ہیں بایں ہمہ سلسلہ (مطابق سلسلہ) کے قریب ہم دیکھتے ہیں کہ کمپنی کے تینوں مرکزی کارخانوں تک مرہٹوں کا دست تصرف دراز ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ یعنی اس سال ادھر تو مرہٹوں کا کرناٹک پر حملہ ہوتا ہے اور ادھر دو سال بعد انگریزوں کو کلکتے کی حفاظت کے لیے عجلت خندق کھودنی پڑتی ہے“ (جلد دوم صفحہ ۴۶۳)۔

تیسری فصل :- انگریزوں کا غلبہ فرانسیسیوں پر

پرتگیزیوں کے زوال قوت کا حال اوپر ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ اندرونی قومی خرابیوں کے علاوہ ولندیزیوں کی دشمنی سے ان کو سخت نقصان پہنچا۔ لیکن خود ولندیزی ہندوستان میں پرتگیزیوں کی جگہ نہ لے سکے جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ان کی چھوٹی سی ریاست کی حریف و ہمسایہ پروشیا، فرانس اور انگلستان جیسی قوی ریاستیں تھیں دوسرے یہ کہ ایشیا میں ان کی آمد و عروج کے وقت مغلوں کی زبردست سلطنت قائم تھی ہندوستان میں ملک گیری کا موقع نہ تھا اور چونکہ ولندیز اب کسی ملک پر مستقل قبضہ کئے بغیر وہاں تجارت کرنی پسند نہ کرتے تھے لہذا انھیں ہندوستان کے بجائے اپنے مستقر جزائر شرق الہند و ملایا میں بنائے پڑے، جہاں ان کی کشور کشائی کو روکنے والی کوئی بڑی مقامی ریاست نہ تھی۔ خام اجناس خاص کر مصالحوں کی ان جزائر میں افراط تھی جس کی بدولت ولندیزیوں کو وہاں کی تجارت و زراعت میں نفع بھی خوب ہوا اور انھوں نے یہاں ایسی مضبوطی سے قدم جمائے

باب

کہ اس مجمع الجزائر کے کئی بڑے بڑے جزیرے اب تک یورپ کی اسی جھوٹی سی قوم کے قبضے میں ہیں۔

اول اول انگریزی سودا گروں نے بھی بحر ہند کے ان جزائر میں اپنا بیوپار پھیلانے کی سعی کی تھی لیکن ولندیزیوں کی رقابت اور قوت نے ان کا یہاں زیادہ دخل نہ ہونے دیا اور ناچار انھوں نے سواحل ہند ہی پر اپنے مرکزی کارخانے بنائے۔ بے شبہ ان انگریز تاجروں کو بھی ولندیزیوں کی طرح ملک گیری کا سودا تھا اور جیسا کہ ہم ابھی بیان کر رہے تھے، انھوں نے سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہندوستان کے بعض مقامات پر آزادانہ قبضہ کرنے کی ٹھان لی تھی لیکن جب اس کوشش میں نقصان ہوا تو انگریزی کمپنی نے اپنا طرز عمل بدل دیا اور دوبارہ صرف تجارت کو اپنا مقصد قرار دیا یہ کمپنی اب اپنے سیاسی منصوبوں کو بالکل ترک کر چکی تھی مگر تقدیر نے انگریزوں کو ہندوستان کی بادشاہی کے لیے منتخب کیا تھا لہذا ان کی تجارت کے فروغ کے ساتھ ہندوستان سے ان کا تعلق بھی قوی ہوتا گیا پھر اسی تجارت کی حفاظت کی خاطر نیز دیگر اسباب نے جب ان کو اپنے فرانسیسی حریفوں سے آمادہ پیکار کیا تو گویا وہ بلا قصد دوبارہ سیاسیات ہند کے میدان میں داخل ہوئے۔

جہاں تک جہاز رانی کا تعلق ہے۔ فرانسیسی ملاح بہت پہلے سولہویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں ایشیائی سمندروں تک پہنچ گئے تھے اور یکے بعد دیگرے فرانس میں کئی کمپنیاں بھی بنیں جن کا مقصد ممالک ایشیا سے تجارت کرنا تھا، لیکن اہل فرانس ان دنوں سپہگری کے دلدادہ تھے۔ تجارت سے انھیں چنداں مناسبت نہ تھی۔ ان کمپنیوں کو ملک میں کوئی قبولیت نہ حاصل ہوئی اور یہ تھوڑے تھوڑے دن بعد بند ہو گئیں۔ لیکن گیارھویں صدی ہجری (سترھویں عیسوی) کے وسط میں خود حکومت فرانس مشرقی ممالک سے تعلقات بڑھانے میں کوشاں ہوئی اور شاہ لوئی چہارم کے عہد اور اس کے وزیر کولن بئر کی سرپرستی میں سودا گروں کی ایک جماعت مرتب ہوئی جس کا مقصد ممالک ہند سے تجارت کرنا تھا۔ (۱۶۶۴ء مطابق ۱۰۷۴ھ) اس کمپنی کا پہلا تجارتی

فرانسیس کی
آئینہ ہند

کارخانہ چار سال بعد سورت میں قائم ہوا اور اگلے سال مچھلی پٹنم میں ایک شاخ کھل گئی۔ لیکن اسی زمانے میں فرانس کی ہالینڈ سے جنگ شروع ہوئی اور اس کی جنگاریوں سے ان قوموں کے ہندوستانی کارخانے بھی محفوظ نہ رہے۔ کم سے کم تجارت کو سخت نقصان پہنچا اور میلاپور (مدراں) کے ولندیزی کارخانے برجن فرانسیسیوں نے قبضہ کر لیا تھا انھیں ولندیزیوں نے شاہ کو لکڑہ کی مدد سے حیرا خارج کر دیا۔ (مطابق ۱۷۵۳ء)۔

یہاں سے نکل کر یہ فرانسیسی کوئی سو میل جنوب میں ساحل کورومندل کے اس مقام پر اترے جو تھوڑے دن پہلے انھوں نے سلطنت بیجاپور کے صوبہ دار شیر خاں لودی سے خریدا تھا یہ قطعہ زمین بیجاپور کے صوبہ جی میں آئی نام کی ندی کے کنارے تھا اور یہیں مارتین فرانسیسی نے شیر خاں کی اجازت و امداد سے وہ بستی بسائی جو ”پھل چیری“ کہلاتی تھی اور بعد میں ”پانڈی چیسری“ (پان دی شیر) کے نام سے مشہور ہوئی۔ شیر خاں صوبہ دار کی راست بازی اور شرافت کے فرانسیسی مورخ بہت مداح ہیں اور اسی نے بعد میں ان کے آباد کاروں کو قریب کی زمینیں بھی بطور جاگیر عطا کر دی تھیں۔ اس طرح ولندیزیوں کی دشمنی کے باوجود یہ چھوٹی سی فرانسیسی بستی آہستہ آہستہ ترقی کرنے لگی اور ۱۷۶۳ء میں جب اس کا لائٹ بانی فوت ہوا تو وہ ایک بڑا تجارتی اور جنگی شہر بن گئی تھی۔

جب جنوبی ہند میں دو متمند فرانسیسی تاجروں کا ایسا باموقع صدر مقام بن گیا تو لازمی طور پر ان اقطاع کے مقامی رئیسوں سے بھی ان کی شناسائی ہو گئی لیکن مہر شاہ کے عہد یعنی سترھویں صدی کے اوائل تک ان کا اہل ہند سے تعلق خالص تجارتی تھا اور دوسرے فرنگی سودا گروں کی طرح وہ بھی لین دین اور بیوپار کے سودا گیر ملکی معاملات سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ مگر ۱۷۶۳ء (مطابق ۱۱۸۳ھ) میں

۱۷۶۳ء فرانسیسیوں نے ان حالات کا خاص مائدے یسین کی کتاب ”ہسٹری آف دی نسرینج ان انڈیا“

ہے۔ دیکھو صفحات ۲۶۱ تا ۲۶۰۔

باب

جب دیوما (Dumas) ان کا صدر عامل یا گورنر مقرر ہوا تو ان کا یہ طرز عمل بدل گیا اور سچ یہ ہے کہ خود ہندی رئیسوں کے باہمی نفاق اور خود غرضی نے فرانسیسیوں کو ان کے معاملات میں مداخلت کرنے کا موقع دیا اور نہ محتاط دیوما خود ان جھگڑوں اور جو کھوں میں پڑنا نہ چاہتا تھا کہ مبادا فرانسیسی سوداگروں کی شہرت کو بڑھ گئے اور اہل ہند کی بدگمانی ان کو نقصان پہنچائے۔

فرانسیسی
مصلحت
کے
مقابلے
میں

بہر حال پہلی مرتبہ انھوں نے ۱۷۹۲ء کے مطابق اس وقت میں تنجو کی مشین کے جھگڑے میں حصہ لیا اور اپنی مدد کے بدلے میں قصبہ کاری کا ل حاصل کیا جو کولرون ندی کے دہانے پر واقع ہے اور ان دنوں نہایت با موقع تجارتی بندرگاہ سمجھا جاتا تھا۔ تنجو ایک چھوٹی سی ہندو ریاست تھی اور فرانسیسیوں کو اس کے اندرونی تنازعہ میں شریک ہونے سے کچھ تکلیف برداشت کرنی نہ پڑی۔ اور اس کا موقع سے بڑھ کر قیمتی معاوضہ حاصل ہو گیا لیکن اسی ابتدائے ان کو آخر کرناٹک اور دکن کی سیاسی پیچیدگیوں میں پھنسا یا اور آئندہ ان کی جلد بازی اور بیجا ہوس ملک گیری خود ان کے حق میں ناسازگار ثابت ہوئی۔

در اصل جب تک دور اندیش دیوما فرانسیسیوں کا حاکم رہا۔ اس وقت تک ان کی شہرت و قوت برابر بڑھتی رہی اور اس نے مرہٹوں کی یوٹش کرناٹک کے زمانے میں یہاں کے مقامی رئیسوں کی اعانت کی تو بھی فرانسیسیوں کی حیثیت محض احسان مند ہمدردوں کی سی تھی اور دوست علمی نہیں کرناٹک کے اہل و عیال کو تعصبت کے وقت پان ڈی چیری میں پناہ دینا بھی محض ان احسانات کا معاوضہ سمجھا جاسکتا ہے جو اس خاندان نے غریب الوطن

لے بعض انگریزی تاریخوں میں لکھا ہے کہ خود دیوما نے ہندوستان کے سیاسی معاملات میں دخل دینے کا منصوبہ بنایا تھا اور گزے ٹیر میں بھی یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے لیکن یہ قول واقعات کے خلاف غلطی پیدا کرنے والا ہے اور باری مذکورہ بالا رائے تفصیلی واقعات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ملین کی رائے کے موافق ہے۔ (دیکھو مہٹری اوف دی فرنگ۔ باب سوم)۔

باب

فرانسیسی سوداگروں کے ساتھ کئے تھے۔ لیکن مرہٹہ حملہ آوروں کے مقابلے میں اس پناہ دہی نے ادھر تو رہیں کرنا ملک کے خاندان کو فرانسیسیوں کا مہمون احسان بنالیا اور ادھر ان کی جنگی قوت اور جرأت کا دکن میں ایسا شہرہ ہو گیا کہ خود نواب نظام الملک آصفیاء اول نے دیو ما کو خلعت بھیجا اور کچھ روز بعد دربار دہلی سے بھی اسے منصب اور نوابی کا خطاب ملا۔ یہ سب نام ۱۷۶۵ء کے واقعات ہیں اور چونکہ دیو ما اسی زمانے میں اپنی ملازمت سے دست کش ہو گیا تھا۔ لہذا اس کی حاصل کردہ عزت و قوت سے فائدہ اٹھائے کا موقع اس کے مشہور جانشین دوپلے کو ملا جو پہلے چند رنگر کے فرانسیسی کارخانے کا منتظم تھا اور اب پان ڈی چیبری کا صدر عامل یا گورنر مقرر ہوا۔ (۱۷۶۵ء) دوپلے کی اکثر انگریز مورخوں نے سخت مذمت کی ہے کہ وہ ذاتی طور پر سکارو بد اخلاق آدمی تھا۔ لیکن حال میں جب سے اہل فرائض کے ساتھ انگریزوں کی قدیم رقابت اور دشمنی میں فرق آیا ہے اس مذمت میں بھی کمی آگئی ہے اور اب دوپلے کی سازش و جمل سازی کی تاویل شروع ہو گئی ہے خود اہل فرائض اب دوپلے کو اپنے محسن قوم کی فہرست میں داخل کرتے ہیں حالانکہ زندگی میں انھوں نے بڑی ذلت و خواری کے ساتھ اسے معزل کیا تھا اس تغیر رائے کی ایک خاص وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آجکل یورپ میں قومی فوائد کے لیے مکر و فریب کو بھی جائز سمجھا جانے لگا ہے پس دوپلے نے اگر ہندوستان میں کوئی سازش یا جعل سازی کی تو صرف اتنا ثابت کر دینا ان جرائم کو محاسن کی شکل میں بدل دینا کہ یہ کام اس نے فرائض کو فائدہ پہنچانے کی "نیت" سے کئے تھے! لیکن ذاتی اخلاق سے قطع نظر ہمیں یہاں خاص طور پر جو بات یاد رکھنی چاہئے وہ یہ ہے کہ دوپلے کی ناکامی کا اصلی سبب یہ ہوا کہ وہ اپنی بساط سے بڑھ کے کام کرنا چاہتا تھا اور جلد بازی سے جو اہل فرائض کی قوی خصائص میں داخل ہے۔ تمام ممالک دکن کو چند ہی سال میں دبا لینے کا

دوپلے

باب ۷

آرزو مند تھا حالانکہ اہل ہند کو اندرونی خرابیوں نے خواہ کتنا ہی کمزور کر دیا ہو۔ مگر اس وقت یورپ والوں میں اتنی قوت نہ تھی کہ اتنی وسیع مملکت کو آسانی سے ہضم کر جائیں۔

بہر حال، دوپلے کو ہندوستانی معاملات میں کوئی خاص دخل دینے کا ابھی موقع نہ ملا تھا کہ ^(۱۷۵۷ء) میں فرانس و انگلستان کی جنگ چھڑ گئی اور ہندوستان میں بھی خود انگریزوں نے پیش دستی کی یعنی پان ڈی چیری پر حملہ کیا۔ ان کی اس جرأت کا اہلی سبب یہ تھا کہ اس وقت اہل فرانس کا کوئی جنگی بیڑا ایشیائی سمندروں میں موجود نہ تھا اور اہل انگلستان لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی ایک بیڑا خاص اس واسطے ادھر روانہ کر چکے تھے کہ فرانس کی ایشیائی تجارت اور نوآبادیوں کو غارت کر ڈالے۔

اہل فرانس کی غفلت سے انگریزوں کو پان ڈی چیری کی فتح کا موقع تو بہت اچھا مل گیا تھا۔ لیکن اب کرناٹک، بیجاپور و گوالکنڈے کے نائزل بادشاہوں کے تحت میں نہ تھا۔ اور نہ وہاں دوست علی کھانے کی سی بددلی تھی بلکہ اسی زمانے میں نواب نظام الملک آصفیہ اول نے از سر نو اس علاقے کا انتظام درست کیا اور وہاں اپنے ایک سردار انور الدین خاں کو ناظم بنا دیا تھا جیسا کہ پچھلے باب میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ انور الدین خاں نہایت مستعد اور لائق حاکم تھا اور جب اس موقع پر دوپلے نے اس کے حضور میں انگریزوں کی زیادتی کی سریاد کی تو اس نے مدراس حکم بھیج کر جبراً انگریزوں کو پان ڈی چیری پر حملہ کرنے سے روک دیا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد مدغاسکر سے ایک فرانسیسی بیسٹرا ہندوستان آپہنچا اور اب خود دوپلے نے مدراس پر فوج کشی کی اور انور الدین خاں نے اس فوج کشی کی اجازت اس شرط پر دی کہ فرانسیسی اس شہر کو تسخیر کرنے کے بعد نواب موصوف کے حوالے کر دیں گے۔

۱۷۶۷ء (آخر ۱۱۵۹ھ) میں فرانسیسیوں نے مدراس فتح کر لیا لیکن اس پر قابض ہونے کے بعد ان کے سرداروں میں باہم نزاع ہو گئی اور اسی جھگڑے کی وجہ سے شہر کا نواب انور الدین خاں کے حوالے کرنا ملتی رہا۔ اور نواب نے جو فوج اس امید پر مدراس روانہ کی تھی کہ حسب اقرار فرامشی اس شہر کو خالی کر دیں گے، اس فوج پر فرانسیسیوں نے غالباً دھوکے سے حملہ کیا اور شکست دی، ساتھ ہی دوپلے نے مدراس کو مستقل طور پر فرانسیسی مقبوضہ بنانے کا اعلان کر دیا۔

مذکورہ بالا ”جنگ“ مدراس کے چند ہی میل جنوب میں موضع میللاپور کے قریب واقع ہوئی تھی، یورپین راءویوں کا بیان ہے کہ اس میں نواب کی فوج ”تقریباً دس ہزار“ تھی اور مقابلے میں پان ڈی چیری اور مدراس کے فرانسیسی سپاہیوں کی تعداد کم و بیش دو ہزار بتائی گئی ہے جن میں سے اصلی اور پہلا حملہ کرنے والے ایک ہزار سے بھی کم تھے، بلکہ اس دستے میں تعریف کا اصلی حقدار اگر فرنگی سپاہیوں کو سمجھا جائے تو ان کی تعداد اور بھی کم یعنی دو سو تیس کے قریب تھی، انھی ”بہادروں“ کے حملے کی دشمن تاب نہ لایا اور طرۃ العین میں بے حواس ہو کر فرار ہو گیا، پس سے لیں صاحب دعویٰ کرتے ہیں کہ تاریخ ہندوستان کی جس قدر بڑی بڑی لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں سے اس میللاپور کے معرکے سے زیادہ کوئی بھی یادگار کے قابل نہیں! پھر وہ اور قریب قریب تمام انگریز تاریخ نویس یقین دلاتے ہیں کہ یہی ایک معرکہ اس بات کا قطعی اور پہلا ثبوت تھا کہ ایک ننھی بھڑو تعداد ان اور بہادر فرنگی سپاہ کے مقابلے میں ہندوستانیوں کے بڑے سے بڑے لشکر کی کچھ حقیقت نہیں ہے!

جنگ میللاپور
کی مفرضہ
اہمیت

اس لڑائی کا ہماری کسی فارسی تاریخ میں ذکر نہیں اور فرامشیوں کے بیانات کا جو خلاصہ میں صاحب نیز زنجیر انگریز تاریخ نگاروں نے بیان کیا ہے اس کا طرز تاریخ کے عملے خیالی داستانوں سے ملتا جلتا ہے مگر دراصل انہوں نے اس کی وجہ سے جس چاروں چار تھیں اس حقیقت کے زور سے انہی سب اذیتیں روایات میں سے اہلی واقعات کا سراغ لگانا پڑے گا۔

۱۰

لیکن اس سے قطع نظر کہ ان ”فرنگی افواج“ میں ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد فرنگیوں کی نسبت ہمیشہ سب سے زیادہ رہی ہے یہ فرنگی مورخ خود ستانی کے جوش میں اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ سیلا پور کی لڑائی کو پورا ایک ہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ نواب انور الدین خاں کے اسی بے قاعدہ لشکر نے فرانسیسیوں کو کد لور کے قریب شکست دی اور یہ قواعد داں ہمارا اس طرح فرار ہوئے کہ دو گھنٹے تک انھوں نے انہیں ٹھہرنے کا نام نہیں لیا! (بحکم دسمبر ۱۷۸۱ء) پھر جب ہم پڑھتے ہیں کہ دوپلے کو آخر میں نواب سے اس شرط پر صلح کرنی پڑی کہ ہندوستان کے جنگی مورچے منہدم کر دئے جائیں گے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ انور الدین خاں کا اصلی مقصد پورا ہو گیا۔ اسی ضمن میں یہ جتنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ناظم کرناٹک کی دس ہزار فوج کے مقابلے میں فرانسیسی سپاہ کی جو تعداد (دو ہزار) بتائی گئی ہے وہ کسی قدر شبہ ہے کیونکہ اگرچہ برس پہلے پان ڈی چیری میں ضرورت کے وقت پانچ ہزار قواعد داں ہندوستانی اور ایک ہزار سے زیادہ فرنگی سپاہی بھرتی ہو سکتے تھے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ دوپلے کے زمانے میں ان کی تعداد اتنی کم کیوں تھی۔ حالانکہ یہ مسلم ہے کہ وہ اپنے محتاط پیش رو سے کہیں زیادہ یہ جوش و خروش اور اس جنگ کے موقع پر روپیہ بھی زیادہ صرف کر سکتا تھا؟

۱۱

بہر حال انگریز اور فرانسیسیوں کی لڑائی یورپ سے شروع ہوئی تھی اور وہیں ختم ہوئی! (امجد نامہ ایکس لاشیل، مرتبہ ۱۸۵۷ء مطابق ۱۱۶۱ء) لیکن دو برس بعد ان کے باہم جو جنگ ہندوستان میں چھڑی وہ محض مقامی تھی یعنی حکومت فرانس و انگلستان کا آپس میں کوئی جھگڑا نہ تھا بلکہ ابتداء یہ صرف ان قوموں کے تاجروں کی جنگ تھی (۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۸ء مطابق ۱۱۶۱ء)

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ نواب نظام الملک آصفیہ اول کی وفات کے بعد مرحوم کے ایک نواسے (ہدایت علی الدین خاں عرف منظر جنگ) کو بھی

مسند دکن کا دعویٰ تھا، اسی طرح کرناٹک کی نظامت کا حسین دوست خاں عرف چندا صاحب مدعی بن گیا جو یہاں کے پہلے رئیس صفدر علی کا داماد تھا اور ان دونوں کی پشت پناہی دوپہلے نے اپنے ذمے لی لیکن فرانسیسیوں کو مظفر جنگ کی رفاقت میں علائقہ دکن پر فوج کشی کی ہمت نہ تھی اور یوں بھی کرناٹک زیادہ قریب تھا لہذا اول اول انھوں نے چندا صاحب کی اعانت پر اکتفا کی۔ تقدیر کی یاوری سے پہلی ہی لڑائی میں نواب انور الدین خاں مارا گیا (جنگ امیر علی علیہ السلام) اور اہل سازش ملک پر قابض ہو گئے۔ لیکن اس بغاوت کا حال سن کر نواب ناصر جنگ نے جب ادھر رخ کیا تو اتحادیوں نے پان دی چیری کی جانب راہ فرار اختیار کیا اور نواب ناصر جنگ نے یہاں تک بھی ان کا تعاقب نہ چھوڑا۔ شہر سے کچھ فاصلے پر فرانسیسیوں نے بہت مستحکم مورچے اور دھمے بنالئے تھے لیکن فرانسیسی سپاہی نواب ناصر جنگ کے زبردست لشکر کی آمد آمد دیکھ کر گھبرا گئے۔ معمولی زد و خورد ہی میں ان کی شجاعت اور قواعد دانی کی قلعی کھل گئی اور وہ راتوں رات اپنے مورچوں سے چھپ کر بھاگ گئے۔ یورپی راویوں کا قول ہے کہ مظفر جنگ کو بھی انھوں نے اپنے ساتھ پان ڈی چیری میں چل کر پناہ لینے کی صلاح دی تھی لیکن اس نے خود اتکار کر دیا، اور دوسرے دن ماموں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا (۱۶۳۳ء)۔ نواب ناصر جنگ اور پھر مظفر جنگ کے قتل اور فرانسیسیوں کے دربار دکن میں رسوخ حاصل کرنے کے حالات گزشتہ باب میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں، انگریزوں نے اب تک ان سازشوں اور لڑائیوں میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا تھا لیکن دربار دکن میں فرانسیسیوں کا روز افزوں رسوخ دیکھ کر انھیں

لے ملین صفحہ ۲۴۶ وغیرہ۔ مگر یہ روایتیں بناوٹ سے خالی ہیں۔ صاحب آثار الامراء نے اسی واقعے کو مختصر طور پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ”بست و ششم ربیع الآخر ۱۶۳۳ء تا سہ پاس کامل آتش خانہ فرنگ سرگرم اشتغال بود۔ آخر کار (بتاریخ) بست و ہفتم سنہ فرنگیاں از رعب و ہبات محمدیاں رو بہ ہزیمت آوردند و ہدایت محی الدین خاں زندہ دست گیر شد“ جلد سوم صفحہ ۴۵۳۔

۱۰

سخت و ہم و حد پیدا ہوا اور بقول صاحب مآثر الامراء ”ہوائے مداخلت در ملک بادشاہی ہم رسید کہ آلو آکورا دیدہ رشاک میگید“ اور چونکہ دکن تک رسائی دشوار تھی، لہذا ان کی کوشش کرنا ٹاک تک محدود رہی اور وہ نواب محمد علی خاں کے حلیف و مددگار بن گئے۔ یہ شخص نواب انور الدین خاں کا چھوٹا بیٹا اور بہ اعتبار وراثت نظامت کرناٹک کا حق دار تھا، مگر چندا صاحب نے اسے اب شمالی کرناٹک سے دھکیل کر ترجپا پلی میں محصور کر رکھا تھا (۱۷۵۷ء بمطابق ۱۱۷۷ھ) اور ابتدا میں انگریز بھی اس کو بچانے سے مایوس ہو گئے تھے، لیکن اس مہم کو جلد سے جلد فیصلہ کرنے کی دھم میں چندا صاحب نے اپنی تمام فوج اسی شہر (ترجپا پلی) کے گرد جمع کر لی تھی اور خود اپنے صدر مقام ارکاٹ کو غیر محفوظ چھوڑ آیا تھا، اتفاق سے ابھی دنوں تازہ دم فوج انگلستان سے مدراس آئی اور چونکہ اسے ترجپا پلی لے جانا دشوار و بیکار نظر آتا تھا لہذا کلاٹ کو ارکاٹ پر حملہ کرنے کی تدبیر سوچ لی اور انگریزوں نے ایک بہ یک پہنچ کر بلا مزاحمت اس قلعے پر قبضہ کر لیا۔

محمد علی کی
کامیابی

قرینہ کہتا ہے کہ چندا صاحب کو اس بات کا گمان نہ تھا کہ مدراس کے انگریز تاجر بطور خود اس کے ملک پر حملہ کرنے کی جرأت کریں گے لیکن اس واقعے نے لڑائی کا رنگ بدل دیا اور چندا صاحب کو ترجپا پلی کے محاصرے کے ساتھ اپنا صدر مقام واپس لینے کی فکر لاحق ہو گئی۔ یہی وقت فرانسیسیوں کو بھی غالباً اپنی ہوس بجا کے برے نتائج اور یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ ان کا جنوبی ہند میں فروغ محض مکر و سازش کی اتفاقی کامیابی ہے ورنہ خود ان میں اس قدر قوت نہ تھی کہ وہ حیدر آباد ایک طرف، صرف کرناٹک ہی کو اپنے قابو میں رکھ سکتے، کیونکہ محمد علی کی وجاہت و خوش نصیبی نے بہت سے ہندی رئیسوں کو اس کی اعانت پر آمادہ کر دیا اور آئندہ سال خود چندا صاحب گھر کر گرفتار و قتل ہوا تو فرانسیسی کچھ بھی نہ کر سکے اور کرناٹک میں نواب محمد علی کا کوئی حریف نہ رہا۔ انگریزوں کو بھی محمد علی کے بیٹے جی ملک میں مداخلت کرنے کا

زیادہ موقع نہیں مل سکا تاہم متعدد فوائد و مراعات کے علاوہ یہی جیت کچھ کم نہ تھی کہ فرانسیسیوں کا کرناٹک میں کوئی اثر نہ رہا، اور وہ آئندہ جنگ میں پان ڈی چیری کی بھی خاطر خواہ مدافعت نہ کر سکے۔

فرانسیسیوں کی
آہنی چنگ
اور جنگ

یہ آخری جنگ انگلستان و فرانس کی مشہور ”جنگ ہفت سالہ“ کا ضمیمہ تھی جس کا یورپ میں ۱۷۵۶ء (۱۱۶۹ھ) میں آغاز ہوا اور حکومت فرانس نے اپنے مشہور فوجی سردار کونٹ لالی کو خاص ہندوستان کی مہم پر مامور کیا کہ وہاں سے انگریزوں کو نکال دے، لیکن لالی کسی قدر سخت گیر و خود پسند آدمی تھا دو پلے کئی سال پہلے ”گورنری“ سے معزول کر دیا گیا تھا اور ہندوستان میں لالی کو اپنے دوسرے عیش دوست اور نافرماں ہموطنوں سے کوئی مدد نہ مل سکی بلکہ بعض اوقات انھوں نے اسے زک دینے کی کوشش میں اپنے ملک و قوم کو نقصان پہنچانے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ ایک وقت یہ پیش آئی کہ ریاست حیدرآباد سے تعلقات رکھنے کی وجہ سے فرانسیسیوں کی ذمہ داریاں بہت وسیع ہو گئی تھیں اور ادھر حکومت فرانس ایک دفعہ لالی کو بھیج کر ہندوستان کی طرف سے ایسی بے خیر ہو گئی تھی کہ انگریزی بیڑا اور تازہ دم فوجیں ہندوستان آئیں، مدراس کا محاصرہ کرتے کرتے فرانسیسیوں کو خود محصور ہونا پڑا، لیکن فرانس والے اپنے قلیل التعداد ہموطنوں کو کوئی مدد نہ پہنچا سکے، پھر پان ڈی چیری میں محاصرین کی بڑی اور بھری ناکہ بندی نے سامان خوردنی کا قحط ڈال دیا تو مجبور ہو کر فرانسیسیوں نے شہر کو انگریزوں کے حوالے کر دیا اور اطاعت قبول کر لی (جنوری ۱۷۵۷ء مطابق ۱۱۷۷ھ)۔

یورپ میں جنگ ہفت سالہ کے بعد جب صلح ہوئی تو فرانس کے قدیم ہندوستانی مقبوضات بھی اسے واپس ملے (۱۷۶۳ء) انگریزوں نے پان ڈی چیری کی عمارات کو بے دردی سے گرا کر شہر کی اینٹ سے اینٹ

لے خالی اس کا سب سے بڑا ہی تصور تھا جس کی بنا پر سنڈ اسمتھ صاحب نہایت بازاری پہلے
میں اس کی مذمت کرتے ہیں! (دیکھو آکس فورڈ ہسٹری صفحہ ۴۷ وغیرہ)

۱۰۰

بجادی تھی۔ اب اگرچہ بروئے معاہدہ یہ مقام ان کو واپس دینا پڑا اور فرانسسوں نے دوبارہ اسے تعمیر کرا لیا تاہم ان سے یہ شرط لے لی گئی کہ آئندہ یہاں کبھی جنگی استحکامات نہ بنائے جائیں گے، چنانچہ گو بعض مقامات پر اب تک اہل فرانس کی عکداری ہے لیکن جنوبی ہند میں ان کے منصوبہ ملک گیری کا اسی وقت سے خاتمہ ہو گیا، اور ان کے موجودہ مقبوضات محض تجارتی اور غیر مصافی حیثیت رکھتے ہیں۔



باب

ابتدائی مقبوضات اور لڑائیاں

مالاک ہند پر انگریزی تسلط کے جملہ واقعات نہایت شرح و بیض سے انگریزی زبان میں موجود ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حالات ایک ایسی قوم کے لکھے ہوئے ہیں جو آخر کار اس وسیع ملک پر حکمراں ہو گئی۔ اس لیے اپنی تفصیلت اور دوسروں کی تحقیر سے اس کی معمولی تاریخوں کا خالی نہ ہونا ایک قدرتی امر ہے، دنیا کا قاعدہ بھی یہی رہا ہے کہ ملک گیری کی تاریخ ملک پر تسلط کرنے والے لکھا کرتے ہیں تاکہ ان کا نام دنیا میں روشن ہو اور ان کی اولوالعزمی کی مثالیں ان کی اولاد و اخلاف کے پیش نظر رہیں، لیکن جن قوموں کے ملک پر تسلط کیا جاتا ہے وہ انقلاب حکومت کے زمانے میں یا تو بالکل خاموش رہتی ہیں یا اگر قلم اٹھاتی بھی ہیں تو زیر دست اور مغلوب کی حیثیت سے جس کا نتیجہ پڑھنے والے کے لیے بجز انفعال کے اور کچھ نہیں ہوتا، بہر کیف قومی تفاخر اور عقلی کے ساتھ تاریخ نویسی کو قوم بالادست کے لیے کیسی ہی دلکش اور مفید ہو لیکن جو قومیں اس وقت مغلوب ہیں ان کے حق میں علاوہ غیر صحیح ہونے کے ایسی تاریخ موجب نقصان و دشمنی ہوتی ہے اور

ب

اسی وجہ سے افسوس ہے کہ اس تاریخ کے اکثر بیانات یک طرفہ یا غلط یا مشکوک سمجھے جاتے ہیں۔

لیکن طالب علم کو یاد رکھنا چاہئے کہ قطع نظر ایسے تاریخی سرمائے کے جس کو ہم اطمینان سے اپنا کہہ سکیں خود انگریزی زبان میں انگریزی عہد حکومت کے حالات اور واقعات کا ذخیرہ اس قدر وافر ہے اور بعض انصاف پسند اور راست گو انگریزوں نے خود اکثر واقعات کے تمام پہلوؤں پر ایسی مفصل بحث کی ہے کہ جہاں کہیں طالب علم کو کوئی شک یا شکایت پیدا ہو تو وہ ان کے مطالعے سے کوئی اطمینان بخش نتیجہ ایسا نکال سکتا ہے جس کو عام انگریزی تاریخوں نے نظر انداز کر دیا ہے اور دوسروں کی کہانی اپنی زبان سے اسی طرح بنا سکتا ہے جیسے کہ اپنی کہانی دوسروں کی زبان سے سنتا رہا ہے۔ بہر کیف طالب علم کا فرض ہے کہ جہاں کہیں اس قسم کی شکایت ہو نہایت تحقیق و تجسس سے انصاف کو مد نظر رکھ کر تاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کرے اور صحیح نتائج تک پہنچ کر جو کوفت غیروں سے اپنی خواریاں سن کر دل میں پیدا ہوتی ہے، اس کو علمی وسعت اور عالی حوصلگی سے رفع کرے اور انسان کے تعلقات کو جو ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے اچھی امیدوں کے ساتھ بلند نظری سے دیکھے اور سمجھے کہ سچائی کبھی کسی کے چھپائے نہ چھپے گی۔

حیدر علی حاکم میسور کے حالات میں ایک انصاف پسند انگریز لکھتا ہے کہ اس نامور شخص کی نسبت قابل اطمینان رائے قائم کرنی دشوار بلکہ محال ہو گئی ہے کیونکہ اس بارے میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی رائیں رقابت قومی کی وجہ سے بالکل متضاد ہیں۔ اس قول سے ہی اس نتیجے پر پہنچنے کی جرأت کی جاسکتی ہے کہ جس وقت سے یورپ کی قوموں کا قدم ہندوستان میں آیا اس ملک کی صحیح تاریخ مختلف قیاسی روایات کے انبار میں دب گئی۔ لیکن ایک ذہین متجسس کے لیے اسی انبار سے صحیح واقعات کا آشکارا کر دینا دشوار سہی مگر غیر ممکن نہیں۔

زمانہ انقلاب کی تاریخ کے متعلق جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں

ایک شکل یہ ہے کہ خود ہند کے مصنفین عصر نے (تیرھویں صدی ہجری کے وسط تک) عہد برطانوی کی کوئی مفصل و مستند تاریخ نہیں لکھی سیر المتاخرین یا ریاض السلاطین وغیرہ مقامی تاریخیں ملتی ہیں لیکن یہ بھی ایک مدت تک انگریزوں کی سرپرستی کی امید پر لکھی گئی تھیں اس لیے اطمینان نہیں ہوتا کہ وہ زور رعایت سے خالی ہونگی۔ پھر بھی ان کی شہادت معمولی انگریزی تاریخوں سے زیادہ قابل توجہ معلوم ہوتی ہے ہم بھی جہاں تک ممکن ہو گا ان تاریخوں سے گو وہ ناکافی اور قلیل ہیں مدد لینے مگر مجموعی طور پر انگریزی کے سرمایہ معلومات پر حصر کئے بغیر جا رہے ہیں۔ اس کو بھی ہم کوئی بیچارہ کی محض تصور نہیں کرتے کیونکہ خود اس سرمائے میں ایسا مبادلہ جاتا ہے جس سے عام انگریزی تاریخوں کی بے اعتیاضی ظاہر ہو جاتی ہے۔ بہر حال اس مختصر تاریخ میں ہم نے یہ التزام رکھا ہے کہ جہاں کہیں مشکوک یا غلط روایات کی تصحیح خود انگریزی اسناد سے یا اپنی کتابوں سے نہیں ہو سکی ہے وہاں اندرونی روایت ان کی صحت یا عدم صحت سے بحث کی ہے اور روایت کی غلطی یا اس کا ضعف ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔

انگریزوں کے قبضہ بنگالہ کی تاریخ کچھ ایسے ہی مباغذ آمیز روایات سے شروع ہوتی ہے جن میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ انگریزوں کے تسلط سے بنگالہ میں بہت بڑا انقلاب رونما ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ کرناٹک کی طرح بنگالہ میں بھی انگریزوں کے ساتھ فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کی بھی منڈیاں تھیں چنانچہ انگریزی کھیتی کلکتے میں تھی تو فرانسیسی چندرنگر اور ولندیزی چنورہ میں تھے۔ ان میں سے ہر قوم بنگالے پر تسلط کرنا چاہتی تھی ان کی تجارتی رقابت یورپ کی لڑائیوں کی وجہ سے زیادہ شدید ہوئی گئی۔ اور کرناٹک کی طرح بنگالے کی سرزمین بھی اس کشمکش کا دھڑل بن گئی۔ جس سے بنگالے کے امن و امان اور تجارت کو نقصان پہنچتا تھا۔ بنگالے کی حکومت بھی اس کو محسوس کرتی تھی۔ مرشد قلی خاں کے عہد میں ان تاجروں کے تمام راستے مسدود کر دیے گئے تھے تاکہ یہ لوگ آگے نہ بڑھنے پائیں علی وردی خاں کے عہد میں ان کو قلعے بنانے کی اجازت نہیں تھی اور چونکہ انگریز زیادہ پیش پیش تھے اس لیے معلوم ہوتا ہے

۷۱

کہ بنگالے کی حکومت ان کو مشتبہ نظر سے دیکھتی تھی۔ چنانچہ جب ۱۷۵۶ء میں
سراج الدولہ بنگالے کا ناظم ہوا تو اس نے بھی اپنے پیشرو حکمرانوں کے نقش قدم پر
ان تاجروں کا راستہ مسدود کرنے کی کوشش کی اور اس کو بھی انگریز کمپنی سے
ڈر محسوس ہونے لگا اور وہ دوسری مغربی قوموں کے مقابلے میں انگریزوں کا
زیادہ مخالف ہو گیا اور کیونکہ یہ زیادہ طاقتور تھے اور غالباً اس کا یہ خیال تھا
کہ انگریزوں کو مغلوب کر کے دوسری قوموں پر وار کرے چنانچہ شروع سے اس نے
اس کمپنی کی طاقت توڑنے کی کوشش کی انگریز مورخ اس کو کتنا ہی نالائق
اور بیوقوف ٹھہرائیں لیکن آئندہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ڈر
بہت کچھ حق بجانب تھا اور اس کے فیصلوں میں معقولیت تھی۔

انگریزوں سے سراج الدولہ کی کھلی مخالفت اس طرح شروع ہوئی کہ
انگریز کمپنی نے حکومت بنگالہ کے پرانے احکام کے خلاف قلعے بنالیے تھے اور
ان کو اس کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی تھی کہ انگریز اور فرانسیسیوں کے
تعلقات روز بروز کشیدہ ہو رہے تھے اور چند ہی دنوں کے بعد ان دونوں
قوموں کے درمیان یورپ میں ایک بڑی جنگ چھڑ گئی جو ”جنگ ہفت سالہ“
کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کے بعض باغیوں کو انگریز کمپنی نے پناہ
دے رکھی تھی جس سے سراج الدولہ کو سخت شکایت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ
اس نے قاسم بازار کے کارخانے کو ضبط کر کے پچاس ہزار فوج کے ساتھ ملک سے
پیش قدمی کر دی ۱۷۵۶ء جون ۱۶ کو یہ حملہ ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جنوبی لڑائیوں
کی وجہ سے جو کرناٹک میں ہوئی تھیں یہاں انگریزی فوجیں بہت کم تھیں۔
بہت سے انگریز مع صدر کارخانہ ڈریک کے کشتیوں میں فرار ہو گئے اور قلعے میں
جو لوگ رہ گئے تھے انھوں نے حملے کی تاب نہ لا کر ۲۲ جون کو ہتھیار ڈال دیے اور
گرفتار ہو گئے۔ یہ مضمویں تعداد میں ۱۷۰ بیان کئے جاتے ہیں۔ اور ہول ول
جو ڈریک کے بھاگنے کے بعد قلعے میں کماندار بنایا گیا تھا بیان کرتا ہے کہ منجملہ
ان کے ۴۶ قیدی ایک تنگ وتاریک کمرے میں ایک رات بند کر دیے گئے
اور صبح کو دیکھا گیا تو ان میں سے ۱۲۲ مر گئے تھے اور باقی نیم جان باہر نکلے جن میں

ہول ول بھی تھا۔ اس واقعے کی کوئی اصلیت نہیں ہے بلکہ یہ سب ہول ول کی من گھڑت تھی۔ خود ایک انگریز مسٹر لنٹل ساکن بنگالہ نے بڑی تحقیق و تفصیل سے رسالہ ”بنگالہ ماضی و حال“ میں ایک مضمون لکھ کر اس قصے کے بے اصل ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاغذات و مراسلات سند میں پیش کئے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدت تک اس قصے کی کسی کو خبر تک نہ تھی اور نظامی کمپنی کو انگلستان میں اس کی کبھی (سرکاری طور پر) اطلاع تک نہیں دی گئی۔ مزید براں بنگالے کی دو مہم عصر فارسی تاریخیں موجود ہیں جن میں نواب سراج الدولہ کی انگریزوں سے ناراضی اور کلکتے کی تسخیر و غارت گری کے حالات کو بہت تفصیل سے لکھا ہے مگر ان میں بلیک ہول کے ہولناک واقعے کا خفیف سا اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ ایک کتاب یعنی ”ریاض السلاطین“ تو ایک انگریز عہدہ دار کی زیر سرپرستی مرتب کی گئی تھی اور دوسری کتاب ”سیر المتاحسین کا“ مصنف انگریز ہی قوم کا نہایت مدلل اور طرف دار ہے اور سراج الدولہ اور اس کے اہل دربار کے ظلم و ستم اور جہل و سفارست کے بیان میں اس نے کوئی کسر اٹھائی نہیں رکھی ہے۔

انگریزی تاریخوں کا بیان ہے کہ جس کوٹھری میں ۱۲۶ انگریز قیدی رات بھر بند رہے وہ شکل سے، گز مکر تھی۔ اس میں صبح کو صرف ۲۳ آدمی زندہ ملے اور باقی سب تلف ہو گئے لیکن یہاں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر قید کرنے والے ہندوستانی شدت سے ظالم اور شقی القلب تھے تو بھی وہ اتنے زندہ آدمیوں کو ایسی چھوٹی سی جگہ میں کیونکر بند کر سکے اور کیونکر اتنے لوگ ایسی تنگ جگہ میں سما سکے۔ وینسٹن چرچل صاحب اپنی نئی تاریخ ہند میں لکھتے ہیں کہ ”اس قصے کو ایک من گھڑت کہانی ثابت کرنے کی اس زمانے میں جو کوشش کی گئی وہ بچتہ دلائل پر مبنی نہیں ہے۔ بلیک ہول کا واقعہ ضرور پیش آیا گو اس کے بعض جزئیات کافی طور پر یقینی نہ ہوں“ لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس واقعے میں ظلم و اذیت کی نوعیت زیادہ تر ان جزئیات ہی پر موقوف ہے۔ مثلاً اگر قیدیوں کی تعداد کم تھی تو اس واقعے کے ظلم ہونے میں تو جب بھی

شہید نہیں لیکن ظلم کی ہولناک شدت میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ بہر کیف یہ لائق مولف سراج الدولہ کے متعلق اتنا ضرور لکھتا ہے کہ ”انگریزی قیدیوں کو کال کونٹری میں بند کرنے کا حکم نواب نے نہیں دیا تھا۔ البتہ اس کا قصور یہ تھا کہ اپنے ماتحتوں کو اس فعل پر اس نے کوئی سرزنش یا اس ہولناک نتیجے پر کوئی اظہار افسوس نہیں کیا، لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ کلکتے کی تسخیر کے بعد سراج الدولہ اور انگریزوں کے مخالفانہ تعلق میں اتنی کمی ہو گئی تھی کہ لڑائی کے بعد سراج الدولہ کو اتنی قدرت یا مہلت ملی تھی کہ وہ اس وحشیانہ حرکت سے سیر اپنے ملازموں کو سرزنش کرتا اور اپنا اظہار افسوس انگریزوں تک پہنچاتا، ہم سمجھتے ہیں کہ سراج الدولہ کو اتنی مہلت اور قدرت بھی حاصل نہیں ہوئی۔ کلکتے پر سراج الدولہ کے حملے کے متعلق (جس کے سلسلے میں بلیک ہول کا واقعہ اور آئرن ہک پلاسٹی کے بعد خود سراج الدولہ کا نہایت بے رحمی سے قتل ہونا پیش آیا) یہ بتا دینا ضروری ہے کہ گو سراج الدولہ کے آتشیں مزاج اور کوتاہ اندیش ہونے میں کلام نہیں لیکن اس موقع پر ابتداً اس کی طرف سے نہیں ہوئی بلکہ معلوم ہوتا ہے جب اس کے نانا الہ وردی خاں نے وفات پائی (۱۱۶۹ھ) تو گو وہ اپنی زندگی میں سراج الدولہ کو ولی عہد بنا چکا تھا، لیکن دستور کے مطابق بعض امرا اور اہل خاندان خفیہ یا علانیہ نئے نواب کے مخالف ہو گئے اور عجب نہیں کہ ملک میں شورش کے یہی آثار دیکھ کر انگریز تاجروں کو یہ جرات ہوئی ہو کہ انھوں نے چند مجرمین کو جو بھاگ کر کلکتے میں پناہ گزیں ہوئے تھے، نواب کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا، یہ سراج الدولہ کی مدد بینی سے دو مہینے بعد (شعبان ۱۱۶۹ھ) کا واقعہ ہے۔ خود وہ اس وقت راج محل کی طرف دورہ کرنے روانہ ہوا تھا کہ مذکورہ بالا اطلاع ملی اور نواب غضبناک ہو کر جہاں تھا وہیں سے جنوب کی طرف پلٹ پڑا اور ماہ رمضان المبارک (یعنی جون ۱۸۵۷ء) میں اس کی فوجیں انگریزوں کی تجارتی نوآبادی (کلکتہ) کے سامنے اس قدر جلد اور غیر متوقع طور پر نمودار ہوئیں کہ انگریز بھاگنے کے لیے کشتیاں بھی سسراہم نہ کر سکے جن سے ٹھلا گیا وہ محل گئے ورنہ ایک گروہ کشیر ہمیں گرفتار ہوا اور ان کے تجارتی کارخانے کو

نواب کی فوج نے دل بھر کر لوٹ لیا۔ کلکتہ کی حفاظت کے لیے نواب نے دیوان مانک چند کو مقرر کیا جو کہ ”در جمیع امور بے شعور و از جوہر شجاعت ہم محروم“ تھا۔ پھر دریائی گزرگاہ پر چند فوجی چوکیاں مقرر کر کے مرشد آباد کو مراجعت کی۔ کلکتہ سے جو انگریز جان سلامت لیجا سکے تھے وہ فلٹا میں پھیرے جہاں ولندیزیوں کی تجارتی کوشی تھی۔ یہیں مدراس سے ان کو فوجی محکم بھیجی گئی اور تھوڑے دن بعد فاتح ارکاٹ ”کلاٹو“ (جواب کرنل ہو گیا تھا) اور امیر البحر والسن ولایت کی تازہ دم فوج لے کر آ پہنچے۔ نواب کے سرداروں نے غالباً رشوتیں لے کر کلکتہ کی مدافعت سے پہلو ہتی کی اور تھوڑی سی گولہ باری ہوتے ہی شہر پھر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا (۱۷۵۷ء مطابق ۱۱۸۷ھ)۔

ان سرداروں ہی پر پھر نہیں سراج الدولہ کے اکثر درباری اس کے خلاف غدروہیوں پر آمادہ تھے۔ خود حکومت بنگالہ کارکن رکن میر جعفر جو نواب کا رشتہ دار بھی تھا؛ اس کی بیچ کنی کے درپے تھا اور درحقیقت اسی کے اصرار سے انگریزوں نے نواب کے خلاف سازش اور آخر میں مرشد آباد پر فوج کشی کرنے کی جرات کی۔ انگریزوں کو اس بات کا اطمینان دلایا گیا تھا کہ ساری فوج سراج الدولہ کے خلاف ہے اور اس فوج کے مقابلے میں محض صف آرائی کرنا سپاہیوں کو منتشر کر دینے کے واسطے کافی ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ جب انگریزی سپاہ مرشد آباد کے قریب موضع پلاسی تک بڑھی اور سراج الدولہ کو مقابلے کے واسطے باہر آنا پڑا۔ تو بیچاں ہزار کے لشکر میں پانچ ہزار سپاہی بھی ایسے نہ تھے جنہوں نے نمک حلائی اور لڑائی میں شرکت کی ہو۔ اسی اندیشے سے نواب کو مرشد آباد سے باہر آنے میں پہلے ہی تامل تھا اور اب ہر چند

جنگ پلاسی

نہ بھاڑی بل بل میں چند انگریزوں نے ایک شخص ایریگ نامی کی پناہ لی تھی اور اس نے اپنے کو خطرے میں ڈالا مگر ہر طرح مکن ہوا نہیں تھا کہ کلکتہ سے باہر وہاں تک حفاظت پہنچا گیا جہاں مغرور انگریزوں کی فشتیاں منگرا رہی تھیں اس ہندو ہیرو حاکم انگریزوں نے روپے سے معاوضہ کرنا چاہا تھا مگر ایریگ نے انکار کیا کہ میں نے یہ کام روپے کی صلے میں نہیں کیا بلکہ محض مختلف شرف و انسانیت سمجھ کر کیا ہے۔۔۔۔ (امیر السالطین صفحہ ۶۲۱)۔

ب

اس نے اپنے عہدہ داروں کی منت سماجت کی اور اپنے تصوروں کی معافی مانگ کر انہیں لڑائی پر آمادہ کیا، لیکن ان خود غرضوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور لڑائی صرف اس جمعیت کے ساتھ ہوئی جو نواب کے وفادار گشتی میرمدن کے ماتحت تھی اور جس میں غالباً ایک ہزار سے زیادہ سپاہی نہ تھے۔ ورنہ باقی تمام فوج اپنی اپنی جگہ دور کھڑی لڑائی کا تماشا دیکھتی رہی، میرمدن کے ثبات قدم اور اس کے پہلے دن کے حملے نے انگریزوں کو پریشان کر دیا تھا وہ میرجعفر کے وعدوں سے بدگمان ہو کر اپنے آپ کو اس جھگڑے میں پھنسانے سے پشیمان تھے لیکن جب انگریزوں کو میرمدن کے حملے نے پتہ کیا اور انہوں نے ایک آسوں کے باغ میں پناہ لی کہ ممکن ہو تو راستہ کو نواب کی فوج پر چھاپہ ماریں۔ اسی وقت اتفاق سے توپ کے ایک گولے سے میرمدن نے مہلک زخم کھایا اور اس کے مرنے سے خود نواب کا دل چھوٹ گیا، وہ اسی شام کو میدان جنگ سے نکل گیا۔ فوج کے اکثر سپاہی پہلے ہی لڑائی سے الگ رہے یا گھروں کو واپس روانہ ہو چکے تھے۔ لہذا صرف چند دستے جنہیں نواب کے نکل جانے کی خبر نہ ہوئی تھی میدان میں رہے اور انہی سے معمولی زد و خورد کے بعد یہ مشہور ”لڑائی“ فتح ہو گئی! (جون ۱۷۵۷ء مطابق شوال ۱۱۵۷ھ)۔

برجھڑ کی نوابی۔

بنائے زمان کی عداوت نے سراج الدولہ کے ایسے حواس بگاڑے تھے کہ اسے بھاگنا بھی نہ آیا اور خشکی کے بجائے وہ تری کے راستے سے عظیم آباد جاتا تھا کہ راہ میں پکڑا گیا اور مرشد آباد میں لا کر قتل کر دیا گیا۔

۱۔ مذکورہ بالا حالات سیرالتاخرین جلد دوم (صفحہ ۶۳۷ و ۶۳۸) سے لیے گئے ہیں۔ نیز دیکھو کین کی تاریخ ہند جلد اول (۱۶۴۱ء و ۱۶۵۱ء) ریاض السلاطین ۳۷۰ وغیرہ وغیرہ پچیس تیس برس پہلے تک انگریز تاریخ نویسوں میں ”فتح“ پر نہایت فخر و ناز کیا کرتے تھے لیکن اب اکثر نئے مصنف اس سے ابا کرنے لگے ہیں۔

۲۔ فینٹ اسمتہ صاحب (ہندوستان کی تاریخ) لکھتے ہیں کہ سراج الدولہ کو میرجعفر کے بیٹے میرن نے نہایت سیرجی سے قید قید کر دیا لیکن انہیں شاید یہ خبر نہیں کہ قتل انگریزوں کی صوابدید و صلاح سے عمل میں آیا تھا! (ریاض السلاطین

اب میر جعفر کی نوابی میں کوئی خرخشہ باقی نہ رہا اور اس نے اپنے انگریز مددگاروں کو جس دریا دلی کے ساتھ انعام دیا وہ بنگالے کی تاریخ میں ضرب المثل ہے چنانچہ مشہور ہے کہ زرد اشرفی سے پوری ایک کشتی بھر کر کھلتے بھیجی گئی تھی جس میں سے بچیس لاکھ کے قریب صرف ”نہایت جنگ کرنل کلیفٹ“ (یعنی کلاٹو) کے حصے میں آیا کمپنی کو جو بیس پر گئے ”نامی ضلع کے حقوق زمینداری بھی حکومت بنگالہ نے عطا کئے اور اس کی آمدنی (تقریباً تین لاکھ روپے سالانہ) کلاٹو کے نام لکھ دی۔

لیکن میر جعفر جسے اتنی آسانی اور محض سازش سے حکومت بنگالہ مل گئی ذاتی طور پر بالکل نا اہل و نالائق آدمی تھا ”خصوصاً در اس وقت کہ نشہ بنگ یہ تائید جلوں بر مندا مارت یگ دو یا لا گشتہ“ اس کو عیش و عشرت نے اور بھی بیکار کر دیا تھا۔ ادھر ایک تو اسی زمانے میں شہزادہ عالی گوہر (شاہ عالم) فتح بنگالہ کے ارادے سے بہار کے حدود میں داخل ہوا۔ اور دوسرے انھی دنوں کلاٹو بنگالے کے ”مغنا تم“ سے مالا مال ہو۔ ولایت روانہ ہو گیا۔ (۱۷۷۸ء) میر جعفر کا سب سے بڑا حامی اور دوست وہی تھا مگر اس کے جانشین کو میر جعفر کی رفاقت ترک کرنے میں زیادہ نفع نظر آیا لہذا کلکتہ کونسل کے بعض اراکین کی خود غرضانہ مخالفت کے باوجود اس نے میر جعفر کے داماد میر قاسم سے ساز باز کر لیا اور میر قاسم ہی انگریزوں کی مدد سے بنگالے کا فرمانروا ہو گیا (۱۷۷۰ء مطابق ۱۱۷۳ھ)

لہذا اس عزل و نصب کے متعلق مختلف روایتیں ہیں اور اس لیے ذیل میں ”ریاض السامعین“ کی روایت کا بجنفہ نقل کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

میر محمد قاسم خاں برائے اتفاق جگت سیٹھ باسرواران انگریز سازش کی کردہ آواز ابراہان آود کہ سرداران انگریز تلخ و غمی خاں سنری الہ شدہ بر نواب جعفر علی خاں نوشتند کہ بنگالہ کا دلہن و خواہ سپاہ و سپاہی دار بہتر آن ست کہ قلعه مسمومہ بہر نام پیروزہ خود از قلعه برخاستہ یککلتہ میانہ میر محمد قاسم خاں بہر دہی نام احمد علی مطالب مرہجتہ مرہشتہ آباد نمود و سرداران سپاہ انگریز باو نہ موافق شدہ نواب جعفر علی خاں (از از قلعه بر کشی سوار کردہ یککلتہ رسانیدند و پیروزہ ۱۲)

باب
میر قاسم سے
مخالفت۔

نئے نواب نے رشوت میں زر کشیر کمپنی کے عہدہ داروں کو اور تین پر گئے یا ضلع خود کمپنی کو دیے اور معاہدہ ہو گیا کہ ان پر گنوں کی آمدنی سے چھپنی ایک فوج ہتھیار رکھے گی کہ وقت ضرورت نواب کے کام آئے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں یہ عہدہ دیکھان اور دوستانہ تعلقات درہم برہم ہو گئے۔ میر محمد قاسم کی انتظامی قابلیت کو قریب قریب ہر انگریز مورخ نے سراہا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ محض ملازمین کمپنی کی حرص نے اسے انگریزوں کی مخالفت پر آمادہ کیا اور اس پر بھی وہ حتی الامکان علانیہ لڑائی شروع کرنے سے بچنا چاہتا تھا اور مرشد آباد کے بجائے اس نے منگلگیر کو اپنا دار الحکومت بنالیا تھا کہ کلکتے کے انگریزوں سے دور ہو جائے لیکن حق یہ ہے کہ اسے ان لوگوں سے معاملہ پڑا جن کی اس وقت تک کوئی مضلم مرکزی حکومت نہ تھی اور گو کلکتے میں رسمی طور پر ایک صدر کو نسل قائم تھی لیکن درحقیقت کمپنی کی ہر کوٹھی کا منظم اپنے آپ کو آزاد و خود مختار سمجھتا تھا اور مجھ کمپنی کے اور زیادہ تر اپنے ذاتی فوائد کی خاطر نواب بنگال کو دھکی یا قریب سے آسامی بنانا چاہتا تھا مگر مناسب ہو گا کہ اس قصے کو ہم انگریز مورخ کین کی زبانی سنیں جس نے واقعات کو مختصر تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے:-

وہ لکھتا ہے کہ ”میں اس زمانے میں جب کہ پانی پت کے میدان میں برہمنوں کو ہزیمت نصیب ہوئی، فرانسیسیوں اور انگریزوں کی باہمی کشمکش کا طویل سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ یعنی ۱۷۸۱ء مطابق جمادی الثانی ۱۱۹۷ھ کے دن پانڈی چیری کی فرانسیسی فوج نے کرنل کوٹ کی اطاعت قبول کر لی اور اس شہر پر قبضہ ہوتے ہی مدراس کے انگریزی حکام کے حکم سے وہاں کے جنگی استحکامات فوراً منہدم کر دئے گئے۔“

مگر ان واقعات سے انگریزوں کو جو فرصت و اطمینان میسر آیا اس کا ایک نتیجہ ہوا کہ بنگالے کے قابوچی عہدہ داروں کو دوبارہ دست درازی کرنے کی ہمت ہو گئی اور جس قدر روپیہ وہ میر قاسم سے ایٹھ سکتے تھے اسے وصول کرنے کے بعد اب انھوں نے اس کے ساتھ اس قسم کے جھگڑے نکالے

یعنی مدنا پور بردوان اور پٹاٹ کام۔

جو ذاتیات میں داخل تھے۔ مثلاً امیر کارنک نے نواب کی طرف سے شاہ عالم کے خلاف جنگ تو شروع کی اور اس میں شکست دے کر بادشاہ کے فرامین سے سردار لاکو قید بھی کر لیا لیکن دوسرے دن جب کارنک کی بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو ادھر تو شاہ عالم نے کمپنی کو پورے صوبہ بنگال کی دیوانی دینے پر آمادگی ظاہر کی اور ادھر کارنک اس کے ساتھ ایسے انکسار و لجاجت سے پیش آیا کہ میر محمد قاسم کو طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو گئے۔ ۴۴ اسی طرح جب کارنک کی بجائے کوٹ انگریزی فوج کا سپہ سالار مقرر ہوا تو اس نے بھی عمداً ایسا طرز عمل اختیار کیا جس سے خواہ مخواہ میر قاسم کو رنج و پریشانی پیدا ہوئی اور اس طرز عمل میں بیٹنے کے انگریزی کارخانے کا منظم مسٹر ایلس بھی کوٹ کا مقلد تھا۔ جھگڑے کی اہلی وجہ یہ تھی کہ کمپنی کا ہر ملازم اپنے تجارتی مال کو محصول راہ داری سے مستثنیٰ کرانا چاہتا تھا حالانکہ یہ محصول نواب کے مدخل ریاست میں بہت معقول آمدنی کا ذریعہ تھا لیکن شاہ عالم بادشاہ کی رضا جوئی بھی رقابت کا ایک سبب بن گئی کیونکہ اس پریشاں حالی کے باوجود شمالی ہند میں حکومت کا جائز وارث وہی تھا۔ اور گواہی دونوں وہ اپنے برائے نام وزیر نواب شجاع الدولہ کے علاقے میں ہٹ آیا تھا۔ اور دو سال تک وہیں پناہ گزیں رہا، پھر بھی ہر فریق کی اسی "تاجدار بے ملک" کی طرف نگاہ لگی ہوئی تھی۔

آخر کار زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ کلکتہ کے انگریز حکام کی میر قاسم سے اسی محصول راہ داری پر علانیہ ان بن ہو گئی۔ کمپنی کا انگریز عامل یا گورنر ون سٹارٹ اعتدال پسند آدمی تھا اور کلاٹون نے اسے مدراس سے بلا کر اس عہدے پر اسی لیے مقرر کر لیا تھا کہ "کلکتہ کونسل" کی ناجائز حرکتوں کی روک تھام کرے۔ اسی کونسل کا ایک اور فرد یارکن وارن پیسٹننگز بھی قابلیت کے ساتھ اس کی تائید کرتا تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس کا ہم فلٹا کے پناہ گزینوں کے ساتھ پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ وہ دولت و اقتدار کی حرص سے میری نہ تھا بایں ہمہ ایسا بد اخلاق اور بے حیثیت بھی نہ تھا کہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی

باب

ریشہ دو انیوں میں شریک ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ ون سٹارٹ نے اسی کو منتخب کیا کہ جاکر نواب میر قاسم سے ملے اور مذکورہ بالا نزاع کو مصالحانہ طبعیت پر طے کرنے کی کوشش کرے۔ پھر اس خیال سے کہ نواب کی ناراضی کے باعث معاملہ ذرا نازک ہو گیا ہے۔ ون سٹارٹ خود بھی گیا اور فیصلے کی یہ معقول شرائط قرار پائیں کہ خاص کمپنی کے مال درآمد و برآمد پر نواب کی طرف سے محصول نہ لیا جائے گا لیکن جو انگریز خج کے طے سپر تجارت کرتے اور محصول سے بچنا چاہتے ہیں، اس کی مانعت کر دی جائے گی۔ ون سٹارٹ ۲۸ جنوری ۱۷۶۲ء (۱۱ ص ۱۱۷۲) کو کلکتہ واپس آگیا اور معلوم ہوتا تھا کہ معاملہ بالکل طے ہو گیا... لیکن ادھر تو کلکتہ کو نسل نے اس عذر پر کہ گورنر کو ایسے معاہدے کرنے کا اختیار ہی نہیں تھا، وہ شرائط منسوخ کر دیں اور ادھر ایلیس کو اجازت دے دی کہ وہ خاص خاص حالتوں میں فوجی قوت سے کام لے سکتا ہے، ایلیس نے جنگ و جدال کا موقع نکالنے میں دیر نہ کی اور اس کے جواب میں نواب نے بھی اس کے سپاہیوں کی سرزنش کے واسطے ایک رسالہ روانہ کیا۔ ساتھ ہی ایک حکم شائع کر دیا کہ آئندہ سے محصول راہ داری انگریز وغیرہ انگریز کسی سے نہ لیا جائے گا تا کہ دیسی سوداگر بھی انہی کی مسادہ شرائط پر تجارت کر سکیں (یہ وضاحت کر دینی چاہیے کہ اس وقت کمپنی کا ہر عہدہ دار خج کی تجارت میں کچھ نہ کچھ حصہ لیتا تھا)۔

نواب کے اس حکمنامے کو ایلیس اور اس کے بالادست اکلکتہ کو نسل کے (عہدہ داروں نے) ون سٹارٹ اور میسٹنگز کے علی الرغم کثرت رائے سے اعلان جنگ قرار دیا اور میر قاسم بھی اپنی جگہ پر آخر کار لڑائی کی تیاری کرنے لگا۔ مگر ”تصادم“ کی ابتدا ایلیس ہی نے کی اور پھر خود خج کر نکلتا چاہتا تھا کہ غضب ناک نواب کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا۔ کین نے یہ بھی لکھا ہے کہ میر قاسم نے انگریز قیدیوں کو قتل کر دیا اور

جنگ نکالے

یہی خبر یا کر کلکتہ کونسل نے اس کے خلاف لشکر کشی کی اور دو بارہ یہ جعفر کو نواب بنایا۔ لیکن یہ غلط اور سخت غلط فہمی میں ڈالنے والی رزائیت ہے۔ کیونکہ کلکتہ کونسل نے فوجیں جولائی ۱۷۵۷ء میں روانہ کیں۔ اور پہلی لڑائی بھی ملاسی کے قریب اسی مہینے میں ہوئی لیکن انگریز قیدیوں کا قتل ماہ اکتوبر کا واقعہ ہے اور خود کمین کو اقرار ہے کہ اس کی بھی نواب نے پیش از پیش انگریز سپہ سالار کو اطلاع دے دی تھی کہ اگر پیشے پر حملہ ہوا تو ان قیدیوں کی خیر نہ ہوگی۔

پھر حال جنگ میں میر قاسم کی فوجوں کو دو تین مقامات پر پیہم شکست ہوئی۔ اس کے مستعد اور منظم ہونے میں کام نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ زیر نظر عہد میں اہل ہند کے طبقہ اعلیٰ کے افراد سے فوجوں کو اڑانے کی قابلیت مفقود ہو گئی تھی اور میدان جنگ میں ان کے چند سردار بھی اشتراک و اتحاد کے ساتھ کام نہ کر سکتے تھے۔ باہمی رقابت اور خود غرضی نے ان میں سخت نفاق پیدا کر دیا تھا اور سب سے آخری لڑائی میں جو اُدھو نالے کے کنارے راج محل کے قریب ہوئی (ماہ صفر ۱۱۶۱ھ) خود میر قاسم کا مشہور سردار مرزا نجف خاں انگریزوں سے مل گیا اور اسی کی رہبری سے چھپ کر انگریز راتوں رات ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں سے نواب کا لشکر توپوں کی زد میں تھا۔ اس شیخون میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور میر قاسم کی فوج کا تیر لاکھ بکھر گیا۔

موصول
دہلی

بنگالے کا شکست خوردہ حاکم (میر قاسم) بہار سے ہٹ کر ریاست اودھ کے علاقے میں چلا آیا تھا۔ اور شاہ عالم اور نواب شجاع الدولہ اس کے معین و مددگار ہو گئے تھے لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں والی اودھ نے آخر میں بیوفائی کی اور میر محمد قاسم کی فوج کو اپنے ساتھ ملا کر خود اسے حراست میں لے لیا۔ اس طرح اگرچہ والی اودھ کی سپاہ میں نہایت

۱۔ اڈکھورڈ پٹری صفحہ ۵۰۰۔

۲۔ مرزا نجف کی مداری شاہ شیخون کے حالات یہاں تاخیر میں تفصیل سے تحریر ہیں (صفحہ ۱۲۸ نیز دیکھو بیاض السلاطین ص ۱۸۰)۔

ای

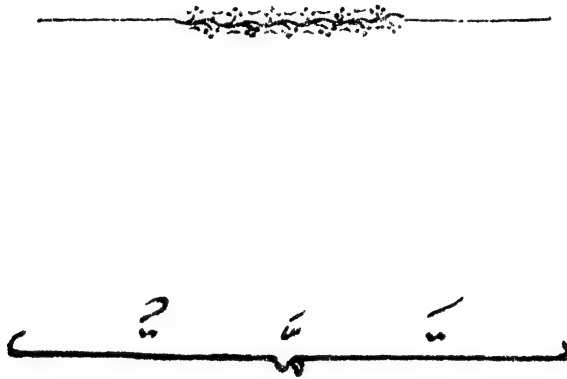
معقول اضافہ ہو گیا تھا مگر جب اس نے بطور خود انگریزوں سے جنگ کی تو اس میں سخت شکست ہوئی اور بہار و بنگالہ کی فتح تو ایک طرف مگر خود اس کی ریاست کے بعض اضلاع ہاتھ سے نکل گئے کیونکہ مقابلہ بہار کی عین مغربی سرحد کے مقام بکسر پر ہوا (۱۷۶۳ء مطابق ۱۱۷۷ھ) فتح مند تعاقب کرتے ہوئے چنار والہ آباد تک بڑھ آئے اور ان مقامات پر بھی ان کا بلا دقت قبضہ ہو گیا۔

لیکن انگریزوں کو لڑائی کا اصلی فائدہ یہ ہوا کہ شاہ عالم والی ادوہ کا ساتھ چھوڑ کر انگریز ہی لشکر میں آگیا اور صوبہ بہار و بنگالہ و اڑیسہ کی سند دیوانی دے کر اس نے انگریزوں کے قبضہ بنگالہ کی تصدیق و توثیق کر دی اس جگہ یہ صراحت کر دینی چاہئے کہ نواب میر جعفر کا اسی زمانے میں انتقال ہوا (جنوری ۱۷۶۵ء) اور گو کاکلہ کونسل نے اس خداداد موقع پر بھی پہلے کی طرح اس کے بیٹے (نجم الدولہ) سے بہت سی رشوتیں لے کر اسے بنگالہ کا نواب تسلیم کیا تھا مگر اسے کمزور و بے حقیقت دیکھ کر جب انھوں نے بالابہی بالا شاہ عالم سے دیوانی کی سند حاصل کرنی تو پھر بنگالہ کا یہ نام نہاد نواب اپنے رہے پہلے اختیارات سے بھی محروم ہو گیا۔

شاہ عالم بادشاہ سے جو معاہدہ ”عہد نامہ الہ آباد“ کے نام سے انگریزوں نے کیا اس کی اہم شرائط یہ تھیں کہ کوڑہ اور الہ آباد کے ضلع جو انگریزوں نے والی ادوہ سے چھینے تھے، بادشاہ کے حوالے کر دئے جائیں گے اور بہار و بنگالہ کی مالگزاری کے نام سے ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ بھی وہ بادشاہ کو ادا کرتے رہیں گے جس کے عوض میں بادشاہ نے انگریزی بمبئی کو ان مشرقی صوبوں کا دیوان بنادیا جس کا حقیقت قانونی مطلب صرف یہ تھا کہ نواب (یا ناظم) بنگالہ کے ماتحت یا مددگار کی حیثیت سے

۱۷۶۷ء کو لندن سٹارٹ جس کی قابلیت کی بہت کچھ تعریفیں کی جاتی ہیں، اس رشوت ستانی میں شریک تھا اور اس کے حصے میں بھی پانچ لاکھ روپیہ آیا تھا (ادکس فورڈ ہسٹری صفحہ ۵۰۰ بحوالہ مل مل سوم وغیرہ وغیرہ)

ان صوبوں کی سرکاری مالگزاری کا انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں رہے گا۔
البتہ بادشاہ نے مدد ناپور و برودوان وغیرہ چند پرگنوں پر (جو نواب
کی طرف سے انہیں پہلے بطور جہانگیر مل چکے تھے) کمپنی کا براہ راست
قبضہ تسلیم کر لیا۔



لے رہے تھے مل کی اور نیز حال کی اجنبی فصل انگریزی تالیفوں میں موجود ہیں۔ یس جہ اکثر انگریز تاریخ نویس اس ”دیوانی“
کے طے کا اس طرح ذکر کرتے ہیں گویا کمپنی کو اسی موقع پر حکومت ہند کی مدد مل گئی مگر یہ صحیح نہیں ہے بلکہ شبہ
نواب نجم الدولہ کی نااہلی اور بے بسی کی بدولت رفتہ رفتہ تمام اختیارات انگریزوں کے ہاتھ میں آ گئے لیکن
عہد نامہ الہ آباد کی رو سے ان کی اصلی اور قانونی حیثیت محض ”دیوان“ کی تھی جو ناظم یا صوبہ دار کے ماتحت
صرف صیغہ مالگزاری کا اعلیٰ عہدہ دار ہوتا تھا۔ چنانچہ انگریزوں کا بھی دھول مالگزاری کے سوا سا لہا سال
تک دیگر اختیارات میں براہ راست کوئی دخل نہ تھا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
احسن بیاریہ

تمتہ فہرست ماخذات نمبرا

ذیل میں صرف ان کتابوں کے نام اور زمین طبع وغیرہ درج ہیں جن کا
تایخ ہند (برائے اف لے) کی دوسری اور تیسری جلد میں جا بجا حوا
دیا گیا ہے۔ جن۔ خذوں سے کہیں کہیں جزئی مدد لی گئی ہے ان کے
نام اس فہرست میں داخل نہیں کئے گئے۔

- (۱) - فتوح البلدان (عن بلاذری) مطبوعہ یورپ ۱۸۶۶ء
- (۲) - تحفۃ الکرام (مؤلفہ علی شیر قانع) جلد سوم مطبوعہ لکھنؤ ۱۳۰۷ھ
- (۳) - تاریخ سندھ (مؤلفہ میر معصوم بھکری) قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد
- (۴) - تاریخ سندھ (مؤلفہ مولوی عبدالحکیم صاحب شرر) دو جلد مطبوعہ لکھنؤ
- (۶) - مسالک الممالک (عن اصطخری)
- (۷) - " " (عن ابن حوفل)
- (۸) - کتاب المسالک الممالک (عن ابن حمداد بہ)
- (۹) - حسن التقایم فی معرفۃ الاقالیم (مقدمہ البشاری)
- (۱۰) - المغرب وارض السودان... (اورسی) مع ترجمہ فرانسیسی مطبوعہ یورپ ۱۸۶۴ء
- (۱۱) - تقویم البلدان (ابو الفدا) مطبوعہ یورپ ۱۸۲۹ء
- (۱۲) - عجائب الہند (مؤلفہ بزرگ بن شہر یار) عربی مع ترجمہ فرانسیسی مطبوعہ یورپ
- (۱۳-۱۴) - تاریخ فرشتہ (دو جلد) مطبوعہ نو لکھنؤ ۱۲۸۱ھ
- (۱۵-۱۶) - لطائف الکبری (دو جلد) " " " "
- (۱۷ تا ۱۹) - منتخب التواریخ (ملا عبد القادر بدائونی) تین جلد مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی
- (۲۰-۲۱) - حبیب السیر دو جلد مطبوعہ بیٹھی ۱۳۷۳ھ

- (۲۲)۔ آثار الکرام مطبوعہ آگرہ ۱۹۱۰ء
 (۲۳)۔ طبقات ناصری مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی
 (۲۴)۔ اخبار الاخبار۔ مطبوعہ میرٹھ ۱۲۸۳ھ
 (۲۵)۔ چار مقالہ۔ مطبوعہ بمبئی
 (۲۶-۲۷)۔ لباب اللباب (عربی) دو جلد مطبوعہ یورپ
 (۲۸)۔ شعر العجم (مولوی شبلی نعمانی) حصہ اول
 (۲۹)۔ تاریخ بہیقی مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی
 (۳۰)۔ تاج المآثر (قلبی) کتب خانہ آصفیہ
 (۳۱)۔ فوائد الفواد مطبوعہ اودھ اخبار لکھنؤ ۱۲۰۲ھ
 (۳۲)۔ تاریخ فیروز شاہی (برنی) مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی
 (۳۳)۔ " " (شمس سراج عقیف)
 (۳۴)۔ ترک باہری (فارسی) مطبوعہ ۱۳۰۸ھ
 (۳۵)۔ ریاض السلاطین (غلام حسین سلیم) مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی
 (۳۶-۳۷)۔ اکبر نامہ (ابوالفضل) تین جلد " " "
 (۳۸)۔ آئین اکبری (دو جلد) " " "
 (۳۹ تا ۴۱)۔ آثار الامرا۔ تین جلد " " "
 (۴۲)۔ اقبال نامہ جہانگیری " " "
 (۴۳)۔ ترک جہانگیری (قلبی) کتب خانہ آصفیہ
 (۴۴)۔ دبستان مذاہب مطبوعہ بمبئی ۱۲۲۲ھ
 (۴۵)۔ زبدۃ المقامات (ترجمہ اردو) مطبوعہ لاہور
 (۴۶-۴۷)۔ بادشاہ نامہ (دو جلد) مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی
 (۴۸-۴۹)۔ منتخب اللباب (خانی خاں) دو جلد " "
 (۵۰)۔ رقعات عالمگیری مطبوعہ نو لکھنؤ
 (۵۱)۔ لطائف الاخبار (قلبی) کتب خانہ آصفیہ
 (۵۲)۔ آداب عالمگیری " " "

- (۵۳)۔ واقعات عالمگیری (قلمی) کتب خانہ آصفیہ
 (۵۴)۔ آثار عالمگیری۔ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی
 (۵۵)۔ واقعہ خرابی دہلی (قلمی) کتب خانہ آصفیہ
 (۵۶-۵۷)۔ سیر المتاخرین (جلد دوم و سوم) مطبوعہ نولکشور ۱۳۸۳ھ

————— زینہ چہارم —————

ضمیمہ ۲

فہرست نمبر (۲)

۶۵۷۵۸ History of India as told by its own historians.

(Elliot & Dowson) 8 volumes

۶۶ Early History of India. by V. A. Smith 1914)

۶۷ Elphinstone's History of India, (1916)

۶۸ L. Poole's Mediaeval India. (S. N. S.)

۶۹ V. A. Smith's "Oxford History of India" (1918)

۷۰ Browne's "Literary History of Persia" (2 volumes)

۷۱ "Chronicles of the Pathan Kings of Delhi"

By E. Thomas (1871)

۷۲ Raycrt's English translation of Tabakat-i-Nasiri

(2 Vol)

۷۳ "The Memoirs of Baber" (Fas: III). translated

by Mrs: Beveridge.

۷۴ Erskine's India under Baber (First volume)

۷۵ L. Poole's "Baber" (R. I. S.)

۷۶ G. Duff's "A History of the Marhattas"

Calcutta 1818. Edition (First volume)

۷۷ Sirkar's "History of Aurangzeb" (4 volumes)

୮୩ L. Poole's "Aurangzeb (R. I. S.)

୮୪ Bernier's Travels (Edited by V. A. Smith)

1916 Edition

୮୬ "India at the death of Akbar" 1920

୮୮ Blochman & Jarrett's English translation of the
Ain-i-Akbari, (3 Vol)

.....

Reference & Maps

Imperial Gazetteer of India 1908.

Encyclopaedia Brit: (Eleventh Edition)

Royal Atlas. (1916 Edition)

"Joppen's Historical Atlas of India" (1917.)

صحت نامہ

تایخ ہند جلد سوم (برائے انٹرمیڈیٹ)

طبع دوم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۱۸	حاشیہ ۵	زبان	زبان میں	۱۲۶	عنوان سطر	تیسری فصل	چوتھی فصل
۲۰	۱۲	غور و خود داری	غور و خود رائی	۱۳۰	۱۱	دوادی	دادی
۲۳	حاشیہ ۴	ان کی	اس کی	۱۳۲	۱۵	لگائی	نکالی
۵۰	۱۲	ابھی	انہی	۱۳۶	حاشیہ سطر	پھر اسے	پھر اس نے
۷۲	۹	پیادہ سوار	پیادہ و سوار	۱۵۰	۲	رمیں	رہیں
۸۴	۱۷	تھیسے	قضیے	۱۵۲	۱۵	ہے	ہے کہ
۱۰۵	۱۵	مند باریانڈہ بار	مند باریانڈہ بار	۱۶۴	۲	گو لگندے	گو لگندے
۱۰۸	۰۳	ہم حاشیے میں	ہم کی حاشیے میں	۱۶۸	۱	اعزاز	اعزاز
۱۱۰	۲۱	گزی	گزری	۱۷۹	عنوان حاشیہ	وسائل سفر	وسائل سفر
۱۱۲	۲	بادشاہ کو	بادشاہ کو	۱۹۸	حاشیہ سطر	البٹ	البٹ
۱۲۴	حاشیہ سطر	انشا پرداری	انشا پردازی	۲۰۲	۱۳	نشریف	تشریف

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۲۰۴	۷	محمد شاہ	محمد شاہ	۲۵۳	۲۰	اس پار کے	کے
۲۱۷	۱۵	ایک مقام پر نہیں	ایک مقام پر	۲۵۴	۴	حیرت انگیز	حیرت انگیز
۲۱۸	۲۲	منظم	منظم	۲۵۸	۱	جوب	جوب
۲۲۱	۳۰	کرلی جو	کرلی - اور یہ	"	۱	بحری	بحری
۲۳۰	۲	آثر الامرا	آثر الامرا	"	۲	صا	صا
۲۴۲	۴	اپنے	اپنے	۲۶۸	۳	توانگریزوں	توانگریزوں
"	۷	چنانچہ	چنانچہ	۲۷۱	۱۱	جس میں	جہاں
۲۴۳	۲۲	ایسے	ایسے	۲۹۱	۵	کہ نکلتے	کہ آیا نکلتے
۲۴۵	۱۹	اں	اں	"	۶	کہ لڑائی	یا لڑائی
۲۴۶	۲۳	تحفے	تحفے	۲۹۴	۱۲	کے حدود	کی حدود
۲۵۲	۱۹	اس پار کی	کی				

